(جلد سوم)

تالیف

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

حماسۂ حسینی

(جلد سوم)

مؤلف

آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہریؒ

ترجمہ

سید محمد سعید موسوی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲-بی-۴/۵ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

اسم کتاب..............................حماسۂ حسینیؑ (جلد سوم)

مؤلف..............................آیت اللہ شہید مرتضی مطہریؒ

مترجم..............................سیدمحمدسعید موسوی

تصحیح..............................سیدرسالت حسین کوثر

تزئین وآرائش..........ڈاکٹر حسین کنانی' سید حسنین عابدی

کمپوزنگ..............................سیدمحمد صادق شرف الدین

ناشر..............................دارالثقافة الاسلامیة پاکستان

سال طبع..............................شوال المکرم ۱۴۲۱ھ بمطابق ۲۰۰۱ء

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدق اللہ العلی العظیم

بسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

تمام حمد و ستائش مختص ہے' ذات بے ہمتا و یکتا کیلئے۔ ذات لطیف کی الطاف خاصہ' رحمتیں اور برکتیں ہوں ہادیانِ برحق' انبیاء و ائمہ طاہرین علیہم السلام پر' بالخصوص' حسینؑ۔ فدائے اسلام و قرآن پر اور اس نہضت و قیام کے پہلے دن سے لیکر منجئ بشریت کے ظہور تک کے' انکے تمام پیروانِ حقیقی پر۔ ذاتِ قہاّر کی لعنت و نفرین ہو اس جادّۂ الٰہی سے منحرف لوگوں پر اور اس سے منحرف کرنے والوں پر' خواہ وہ جس رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

الحمدللہ آیت اللہ مرتضٰی مطہریؒ کی مشہور زمانہ کتاب ''حماسۂ حسینی'' کی تیسری جلد کا اردو ترجمہ عاشقان و شیفتہ گانِ مکتب حسینی کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ لغتِ عربی میں لفظ ''حماسہ'' کے جو معنی بیان ہوئے ہیں' مناسب و موزوں ہو گا کہ اس جلد میں اس کی بھی کچھ وضاحت ہو جائے۔ حماسۂ حسینی کے مظاہر و مصادیق کو بیان کرتے ہوئے شہید مطہریؒ نے جس حماسہ کا مظاہرہ کیا ہے' اس کیلئے وہ خود بھی خراج عقیدت کے مستحق ہیں اور ہمیں بھی ایسے ہی ''حماسہ'' کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں کو ہم

نے اس کتاب کے مقدمہ کا عنوان قرار دیا ہے۔

حماسہ :

حماسہ ''ح۔م۔س یاش'' سے مرکب ہے۔ معروف معاجم لغتِ عرب ''معجم مقاییس لغت'' اور ''لسانِ عرب'' میں حماسہ کے درج ذیل معنی بیان ہوئے ہیں :

۱۔ شجاعت' جرأت' دلیری اور اپنے مؤقف پر سختی اور شدّت سے باقی رہنا۔

۲۔ جنگ و جہاد

۳۔ تنور کی آگ سے نکلنے والا شعلہ۔

۴۔ قریش اور ان کے ساتھ معاہدہ میں شامل دیگر قبائل پر مشتمل ایک گروہ۔ اہل لغت نے اس گروہ کو حُمس یا احمس کہا ہے۔ انھیں حُمس یا احمس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دین میں شدّت اور سختی کو اپناتے تھے۔

ڈاکٹر محمد ابرہیم شریف اپنی کتاب ''مکہ و مدینہ دورِ جاہلیت اور عہدِ رسولؐ میں'' ص ۱۵۶ پر رقمطراز ہیں کہ قبیلۂ حُمس اس قسم کے تشدّد کا مظاہرہ اپنی ذاتی اور قومی حیثیت کو اُجاگر کرنے' خود کو دوسروں سے ممتاز گرداننے اور دوسروں کو نیچا و حقیر دکھانے کی خاطر کیا کرتا تھا۔ حج اور مقامات مقدسۂ حج سے متعلق لکھی گئی دیگر کتابوں میں بھی اسکا ذکر موجود ہے۔ اس قسم کے تشدد کے مظاہرہ کو علمائے تاریخ نے خرافات حج میں شمار کیا ہے۔ قارئین کرام کی معلومات کے لئے ان خرافات کی مندرجہ ذیل چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں :

۱۔ لباس طواف

قبیلہ پرستی کے مذموم عزائم کو فروغ دینے کیلئے انہوں نے عرب میں اس فکر کو متعارف کیا کہ قبیلہ حُمس کے علاوہ کوئی اور اپنے لباس میں کعبہ کا طواف نہ

کرے۔ اپنے مفادات کو مزید پروان چڑھانے کیلئے یہ لوگ "ما آزرِ طواف" کے نام سے ایک لباس بازار میں لائے۔ طواف کرنے کیلئے لوگوں کو بازار سے یہ لباس خریدنا پڑتا تھا۔ چنانچہ وہ افراد جو اس لباس کو خریدنے یا کرائے پر حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، مجبوراً برہنہ طواف کرتے تھے کیونکہ اپنے ذاتی لباس میں طواف کرنا انکے لئے ممنوع تھا۔ یہ صورت حال لوگوں میں جنسی طغیانی کا سبب بنتی تھی، یہاں تک کہ اس مقدس گھر میں لوگ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے لگے۔ چنانچہ تاریخ کعبہ میں ملتا ہے کہ ایک مرد و عورت جنکا نام اساف ونائلہ تھا، اس گھر کے اندر فعل قبیح کے مرتکب ہوئے۔ خداوند عالم نے اسی لمحہ اور اسی جگہ دونوں کو مسخ کر کے پتھر بنادیا۔ قریش نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھا کر اساف کو کوہ صفا پر اور نائلہ کو کوہ مروہ پر رکھ دیا تاکہ سعی کے دوران لوگ ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ کافی عرصہ تک لوگ انہیں دیکھ کر اظہار نفرت کرتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ نفرت کا جگہ لوگوں کا بوسہ گاہ بن گیا۔ یہ سلسلہ سنہ ۹ ہجری تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ پر سورۂ برأت نازل ہوئی جس میں اللہ نے فرمایا: "اللہ اور اسکا رسولؐ دونوں مشرکین سے بیزار ہیں"۔ اس آیۂ مبارکہ کے نازل ہوتے ہی آپؐ نے اعلان فرمایا کہ آج کے بعد کوئی بھی اس گھر کا برہنہ طواف نہیں کر سکتا۔

۲۔ وقوف عرفہ

دنیا بھر سے آنے والے حجاج ۹/ ذی الحجہ کو سرزمین عرفہ میں وقوف کرتے ہیں۔ دور قدیم سے دور حاضر تک اس عمل کو اہم ترین اعمال حج میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن قبیلہ حُمس کے لوگ اپنی ذاتی انا کی خاطر، خود کو دوسروں سے ممتاز اور بیت کا مالک دکھانے کیلئے عرفات کی بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے۔

وہ اسکا جواز یہ پیش کرتے تھے کہ چونکہ وہ اہل حرم ہیں' اسلئے حرم سے باہر قیام نہیں کرسکتے' جبکہ عرفات حرم سے باہر ہے۔ یہ طرز عمل سنہ ۱۰ ہجری کو اپنے اختتام کو پہنچا۔

سنہ ۱۰ ہجری میں رسول اکرمؐ حجۃ الوداع کیلئے تشریف لائے تو جہاں آپؐ نے اور بہت سے خرافات کو ختم کیا' وہاں اس امتیاز کو بھی مٹادیا۔ اسطرح ان کی نخوت کا یہ بُت بھی ٹوٹ گیا۔

۳۔ سرزمین منیٰ میں محفلِ مشاعرہ :

قبیلہ حُمس کے افراد منیٰ میں قیام کے دوران سایہ میں نہیں بیٹھتے تھے تاکہ دوسروں پر یہ جتلا سکیں کہ وہ محبت بیت میں کتنا غرق ہیں۔ اس سرزمین میں پہنچکر بھی خدا کی عبادت وبندگی کرنے کے بجائے انہیں اپنی حیثیت کو چمکانے کی فکر رہتی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے وہ محافلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا کرتے تھے جن میں طرح طرح سے اپنے آباؤ واجداد کی مدح سرائی کرتے تھے۔ قرآن کریم کی سورۂ بقرہ آیت ۲۰۱ میں خدا نے ان کے اس عمل پر تنقید کی اور اسکی مذمت کرتے ہوئے حکم دیا کہ ان سب باتوں کو چھوڑ کر صرف اسے یاد کیا جائے اور اسی کا ذکر کیا جائے۔

۴۔ گھروں میں دروازوں سے داخلے کو خلاف احترام گردانا۔

قبیلہ حُمس کے لوگ حالت احرام میں جب اپنے گھروں کو واپس لوٹتے تھے تو دروازہ سے داخل ہونے کی بجائے چھت سے پھلانگ کر اندر جاتے تھے۔ قران کریم میں انکے اس غیر عقلی اور غیر طبیعی فعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے کہ تم جس عمل کو فضیلت کے طور پر پیش کرتے ہو اس میں

کوئی خیر نہیں ہے، بلکہ خیر اس میں ہے کہ خدا و آخرت پر ایمان کے بعد دروازہ سے اپنے گھر میں داخل ہو جائے۔ (سورۂ بقرہ ۱۸۹)

۵۔ ایام حج میں تبدیلی

قریش اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ایام حج میں کسب کیا کرتے تھے۔ لہٰذا حاجیوں کی تعداد میں قلت و کثرت سے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ ادھر یہ حال تھا کہ اطراف و اکناف سے آنے والے حاجی سخت سردی اور سخت گرمی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ حج کو معتدل موسم میں رکھنے کی خاطر تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاجی جمع ہو سکیں، قریش حج کی تاریخ کو قمری کے بجائے شمسی حساب سے معین کرنے لگے۔ اس طرح وہ اپنی مرضی کے مطابق حج کی تاریخوں میں تبدیلی کر لیا کرتے تھے یعنی ایک سال محرم کے مہینہ کو، دوسرے سال صفر کو، اور پھر تیسرے سال دوبارہ ذی الحجۃ کو حج کا مہینہ قرار دیتے تھے۔ ہر سال میدان عرفہ چھوڑتے وقت آئندہ سال کے لئے حج کی تاریخوں کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت ۳۷ میں اللہ تعالی نے ان کے اس عمل کو کفر قرار دیا ہے:

"انما لنسیٔ زیادَۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاماً ویحرمونہ عَاماً......"

"حرمت کے مہینوں میں تقدیم و تاخیر تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اسکو حرام کر دیتے ہیں"۔

قبیلہ حُمس کی طرف سے اعمال حج میں کی گئی ان تحریفوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں انکی سختی اور شدت پسندی فروغِ مذہب کیلئے

نہیں تھی بلکہ ان تمام اقدامات کا مقصد صرف اور صرف امتیاز کو ظاہر کرنا اور اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ تھا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مذہب میں تشدد اور سختی کا مظاہرہ کرنا' ہر شخص کیلئے اور ہر وقت مستحسن عمل نہیں ہوتا۔ ہمیں پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ آیا مذہب میں تشدد اور سختی مستحسن ہے یا سہل انگاری' نرمی' فراخدلی اور وسعت نظری کا مظاہرہ کرنا بہتر ہے؟ اس بات کو سمجھنے کیلئے ایک مختصر سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ عام مشاہدہ کہ آج کل کی دنیا میں یہ دونوں رویے بظاہر ایک دوسرے سے متضاد و مختلف ہونے کے باوجود باہمی طور پر مل کر مذہب کو گرانے اور لوگوں کو مذہب سے بد ظن کرنے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان دو متضاد رویّوں کے حامل افراد بظاہر ایک دوسرے کو سب و شتم کرتے نظر آتے ہیں لیکن تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں گروہ اپنا حق زحمت ایک ہی جگہ سے لیتے ہیں کیونکہ دونوں کا حتمی انجام ایک ہی ہے۔ اگر ایک گروہ تشدد کے نام سے مذہب کو پیچھے رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے تو دوسرا ترقی و تمدن کے نام سے مذہب کو اسکے بنیادی اصولوں سے منحرف کر کے ایک آزاد اور لبرل دین میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تشدد اور وسعت نظری کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے۔

حماسہ یا تشدد کی دو قسمیں ہیں:

حماسۂ مذموم یا ناپسندیدہ تشدد:

قدیم زمانے سے ہی سب لوگ اس قسم کے تشدد کی مذمت کرتے آئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لئے کوئی دلیل و منطق نہیں ہوتی وہ ان اہداف کے حصول کیلئے سختی پر اُتر آتے ہیں اور تشدد کی راہ

اپناتے ہیں۔ اسکو مذموم یاناپسندیدہ تشدد کہتے ہیں۔ آجکل کی زبان میں اسے ڈکٹیٹر شپ 'انتہاپسندی یافرعونیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دور قدیم کی قطاع الطریق کشور کشائی اور دور جدید کی استعمار گری یا دیگر چالیں' سب مذموم تشدد کی مثالیں ہیں۔ تاریخ انسانی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بطور مثال ہم یہانپر چند تاریخی واقعات کا تذکرہ کرینگے :

۱۔ قتل ہابیل

جب خداوند عالم نے ہابیل کی قربانی کو قبول کرلیا تو قابیل نے حسد کے مارے ہابیل سے کہا "میں تمہیں قتل کردوں گا" ہابیل نے فرمایا "تو اگر میری طرف ظلم وتعدی کا ہاتھ بڑھائے گا۔ تب بھی میں ایسا نہیں کروں گا"۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے :

"اذقربا قرباناً فتقبل من احدھِما ولم یتقبل من الآخر قال لا قتلنك قال انما یتقبل الله من المتقین ـلئِن بسطت الی یدك لتقتُلنی ماانا بباسطٍ یدی الیك لا قتلك"۔

"جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو وہ کہنے لگا میں تجھے قتل کردوں گا 'اس نے کہا اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے۔ اگر تم میری طرف قتل کیلئے ہاتھ بڑھاؤ گے بھی تو میں تمہاری طرف ہرگز ہاتھ نہ بڑھاؤں گا"۔

(سورۂ مائدہ آیت ۲۷'۲۸)

۲۔ برادران یوسفؑ :

برادرانِ یوسفؑ نے صرف اس بہانے کہ حضرت یعقوبؑ 'حضرت یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے ہیں' آپس میں فیصلہ کیا کہ یا تو حضرت یوسفؑ کو قتل کردیا جائے یا

انہیں کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ برادرانِ یوسفؑ کو اگر کوئی شکایت تھی بھی تو حضرت یعقوبؑ سے تھی، حضرت یوسفؑ سے تو کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ان کے تشدد کا نشانہ حضرت یوسفؑ بنے اور انہیں کنویں میں پھینکا گیا۔

"اقتلو یوسف اواطرحوہُ ارضاً یخل لکم وجہُ ابیکم وتکونوا من بعدہِ قوماً صالحین" (سورۂ یوسف آیت ۹)

۳۔ حضرت یوسفؑ اور زلیخا:

جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ سے عمل نامشروع ونامعقول انجام دینے کی خواہش ظاہر کی تو جناب یوسفؑ نے اسے مسترد کرتے ہوئے فرمایا "میں اس سلسلے میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں"۔ اس انکار کی پاداش میں زلیخا نے امرائے سلطنت کی خواتین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس (یوسفؑ) نے میری بات نہ مانی تو میں اسے سخت عذاب دوں گی۔

۴۔ حضرت موسیٰؑ

حضرت موسیٰؑ کو خدا نے حکم دیا کہ فرعون کے دربار میں جاکر اسے ڈراؤ اور کہو کہ خدا پر ایمان لائے۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ دیکھو اس کے ساتھ اچھے اور نرم الفاظ میں گفتگو کرنا (سورۂ طٰہٰ: ۴۳)۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اس کے باوجود خود فرعون نے کہا کہ میں اسے قتل کرڈالوں گا۔ سورۂ غافر: ۲۶) اور اسکے درباریوں نے بھی اس سے کہا کہ موسیٰؑ کو ایسے ہی آزاد چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے، ان کو قتل کردیا جائے۔ (سورۂ اعراف: ۱۲۷)

۵۔ حضرت علیؑ

حضرت علیؑ دامادِ رسولؐ اللہ تھے، برجستہ صحابی رسولؐ اللہ تھے، سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔ آنکھ کھولتے ہی آپ نے پیغمبر اکرمؐ کی زیارت کی اور انہیں کے

دامن میں پرورش پائی۔ ان تمام فضیلتوں کے باوجود معاویہ نے آپؑ پر سب و شتم کو نہ صرف جائز بلکہ خطبہ کا جزء لاینفک قرار دیا' جبکہ تمام اسلامی فرقے اس کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

والئ کوفہ و خطیب امام جمعہ کو اس فعل قبیح سے روکنے کی پاداش میں حجر ابن عدیؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی اور دیگر اصحابؓ رسولؐ اللہ کو معاویہ کے غیض و غضب کا نشانہ بننا پڑا' یہاں تک کہ انہیں موت کی سزائیں دی گئیں۔ حالانکہ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ علیؑ پر سب و شتم نہ کرو۔ اس جرم میں ان کا سر قلم کر کے شام بھیج دیا گیا۔

۶۔ خوارج

اسلام کی ابتدائی تاریخ سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں ایک ایسا فرقہ وجود میں آیا جس سے طول تاریخ میں پوری ملت خوفزدہ اور نالاں رہی ہے۔ اس فرقہ کی حیثیت اپنے ابتدائی دور میں جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی فتح کو شکست میں تبدیل کرنے کیلئے معاویہ اور عمرو بن عاص کی طرف سے پھینکے گئے ایک تیر کی سی تھی۔ البتہ یہ تیر معاویہ کے ترکش میں نہیں تھا بلکہ خود علیؑ ہی کے لشکر میں تھا مگر اسکو بنانے والے معاویہ اور عمرو بن عاص تھے۔ اگرچہ کہ علیؑ کے مخالفین یہ تیر بنا کر اسوقت تو کامیاب رہے لیکن جہاں اس فرقہ نے علیؑ کو رُلایا' وہاں اس سے معاویہ بھی ہمیشہ خوفزدہ ہی رہا۔ اس فرقہ کو مارقین کہتے ہیں۔ انہیں خوارج بھی کہا جاتا ہے۔

اس فرقہ نے علیؑ کو دو مرتبہ شہید کیا۔ پہلی مرتبہ جنگ صفین کے موقع پر جب انہوں نے صفوں کے پیچھے سے آکر علیؑ کے سینہ پر تلوار رکھ کر علیؑ کو جنگ ختم کرنے پر مجبور کیا اور بصورت دیگر خلافت سے عزل کرنے' معاویہ کے سپرد

کرنے اور شہید کرنے کی دھمکی دی۔ یہ علیؑ کی شخصیت کا پہلا قتل تھا۔ دوسری مرتبہ اسی فرقہ کےؐ ایک شقی انسان نے ۱۹ رمضان المبارک کو علی الصبح کو محراب عبادت میں شہید کر کے جسم اسلام پر ایسی شدید ضرب لگائی جس نے تاریخ اسلام کا رخ ہی موڑ دیا۔

اس فرقے کی خصوصیات کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ لوگ :

۱۔ علیؑ، عثمانؓ، معاویہ، سب ہی کو کافر گردانتے تھے۔

۲۔ گناہ کبیرہ کرنے والوں کو کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے۔

۳۔ غیر خوارج سے شادی کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔

۴۔ اپنی جنگوں میں شریک نہ ہونے والوں کو بھی کافر سمجھتے تھے۔

۵۔ جہاں یہ علیؑ کے دشمن تھے وہاں بنو امیہ کے بھی دشمن تھے۔

خوارج حضرت علیؑ اور انکے پیروکاروں کو تحکیم کے معاہدہ کو غلط ٹھہرانے کے جرم میں قتل کا مستحق گردانتے تھے اور اس بنیاد پر ان کے خون کو ہدر سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حامل قرآن صحابی رسولؐ حباب اور ان کی زوجہ کو علیؑ سے دستبردار نہ ہونے کے جرم میں قتل کیا۔ اسکے برعکس وہ یہود و نصاریٰ کو پیغمبر اکرمؐ کے معاہدۂ ضمنی کا خیال کرتے ہوئے محترم سمجھتے تھے اور انہیں امانتِ رسولؐ گردانتے تھے۔ گویا ان کی نظر میں مولا علیؑ امانتِ رسولؐ اللہ نہیں تھے اور یہود و نصاریٰ امانتِ رسولؐ تھے۔

خوارج کی خاص سیرت یہ تھی کہ وہ اصل کو چھوڑ کر فرع پر سختی سے کاربند ہونے کے احکام نافذ کرتے تھے۔ آج اُمت محمدیؐ کے تمام فرقے کم و بیش اسی سیرت پہ عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ آپس میں افہام و تفہیم کے دروازے سب ہی نے بند کئے ہوئے ہیں۔ ہر ایک فرقہ افہام و تفہیم کو وقت کا ضیاع

اور اپنے خلاف سازش گردانتا ہے اور ہر کسی نے دہشت گردی کی سیاست کو اپنایا ہوا ہے۔ ہر فرقہ نے یہی رویہ یہود و نصاریٰ اور کفر والحاد کی استعماری طاقتوں کے مقابل بھی اپنایا ہوا ہے۔ آج مسلمان، یہود و نصاریٰ کو ایک کلمۂ توحید پڑھنے والے، محمدؐ کی رسالت کو تسلیم کرنے والے کعبہ کے معتقد، صوم وصلوٰۃ اور حج و زکوۃ کے معتقد اپنے مسلمان بھائی سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود اپنے ہی فرقہ میں کسی شخص کو اگر ان کے مزاج کا مخالف پاتے ہیں، تو اسے بھی مخالف فرقہ سے منسوب کر کے خوفزدہ کرتے ہیں۔ کچھ یہی صورتحال عزاداریٔ امام حسینؑ میں خرافات کو رواج دینے والوں اور ان خرافات کے حامیوں کا ہے۔ وہ بھی ان جعلی رسومات کے منکرین کو اسی طریقہ سے متہم کرتے ہیں۔

۷۔ امام حسینؑ

یزید نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد والیٔ مدینہ ولید بن عتبہ کے نام ایک حکم نامہ بھیجا کہ اگر حسینؑ ابن علیؑ میری بیعت سے سر تابی کریں تو ان کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ چنانچہ مروان بن حکم نے بھی ولید کو یہی مشورہ دیا کہ امام حسینؑ کو واپس جانے نہ دیا جائے بلکہ آپؑ کو گرفتار کر لیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ لیکن ولید نے یہ کہکر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ آیا حسینؑ کو صرف یہ کہنے پر کہ "بیعت نہیں کروں گا" قتل کیا جا سکتا ہے؟

صبح عاشورا امام حسینؑ کبھی اپنے اصحاب سے دشمن کے سامنے جا کر انہیں وعظ و نصیحت کرنے کو کہتے اور کبھی خود تشریف لے جاتے اور فرماتے "آخر تم لوگ کیوں میرے قتل کے درپے ہو، کس منطق کے تحت مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟ آیا میں مسلمان نہیں ہوں؟ کیا میں نے کسی کو بے گناہ قتل کیا ہے، یا دین سے

منحرف ہوں، مرتد ہو گیا ہوں، یا شریعت میں تبدیلی کی ہے؟ آخر تمھارے پاس میرے قتل کا کیا جواز ہے؟"لیکن لشکر عمر ابن سعد نے جواب دیا کہ "ہم آپؑ کی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ہم صرف ایک بات جانتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ یزید کی بیعت کریں"۔ ان کے پاس بس یہی جواز تھا جس کی پاداش میں وہ امام حسینؑ اور آپکےؑ اصحابؓ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

۸۔ دربار عبید اللہ بن زیاد

اسیرانِ آل محمد جب دربار ابن زیاد میں پہنچے تو اس لعین نے امام سجادؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ کون ہے؟ امام سجادؑ نے جواب دیا: "میں علیؑ بن الحسینؑ ہوں"۔ تو اس نے کہا "کیا علی بن الحسینؑ کربلا میں قتل نہیں ہوئے تھے؟" آپؑ نے فرمایا: "وہ میرے بڑے بھائی علی اکبرؑ تھے، جسے تمہارے لشکر والوں نے شہید کیا"۔ یہ سن کر ابن زیاد نے فوراً جلاد کو حکم دیا کہ آپؑ کا سر تن سے جدا کر دے۔ یہ سنتے ہی جنابِ زینب (س) نے خود کو آپؑ کے اوپر گرا دیا۔ اس نے حکم دیا کہ جناب زینب (س) کو بھی آپ کے ساتھ قتل کر دیا جائے۔ لیکن عمر ابن کریز نے اسے اس ظلم سے باز رکھا۔

اس قسم کے تشدد کی بہت سی مثالیں دور جدید میں بھی موجود ہیں۔ بہت سے اعمال وافعال ایسے ہیں جن کی کوئی منطق نہیں ہے مگر پھر بھی انہیں انجام دینے پر نہ صرف اسرار بلکہ ضدبازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، خواہ اسکے نتیجہ میں کتنی ہی قیمتی جانوں اور مال کا ضیاع ہی کیوں نہ ہو۔ خود یہ مؤقف اس عمل میں تشدد کی دلیل ہے۔ بطور مثال ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں عید نوروز کے موقعہ پر جلوس نکالے جاتے ہیں حالانکہ عید نوروز کا مذہب اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ تو ایران کے آتش پرست شاہنشاہیوں کی تاج پوشی کا دن ہے۔ ایک ایسا

تہوار جسکا نہ اسلام سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہمارے وطن پاکستان سے کوئی رشتہ‘ اس کو اپنے مذہب کا جز قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ خود ایران میں اس تہوار پر کوئی جلوس نہیں نکلتا‘ پھر ہمارے یہاں اس موقع پر جلوس نکالنے‘ مخالفین سے تکرار اور تشدد آمیز رویہ اختیار کرنے کا کیا جواز ہے؟ جبکہ اس کی پاداش میں قیمتی جانیں تک ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہ غیر منطقی تشدد نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح بعض علاقوں میں اعیاد مذہبی پر چراغان کرنے اور نہ کر دینے میں جانیں ضائع کرتے ہیں یا ضائع ہونے دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک کلمہ گو مسلمان کو‘ جو خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہے‘ حضورؐ کو آخری نبیؐ بر حق مانتا ہے‘ کعبہ کو قبلہ سمجھتا ہے‘ فروع دین پر عمل کرنے والا ہے‘ فقط صحابہ کرام پر تنقید کرنے کی پاداش میں موت کا حقدار قرار دینا بھی ایک بدترین تشدد ہے۔ گو کہ مذکورہ عمل مذموم ہے‘ لیکن اسے بہانا بنا کر ایک مسلمان کو قتل کرنا‘ غیر منطقی تشدد کی ایک واضح مثال ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ہمارے ملک میں تشدد کا یہ سلسلہ پوری شدومد کے ساتھ جاری ہے۔

تشدد مذموم اور عدم تفہیم

تشدد مذموم میں سب سے بُری حماسہ گیری فریق مخالف سے افہام و تفہیم کے دروازہ کو بند کرنا ہے۔ اس سے بدتر کوئی تشدد کا مظہر نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ مشرکین سے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے کی پیشکش کرتے تھے‘ جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ آپؐ فرماتے تھے :

> ”ہم دونوں میں سے ایک گمراہ ہے اور ایک ہدایت پر‘ ایسا نہیں ہے کہ دونوں گمراہی پر ہوں یا دونوں حق پر ہوں‘ آیئے ہم افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں“۔

مشرکین مکہ پیغمبر اکرمؐ کی اس پیشکش کے جواب میں کیا کہتے تھے، قرآن کی آیت ملاحظہ ہو :

"وقالوقلوبنا فی اکنۃ ممّاتدعونا الیہ وفی اذاننا وقرٌومن بیننا وبینك حجابٌ فاعمل اِننا عاملون"۔

"اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل، جن باتوں کی تم دعوت دے رہے ہو، ان کی طرف سے پردہ میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بہراپن ہے اور ہمارے درمیان پردہ حائل ہے، لہٰذا تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔"

(سورۂ فصلت : ۵)

تشدد مذموم اور تفسیر باطل

تشددِ مذموم اپنانے والوں کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ کسی ایک کلمۂ صحیح یا کلامِ مستند کو لے کر اس کی غلط تفسیر کرتے ہیں اور پھر اس کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرقہ خوارج نے صفین، مسجد کوفہ اور نہروان میں ایک ایسے ہی کلمہ کو اپنا شعار بنایا۔ لا حکم الا اللہ (حکومت صرف خدا کیلئے) کہہ کر کتنے فساد برپا کئے جس کے نتیجے میں کسقدر خون بہایا گیا۔ مولا امیر المومنینؑ نے اس غلط تفسیر سے پردہ اٹھایا اور فرمایا کہ یہ کلمہ اپنی جگہ صحیح ہے، حکومت اصل میں خدا ہی کی ہے، لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ حاکم صرف خدا ہے، جبکہ اس حکومت کو اس کے احکام کے مطابق چلانے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔

دورِ حاضر میں ہمارے ملک میں بھی ایک ٹولہ اہل بیتؑ کے مسئلہ نورانیت کی غلط تفسیر کے ذریعہ خوارج ہی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس طرح سے یہ لوگ اہل بیتؑ کی حقانیت کو پس پشت ڈالنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اہل بیتؑ کے نور ہونے سے متعلق آیات و روایات کثرت سے موجود ہیں، لیکن یہاں

نور سے مراد یہ ہے کہ خود بھی واضح وروشن ہو اور دوسروں کو بھی واضح وروشن کرے۔ یہ ذوات ایسے نور ہیں اور حسب روایات اتنے جلی ہیں کہ وجہُ اللہ قرار پائے، یعنی ان کو دیکھ کے یاد خدا آتی ہے۔ یہ ذوات دیگر انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی دینے کیلئے آئے ہیں لیکن افسوس کہ تشدد و مذموم اپنانے والوں نے ان کے نور ہونے کی غلط تفسیر کر کے لوگوں کو انکی نورانیت سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا ہے۔

تشدد مذموم کا نتیجہ۔ تمسک سے محرومی :

تشدد مذموم وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنے افعال، حرکات وسکنات، کردار و گفتار اور دعویٰ کے بارے میں کوئی مستند دلیل نہیں ملتی ہے۔ جس کے پاس کے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے دلائل کی فراوانی ہوتی ہے، وہ انہیں کمال اطمینان کے ساتھ اور بغیر کسی جھجھک کے پیش کرتا ہے اور مخالفین کو انکے ذریعہ سے چیلنج کرتا ہے۔ اسلئے جو صحیح معنوں میں امام حسینؑ کا پیروکار ہے، اسے حسینی سیرت کا مجسم بننا چاہئے اور دورِ حاضر میں اس سیرت کا ترسیم پیش کرنا چاہئے۔

امام حسینؑ نے جب خود کو سفاک لشکر کے سامنے پیش کیا تو فرمایا:

"میں تمہارے سامنے آیا ہوں، بتلاؤ کس بنیاد پر تم میرے خون کے در پے ہو؟ آیا تمہیں میرے مسلمان ہونے میں شک ہے؟ کیا میں دین سے منحرف ہو چکا ہوں؟ آیا میرے ذمہ کسی کا قصاص ہے؟ کیا میں نے شریعت میں کوئی تبدیلی کی ہے؟"۔

امامؑ کے ان سوالوں کے جواب میں شکر عمر سعد میں سے کسی کے پاس بھی کوئی منطق و دلیل نہیں تھی۔

آج عزاداریٔ امام حسینؑ اور مراسم عزاداری کو خرافات سے پُر کرنے والوں

کے پاس اگر کوئی منطق و دلیل ہے' اگر وہ ان خرافات کو عزاداری میں روا رکھنے کیلئے کوئی سند رکھتے ہیں اور اگر وہ صحیح معنوں میں حسینؑ کے پیروکار ہیں تو کیوں حسینؑ بن کر کمال اطمینان سے پیش نہیں کرتے ؟

حماسۂ ممدوح یا پسندیدہ تشدد

حماسۂ ممدوح و پسندیدہ کا مطلب ہے' حق و باطل کی راہیں واضح و روشن ہونے کے بعد 'بغیر کسی خوف و ہراس کے اور بغیر کسی کی پروا کیئے' حق پر شدت اور سختی سے قائم و دائم رہنا۔ یہی انبیاء کی سیرت رہی ہے اور قرآن کریم میں ایسی ہی ہستیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو :

"ان الذین قالوا ربنا ثم استقاموا تتنزلُ علیھم الملئکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون"۔

"بیشک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اس پر جمے رہے' ان پر ملائکہ یہ پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور رنجیدہ بھی نہ ہو اور اس جنت سے مسرور ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

(سورۂ حم السجدہ آیت ۳۰)

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون"۔

"بیشک جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا اور اسی پر جمے رہے' ان کیلئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہونے والے ہیں"۔ (سورۂ احقاف : ۱۳)

اسی طرح خداوند تعالیٰ سورۂ یوسف میں یوسفِؑ صدیق کی زبان سے فرماتا ہے :

"یہی میرا راستہ ہے کہ میں بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دیتا

ہوں اور اتباع کرنے والا بھی ہے......"۔ (سورۂ یوسف : ۱۰۸)

صرف خوف و ہراس پھیلانے والوں اور ملامت کرنے والوں کے مقابلے میں اہل حق کا اپنے موقف پر ڈٹے رہنا حماسۂ ممدوح نہیں ہے بلکہ باطل طاقتوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے سمجھوتوں اور مصالحتی ایجنڈوں کو مسترد کرنا بھی اور صلح و آشتی کی فضا قائم کرنے کی سفارش ہوتی ہے' لیکن اسکے باوجود اس قسم کے جالوں میں نہ پھنسنا اور سختی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنا حماسۂ ممدوح یا پسندیدہ تشدد ہے۔ یہ عقلی بات ہے کہ باطل پر جب تک حق واضح نہ ہو' اسے حق کی طرف بلانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس پر حق کو واضح و روشن کر دینے کے بعد اہل حق کا استقامت دکھانا' اسلئے ضروری ہے کہ باطل چونکہ حق سے دشمنی رکھتا ہے' اسلئے اسکی صلح طلبی یا نرم گوشہ اختیار کرنے کی درخواست حسن نیت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے ذریعہ کسی موقع کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ اہل حق کو نرم گوشہ اختیار کرنے کی دعوت اسلئے دیتا ہے تاکہ ان کے دین میں سستی پیدا ہو جائے اور وہ خود اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ مشرکین جب پیغمبر اکرمؐ کو دعوت بہ اسلام سے ہاتھ اٹھانے کیلئے قانع نہ کر سکے تو انہوں نے خدا اور بتوں کی پرستش میں سال کو تقسیم کرنے کی بات شروع کر دی۔ کہنے لگے' جب خدا کی پرستش کا موقع آئے گا تو ہم پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ خدا کی پرستش کریں گے اور جب ہمارے بتوں کی پرستش کا وقت آئے گا تو پیغمبرؐ کو بھی ہمارے ساتھ بتوں کی پرستش کرنا ہوگی۔ گویا ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود تو مشرک تھے ہی' اسلئے خدا کی پرستش سے ان کیلئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہونا تھا' جبکہ پیغمبرؐ موحد تھے' بتوں کی پرستش سے پیغمبرؐ خود بخود توحید پرستی سے نکل کر شرک میں داخل ہو جائیں گے اور پھر وہ یہ کہہ سکیں گے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے موقف سے منحرف ہو گئے ہیں۔ لہٰذا

خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ؐ کو ان سازشوں کے سامنے خاضع ہونے اور ایسا نرم گوشہ رکھنے والوں کے آگے جھکنے کے تمام طریقوں سے منع فرمایا۔ سورۂ مبارکہ کافرون اسی سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح سورۂ یونس میں خداوند متعال پیغمبر اکرم ؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل، تم میرے عمل سے بری اور میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں"۔

(سورۂ یونس آیت ۴۱)

اس سلسلے میں قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات وارد ہوئیں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :

"اور جب لغویات سنتے ہیں تو کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال......"۔

(سورۂ قصص : ۵۵)

"آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! کیا تم مجھے اس بات کا حکم دیتے ہو کہ میں غیر خدا کی عبادت کرنے لگوں اور یقیناً تمہاری طرف اور تم سے پہلے والوں کی طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد کردیئے جائیں گے اور تمہارا شمار گھاٹے والوں میں ہو جائیگا۔ تم صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے شکر گزار بندوں میں ہو جاؤ"۔ (سورۂ زمر آیات : ۶۴، ۶۵، ۶۶)

"اور اگر ہماری توفیق خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ

(بشری طور پر) کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہو جاتے"۔

(سورۂ اسراء : ۷۴)

"اور خبر دار تم لوگ ظالموں کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرنا کہ جہنم کی آگ تمہیں چھو لے گی اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہوگا اور تمہاری مدد بھی نہیں کی جائے گی"۔ (سورۂ ہود : ۱۱۳)

"ایمان والو! اپنے آس پاس والے کفار سے جہاد کرو اور وہ تم میں سختی اور طاقت کا احساس کریں......"۔ (سورۂ توبہ : ۱۲۳)

"اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ"۔ (سورۂ تحریم : ۹)

"تم سے بہت سخت قسم کا عہد لیا ہے......"۔ (سورۂ نساء : ۲۱)

"اور ان سے بڑا سخت عہد لے لیا ہے" (سورۂ نساء : ۱۵۴)

"اور ہم نے ان سے بہت سخت قسم کا عہد لیا ہے"۔ (سورۂ احزاب : ۷)

"پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے"۔

(سورۂ توبہ آیت ۷۳)

قرآن کریم کی آیات یہی درس دیتی ہیں اور سیرتِ پاک انبیاء وائمہ طاہرینؑ میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ وہ کبھی بھی دلیل و برہان اور منطق کے بغیر کسی تشدد کے قائل نہ تھے۔ وہ نہ خدا اور اس کے عطا کردہ دین کو اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی ہواؤں کے زد میں رکھنے کے حق میں تھے اور نہ ہی اس بات کے حق میں تھے کہ کسی کی خوشامد میں آکر دین کو قربان کیا جائے یا فلسفہ ضرورت کو اقدار بنا کے دین کو پس پشت ڈالا جائے۔

سورۂ مبارکہ فتح کی آیت ۲۹ میں خداوند عالم نے پیغمبر اور پیغمبر پر ایمان

لانے والوں کے اوصاف واضح طور پر بیان فرمائے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے :

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں' وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں۔ آپ انہیں رکوع' سجود میں دیکھتے ہیں۔وہ اللہ کی طرف سے فضل اور خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ان کے یہی اوصاف توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی ان کے یہی اوصاف ہیں۔وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) سوئی نکالی پھر اسکو مضبوط کیا اور موٹی ہوئی' پھر اپنے تنے پر سیدھی کھری ہو گئی اور کسانوں کو حرش کرنے لگی تاکہ اسطرح کفار کا جی جلائے"۔

اس آیت میں خداوند تعالی نے واضح طور پر بتادیا ہے کہ اہل حق کو کفر والحاد کے ساتھ کیا روّیہ اختیار کرنا ہے اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں اور دین خدا کیلئے سر و تن دینے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان اسی اصول کے تحت اگر دیکھیں کہ دین و مکتب کی بقاء ذلت اختیار کرنے اور دشمن کے آگے سر تسلیم خم کرنے میں ہے تو انہیں ایسا کرنا چاہئے تاکہ دین باقی رہے اور دین کے داعی بھی باقی رہیں۔ لیکن اگر دیکھیں کہ ان کی بقا سے دین باقی نہیں رہتا ہے بلکہ ایسے حالات میں خود ان کی حیات دین کی کمزوری کی نشانی بن جاتی ہے تو اس وقت انہیں چاہئے کہ اپنے وجود کو داؤ پر لگا دیں' ہر قسم کی اذیت و تکلیف کو برداشت کریں اور اس ظاہری تذلیل سے خوف نہ کھائیں' تاکہ دین سربلند رہے۔

حماسہ حسینی

تحریک ونہضت حسینی، شروع سے لیکر آخر تک حسین وحسینیوں کے حماسہ سازی کا مظاہرہ ہے۔ امام حسینؑ اور آپ کے جانثاروں نے ان مخصوص حالات میں جس محیر العقول حماسہ کا مظاہرہ کیا ہے' دنیابھر کے مردانِ شجاع آجتک اس پر انگشت بدنداں ہیں۔

حماسۂ حسینی، ادائے حقوق کی خاطر ایک ایسی حماسہ گری ہے جسکے کرداروں کو دوبڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

۱۔ اس حماسہ کا مرکز خود امام حسینؑ ہیں۔ اس تمام واقعہ میں آپکو وہی مقام حاصل ہے جو منظومۂ شمسی میں سورج کا ہے۔ منظومۂ شمسی کے دوسرے تمام ستاروں کی روشنی کا دارومدار سورج کی روشنی پر ہوتا ہے۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو باقی سب ستارے بے نور ہو جائینگے۔

۲۔ حماسہ حسینی کا دوسرا کردار وہ جانثاران حسینؑ ہین جو تمام تر خطرات دیکھتے بھالتے' امام حسینؑ کے گرد پروانوں کی طرح چکر لگاتے رہے۔ یہ دلیرانِ بے مثل دشمن کی قوت ودرندگی کو چیلنج کرتے ہوئے ابراہیمؑ خلیل کی طرح نارِ نمرود میں کود پڑے اور ہر موقع اور مقام پر انہیں ایسا دندان شکن جواب دیا کہ دنیابھر کے حماسہ خواہوں کیلئے بہترین اسوہ اور مینارِ حماسہ بن گئے۔ یہ ہیں اس منظومۂ شمسی کے وہ درخشاں ستارے کہ جسکا سورج حسینؑ ہیں۔

اس گروہ میں چھوٹی چھوٹی عمروں کے نابالغ بچے' نوجوان' جوان اور بوڑھے' غرض ہر عمر اور ہر سن کے افراد شامل تھے۔ انکے علاوہ چادر اسارت پہن کر دشمن کے ایوانوں میں آتشین خطبہ دینے والی سیدانیاں' اہلبیت اطہارؑ اور جوانان بنوہاشم بھی اسی گروہ کے اہم ارکان ہیں۔

یہاں ہم اس معرکہ حق وباطل میں حماسۂ عمومی کا مظاہرہ کرنے والی شخصیات کا ذکر کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ انہوں نے کس انداز میں حماسہ کے مظہر نمائی کی ہے۔

ا۔ نمائندہ یا سفیرِ اولِ حسینؑ کا حماسہ

اکثر کتب مقاتل بالخصوص مقتل بحر العلوم ص ۲۳۱ پر لکھا ہے کہ جب لشکر عبید اللہ بن زیاد نے حضرت مسلمؑ کی پناہ گاہ یعنی منزل طوعہ کا محاصرہ کیا تو مسلم بن عقیل انتہائی جرأت وشہامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، دشمن کی طاقت وقدرت سے بے پرواہو کر، گھر سے باہر نکلے۔ آپ نے فرمایا: "میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر مر جاؤں تو آزاد مروں، گرچہ موت میرے لئے کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت سے ملاقات کرنی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے سردی کے بعد گرمی کا آنا یقینی ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو آزاد کیوں نہ مروں!"

جب آپ کو اسیر کر کے دار الامارۃ لایا گیا اور ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے کمال بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ عبید اللہ ابن زیاد کو سلام کئے بغیر داخل دربار ہوئے۔ درباریوں کو آپ کی اس جرات پر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگے "امیر کو سلام کرو"۔ آپ نے فرمایا: "خاموش ہو جاؤ! یہ میرا امیر نہیں ہے؟ میرے امیر حسینؑ ہیں"۔

ابن زیاد نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا: "اے عاق اے شاق! تم نے وقت کے امام کے خلاف خروج کر کے وحدت امت کو پاش پاش کیا اور فتنہ وفساد برپا کرنے کی کوشش کی"۔ آیئے دیکھتے ہیں اس موقع پر یہ اسیر کس قسم کے حماسہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ آپ نے اس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"تم نے جھوٹ بولا ہے، وحدت کو ہم نے نہیں معاویہ اور اس کے بیٹے

یزید نے پاش پاش کیا ہے۔ فتنہ تم نے اور تمہارے باپ نے پھیلایا ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس کے بدترین خلائق کے ہاتھوں شہادت نصیب کرے"۔

ابن زیاد نے کہا :

"تم تو حکومت کی خواہش لیکر آئے تھے لیکن خدا تمہارے اور حکومت کے درمیان حائل ہو گیا۔ تم حکومت تک نہیں پہنچ سکے اور حکومت کو خدا نے اسکے اہل کیلئے باقی رکھا"۔

آپ نے پوچھا : "تمہاری نظر میں اہل سے مراد کون ہے ؟"

اس نے کہا : "یزید ابن معاویہ"

پھر آپ سے پوچھنے لگا کہ : "کیا تمہیں اس کے بر حق ہونے میں گمان ہے ؟"

آپ نے فرمایا : "مجھے گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ اس منصب کا سزاوار نہیں ہے"۔

اس طرح سے امام کے اس نمائندے نے دیار غریب میں ہونے کے باوجود شقی ترین انسان کی شقاوت و جسارت کو چیلنج کیا۔ یہ وہی شقی انسان تھا جس کے شقی باپ کو معاویہ نے محض اس کی شقاوت کی وجہ سے اہل کوفہ پر مسلط کیا تھا۔ اسکے سینہ میں محبان علیؑ کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آپ نے نہایت بے جگری سے اس کا مقابلہ کیا اور اپنے ہدف پر یقین رکھتے ہوئے دشمن کے ظلم و ستم اور جنایتوں کا جواب دیا۔

۲۔ حماسۂ مسلم بن عوسجہ

مقتل بحر العلوم ص ۲۸۱ پر نقل ہے کہ : شب عاشور امام مظلومؑ نے اپنے اصحاب کو جمع کر کے فرمایا : "دشمن ہمارا محاصرہ کر چکا ہے۔ اب بچنے کی کوئی امید

باقی نہیں رہی۔ یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں' لہٰذا آپ حضرات جو میرے باوفا اصحاب ہیں' رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے چلے جائیں۔ دشمن آپ سے تعرض نہیں کریگا اور میری طرف سے آپ سب کو اجازت ہے"۔ یہ سنناتھا کہ مسلم بن عوسجہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بولے :

"مولاؑ ہم ایسا کیوں کریں؟ خدا کبھی ہمیں وہ دن نہ دکھائے کہ ہم ایسی شرمناک حرکت کے مرتکب ہوں۔ میں اپنا نیزہ دشمن کے سینے کے آرپار کردونگا۔ جب تک میرا ہاتھ سالم ہے' جنگ کروں گا۔ اگر اسلحہ ختم ہوگیا تو ہم پتھروں سے جنگ کریں گے۔ لیکن کسی قیمت پر آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ کے ساتھ جئیں گے اور آپ کے ہی ساتھ مریں گے"۔

۳۔ حماسۂ سعید بن عبداللہ حنفی

سعید بن عبداللہ حنفی نے امام حسینؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

"اے فرزند رسولؐ! ہم کبھی بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے' یہاں تک کہ خدا کو گواہ بنالیں کہ ہم نے پیغمبر اکرمؐ کے بعد آپ کی حفاظت کی ہے۔ اگر ہمیں ستّر (۷۰) بار قتل کیا جائے' ہماری لاشوں کو جلا کر اسکی راکھ ہوا میں اڑادی اور پھر ہمیں زندہ کیا جائے' تب بھی ہم آپ سے جدا نہیں ہوں گے۔ ہم اپنی جانیں آپ پر نثار کریں گے۔ ہم ایسا کیوں نہ کریں' یہ ہمارے لئے آسان اور ختم نہ ہونے والی کرامت ہے"۔

۴۔ حماسۂ زہیر ابن القین

زہیر نے کہا :

"فرزند رسولؐ! میری خواہش ہے کہ اعداء مجھے قتل کریں' اسکے بعد مجھے

زندہ کیا جائے، پھر قتل کریں، پھر زندہ کیا جائے۔ اس طرح ہزار بار بھی ہو جائے تو مجھے منظور ہے اگر آپ اور آپ کے اہل بیتؑ بچ جائیں۔ میرے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے ہاتھوں سے آپ کا دفاع کریں گے، اپنے خون سے آپ کا دفاع کریں گے اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ ہمارا خدا ہم سے راضی نہ ہو جائے"۔

حماسۂ علی اکبرؑ:

حسینؑ کا یہ فرزند رشید میدان جنگ میں مثل شیر غضبناک اتر کے آیا۔ دشمن کی کثرت کو خاطر میں لائے بغیر اپنے حماسہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرج کر بولا:

"میں علیؑ، فرزند حسینؑ ابن علیؑ ہوں۔ ہم وہ ہیں جنہیں کعبۃ اللہ اور رسولؐ اللہ کی نسبت سے بلندی عطا ہوئی ہے۔ خدا کی قسم ہمارے اوپر فرزندِ زانیہ حکومت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے نیزے سے تمہیں ماروں گا، یہاں تک کہ موت آجائے۔ اپنی تلوار سے بابا کا دفاع کروں گا اور علیؑ مرتضیٰ کی شجاعت کا مظاہرہ کروں گا"۔

حماسۂ عباسؑ

لشکر حسینؑ کا علمدار باوفا، امید و سہارائے اہل بیتؑ، عباسؑ باوفا جب لشکر اعداء کے نرغہ میں گھر گیا تو اس عالم میں بھی انتہائی بے پروائی کے ساتھ یہ رجز پڑھا:

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اگر موت میری طرف آئے تو میں خود میدان جنگ میں کود جاؤں گا۔ میرا نفس وقف ہے نفسِ مصطفیٰ کی حمایت کیلئے۔ میں آج میدان جنگ سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ اگر یہ لوگ میرا دایاں ہاتھ قطع کر دیں تب بھی میں دین کی حمایت نہیں چھوڑوں گا اور امام وقت کا دفاع کرتا رہوں گا۔ اے نفس! کفار سے خوف زدہ نہ ہونا،

تیرے لئے رحمت جبار کی بشارت ہو"۔

حماسۂ خواتین

اس معرکۂ حق وباطل میں خواتین بھی کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ عمر رسیدہ افراد اور کم سن بچوں کے علاوہ خواتین نے بھی لشکر اعداء کی تعداد اور قوت سے بے پرواہ ہو کر، دشمن کے نیزوں اور پتھروں کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت کو آب کوثر کی مانند نوش کیا۔

حماسۂ زینب سلام اللہ علیہا

عقیلۂ قریش، پروردۂ دامن عصمت، حضرت زینب سلام اللہ علیہا جب پورے خاندان کا داغ جدائی لیئے، اسیری کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے حاکم کوفہ کے دربار میں پہنچیں تو فتح کے نشہ میں چور، فرعون بن کے کرسی پر بیٹھنے والے نے بزعم خود آپ کو ذلیل کرنے اور زخموں پر نمک پاسی کرنے کیلئے کہا: "اس خدا کیلئے حمد ہے جس نے آپ کو شرمندہ کیا، مردود قرار دیا اور آپ کی باتوں کو جھوٹا ثابت کردیا"۔ یہ جملے سنتے ہی وہ خستہ تن زینب (س) جسکا دل زخموں سے چور چور تھا، کمال شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"حمد ہے اس ذات کیلئے جس نے ہمیں نبوت سے نوازا اور رجز و پلید گی سے دور رکھا۔ شرمندگی فاسق کیلئے ہے، جھوٹ فاجر بولتا ہے اور وہ ہم نہیں ہیں"۔

آپ کا جواب سنکر عبید اللہ بن زیاد نے پوچھا: "آپ نے اپنے بھائی اور اہل بیت سے متعلق خدا کے فیصلے کو کیسا پایا؟" ایکبار پھر آپ نے جرات مندی سے فرمایا:

"اے فرزند مرجانہ! تیری ماں تیرے غم میں روئے۔ میں نے تو بجز حسن وجمال کے کچھ نہیں دیکھا"۔

اسکے بعد جب دختر علیؑ کو دربار یزید میں لایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ یزید تختِ حکومت پر بیٹھا ہوا ہے اور سر حسینؑ اسکے سامنے رکھا ہے۔ کبھی وہ اپنے اس فعل قبیح پر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور کبھی آپ کی شان میں شماتت کے کلمات ادا کرتا ہے۔ جناب زینب (س) نے اس موقع پر یزید کے دربار میں ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے فرمایا:

"اے یزید! تو اپنے تمام تر مکر و فریب کو بروئے کار لے آ۔ جو کچھ تو کرنا چاہتا ہے کرلے، لیکن یاد رکھ ہمارے ذکر کو کبھی نہیں مٹا سکے گا۔ میں تجھے انتہائی حقیر سمجھتی ہوں۔ میرے لئے یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ آج میں تجھ سے مخاطب ہوں"۔

حماسۂ سردارِ حماسہ گران

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ منصب امامت پر فائز ہوئے۔ جس دن آپ نے اس بار امانت کو سنبھالا، اسی روز سے دین کے دفاع اور بقاء کیلئے ہمیشہ حماسہ آفرینی کا عظیم مظاہرہ کیا ہے۔ اس حماسہ آفرینی کی شعاعیں آپ کے اہل بیت اطہارؑ اور یاران باوفا پر بھی پڑیں۔ چنانچہ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں عرض کیا، ان شخصیات والا صفات نے بھی اپنے اپنے مقام پر بے مثل شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں پر ہم امام حسینؑ کی حماسہ آفرینی کے چند نمونے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں:

۱۔ معاویہ کی سر توڑ کوشش تھی کہ کسی طرح یزید کی ولی عہدی کے معاملہ میں امام حسینؑ کو قانع کرسکے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے وہ ہر قسم کے مکر و فریب، دھوکہ اور چاپلوسی سے کام لیتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ جب وہ مدینہ آیا تو کوشش کی کہ امام حسینؑ کو نظر انداز کرتے ہوئے ابن

عباس کو خاندان رسالت کا سربراہ بنا کر' ان سے یزید کی ولیعہدی کا اقرار لے لے۔ امام حسینؑ نے اسکے ارادوں کو بھانپتے ہوئے فرمایا: "اے ابن عباس! تم خاموش رہو' میں جواب دیتا ہوں" پھر آپ نے معاویہ سے فرمایا:

"تم ایک مجہول شخص کی تعریف کرنا چاہتے ہو' گویا ہم اسے نہیں جانتے جبکہ یزید نے اپنے برے اعمال و کردار کے ذریعہ اپنا تعارف خود کرا لیا ہے"۔

۲۔ معاویہ نے امام حسینؑ پر فتنہ و فساد پھیلانے کی سازش کا الزام عائد کر کے آپکو متہم کرنے کی کوشش کی تاکہ اس تہمت کے دفاع میں آپؑ اس سے یہ وعدہ کریں کہ ہم تم سے کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔ لیکن امامؑ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بیک وقت دو زاویوں سے حقیقت کو واضح فرمایا۔ آپؑ نے کہا:

"اگر میں تمہارے ساتھ جنگ نہیں کر رہا ہوں تو یہ میری تقصیر ہے اور اگر تم دھمکی دے رہے ہو' تو جو کچھ کرنا چاہتے ہو' کر بیٹھو"۔

۳۔ جب والیٔ مدینہ نے امامؑ کو اپنے دربار میں بے وقت بلا کر بیعت کا سوال کیا تو آپؑ نے انتہائی جرأت مندانہ انداز میں اسے جواب دیا۔ آپؑ نے فرمایا:

"ہمارا تعلق اہل بیت النبوةؐ سے ہے' معدن الرسالة سے ہے۔ یزید فاسق و فاجر ہے۔ مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا"۔

۴۔ جب بنو امیہ کے مقرر کردہ امیر حج عمر ابن سعید اشدق نے امام حسینؑ کو دوران حج شہید کرنے کی سازش کی تو آپ مکہ سے دن کی روشنی میں یہ فرماتے ہوئے نکلے:

"بنو امیہ نے اس سرزمین امن کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ انہوں نے اس کے امن کو بدامنی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرے لئے یہاں امن نہیں رہا لہٰذا میں یہاں سے نکل رہا ہوں"۔

۵۔ جب والی بنو امیہ کے بھائی، یحییٰ ابن سعید نے مکہ سے باہر امام حسینؑ کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ آپ فتنہ وفساد پھیلانے جارہے ہیں، واپس چلیں تو امامؑ نے تلوار نیام سے نکالی اور مقابلہ کیلئے تیار ہو گئے۔ آپؑ نے فرمایا:

"میرے اعمال میرے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ میں تم سے بری ہوں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے"۔

۶۔ جب اثنائے سفر حر نے آپؑ کا راستہ روکا اور مقابلہ کرنے کی صورت میں قتل کی دھمکی دی تو آپؑ نے فرمایا:

"تم مجھے موت کا خوف دلاتے ہو، میں اپنے ارادہ پر قائم ہوں۔ موت جوانمردوں کیلئے کوئی عار نہیں، شرط یہ ہے کہ وہ ارادتاً حق پر ہو اور دین کی راہ میں جہاد کیلئے آمادہ ہو"۔

اسی طرح جب حُر نے کوفہ سے آنے والے نافع بن ہلال اور ان کے ساتھیوں کو روکنا چاہا تو امامؑ نے فرمایا: "ان کو چھوڑ دو، اگر نہیں چھوڑو گے تو جس طرح میں اپنے اہل بیت کا دفاع کرتا ہوں ان کا دفاع بھی کروں گا"۔ حُر نے جب امام کے عزم وارادہ کو دیکھا تو ان کو چھوڑ دیا۔

۷۔ کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ جب سارے انصار اور بنو ہاشم کے تمام افراد درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے تو خود امام حسینؑ شوق لقاء اللہ میں کسی دولہا کی طرح موت سے معانقہ کرنے نکلے۔ آپ ایسے مردانہ وار اور شجاعانہ انداز میں خیمے سے نکلے کہ دیکھنے والوں نے اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "واللہ! ایسا شخص ہم نے کبھی نہیں دیکھا جس کے اہل بیتؑ ویاران سب شہید ہوئے ہوں اور وہ اتنا مطمئن و پرسکون ہو اور ایسے درخشاں چہرہ اور ایسی جرأت و شہامت کے ساتھ میدان میں نکلا ہو"۔ میدان میں آکر

آپ نے دشمنوں کو للکارا۔ جب دشمن قریب آنے کی جرأت نہ کر سکا تو آپ خود ان پر ٹوٹ پڑے۔ لکھا ہے کہ جس طرح شیر کو دیکھ کر بھیڑ بکریاں بھاگتی ہیں، اس طرح سے دشمن آپ کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کرتے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ قریب آئے اور آپ سے جنگ کرے۔ جب عمر سعد نے دیکھا کہ لشکر پر شکست کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں تو اس نے ملامتی لہجے میں کہا: "اے قوم! افسوس ہو تمہارے لئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم کس کے مقابل میں ہو، جانتے ہو یہ کس کا فرزند ہے؟ یہ حسینؑ، فرزند علیؑ ہیں، یہ قتال عرب کے فرزند ہیں۔ ان کے ساتھ فرداً فرداً مقابلہ نہیں کر سکو گے، ہر طرف سے گھیر کے انپر حملہ کرو۔ ادھر یہ شور تھا اور ادھر آپؑ فرما رہے تھے:

"موت انسان کیلئے عار و ننگ سے بہتر ہے اور عار انسان کیلئے جہنم میں جانے سے بہتر ہے"۔

شہید مرتضٰی مطہریؒ اور حماسہ سازی

شہید مرتضٰی مطہریؒ ایران اسلامی کے اس خطہ میں پیدا ہوئے جہاں مکتب تشیع اور مکتب اہل بیتؑ سے تعلق و وابستگی رکھنے والوں کو غلبہ و اکثریت حاصل ہے۔ جس زمانہ میں آپ نے حصول و معارف اسلامیہ کا دور مکمل کیا' ان دنوں ایران مغرب و امریکہ کی استعماری سازشوں کی ایسی آماجگاہ تھا جو اس پورے خطے کے علمی' فکری اور دیگر اسلامی مراکز کو نشانہ بنانے کیلئے ایک کنٹرول روم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ دیگر منصوبہ جات کی طرح ایک کثیر الرقم بجٹ اسلام و تشیع کو مسخ کرنے کیلئے مختص کیا جاتا تھا۔

ایک طرف دینِ اسلام کو دشمنی و عداوت کا نشانہ بنا کے اسکا مذاق اڑایا جاتا تھا اور دوسری طرف دوستی کی آڑ میں مختلف شعائر اسلامی میں خرافات داخل کی جاتی تھیں۔ حکیم و فیلسوف شہید مرتضٰی مطہریؒ نے اِن حالات کو درک کرنے کے بعد ایک حکمت عملی تیار کی اور اسے عملی جامہ پہنانے میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے تمامتر دور اندیشی' باریک بینی اور حکمت ستیزی کے ساتھ ہر موقع و مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک میں رائج خرافات کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ تمام خرافات اسلام و مسلمین کو پسماندہ رکھنے کیلئے رواج دیا گیا تھا' آپ نے ان کا انتہائی جرأت مندی سے مقابلہ کیا اور انکی جڑوں کو اس سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ ان خرافات میں سے بعض کے آثار آج انقلاب اسلامی کو کامیاب ہوئے بیس سال گزرنے کے بعد بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال عید نوروز کی ہے۔ ایران میں موجود قوم پرست عناصر اس تہوار کے مردہ جسم میں دوبارہ روح پھونکنے کیلئے سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں انہیں خاصی کامیابی بھی ہوئی ہے۔ یہ لوگ نوروز کے تیرہویں دن کو "سیزدہ

بدر" کہتے ہیں۔ اس دن وہ اپنے گھروں کو قفل لگا کے کھلے آسمان کے نیچے دشت وبیابان میں نکل جاتے ہیں کیونکہ وہ اسے تمام دنوں میں سب سے زیادہ منحوس دن گردانتے ہیں۔ شہید مطہری نے اس رسم کے خلاف جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، بانگ دھل آواز اٹھائی اور اس فکر کا خوب مذاق اڑایا۔

جس زمانے میں نجف اشرف مرکز فقہاء و مجتہدین تھا، ان دنوں میں بھی عالم تشیع، ایران کو ہی اپنے لئے طاقت و قدرت کا سرچشمہ تصور کرتا تھا کیونکہ تشیع کی اکثریت یہیں پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے معاشرہ میں عزاداریٔ امام حسینؑ کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس خطّے کے لوگ ہمیشہ سے عزاداری کے فروغ کے طلبگار رہے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی قانونِ رسد طلب و رسد کا اطلاق ہونا لازمی تھا۔ عزاداری کی اس بڑھتی ہوئی مانگ سے جعل سازوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ دین فروشوں نے عزاداری میں اصل متاع فراہم کرنے کے بجائے جعلی متاع فراہم کرنے کی مہم شروع کردی۔ عزاداریٔ امام حسینؑ کے نام سے ایسی ایسی خرافات کا اجراء کیا جو غیر مسلموں کی نظروں میں مسلمانوں کی بدنامی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ ان ظالموں نے عزاداریٔ امام مظلومؑ کو ہر پہلو سے گرانے کی کوشش کی، خواہ اسکا تعلق خطابت و روضہ خوانی سے ہو یا جلوسوں میں شبیہ سازی سے، ان لوگوں نے خرابی پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

رفتہ رفتہ یہ خرافات سرحد پار کر کے برصغیر میں داخل ہوگئیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر یہاں رہنے والے ان لوگوں کو جو مکتب تشیع کا کچھ درد رکھتے تھے، بہت دکھ پہنچا۔ درد دل رکھنے والے ایسے ہی ایک بزرگ عالم دین نے ایران کے اس وقت کے ایک نابغہ علم وحدیث محدث نوری کے محضر میں ایک درخواست

ارسال فرمائی۔ اس مکتوب میں انہوں نے برصغیر میں خطباء وذاکرین کی خرافات سازی اور مصائب میں دروغ گوئی کی شکایت کی۔ ساتھ ہی ان سے اس سلسلے میں اصلاحی اقدامات کرنے کی غرض سے 'اہل منبر کے وظائف وشرائط پر مشتمل کتاب تالیف کرنے کی درخواست کی۔ مرحوم محدث نوری اعلی اللہ مقامہ نے ان کی درخواست کی پذیرائی کرتے ہوئے 'لؤلؤ مرجان [۱]" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ اس کتاب میں اس عالم دلسوز کی فریاد کو تالیف کا محرک قرار دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ ہند کا بیچارہ یہ عالم دین سمجھ رہا ہے کہ یہ خرافات اس کے علاقہ کی پیداوار ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان خرافات کا اصل مصدر وماخذ تو خود ایران ہے نہ کہ برصغیر۔ امام حسینؑ کے بارے میں دروغ گوئیوں' افتراء پردازیوں' کہانیوں اور افسانوں سے پُر کتابیں اصل میں ایران ہی کی پیداوار ہیں' جیسے کتاب روضۃ الشہداء تالیف ملا کاشفی' اسرار الشہادۃ تالیف ملا دربندی' مخزن البکاء' طریق البکاء' محرق القلوب' ریاض القدس اور معالی السبطین وغیرہ۔

علمائے کرام ومراجع عظام ان خرافات کے خلاف ہوتے ہوئے بھی بے بس نظر آتے تھے کیونکہ ایک جانب یہ خرافات ملک کے طول وعرض میں جڑ پکڑ چکے تھے اور دوسری جانب خود انکے حاشیہ نشینوں نے اس سلسلے میں ایک غلط تجزیہ پیش کیا ہوا تھا۔ انکا کہنا تھا کہ اگر ان خرافات اور غلطیوں کو روکنے کا حکم دیا گیا تو لوگ مذہب ہی سے بدظن ہو جائیں گے۔ گویا ان حاشیہ نشینوں نے ابن حاجب کے گوسفند اور بھیڑیے کی مثال کو مراجع عظام کے حضور پیش کیا ہوا تھا۔ مراجع عظام کے حاشیہ نشین آج بھی انہیں ایسے ہی مشورے دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں متضاد فتاویٰ سننے میں آتے رہتے ہیں۔

---

[۱] اس کتاب کا اردو ترجمہ "آداب اہل منبر" کے نام سے دار الثقافۃ الاسلامیہ نے شائع کر چکا ہے۔

یہ علماء حضرات ایک عجیب مخمسہ میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تجزیہ نگاروں کے تجزیوں پر کان دھرتے ہوئے جرأت و شہامت کے مظاہرے اور حماسہ گیری سے گریز کرتے ہیں اور دوسری طرف سے عزاداریٔ امام حسینؑ اور مکتب اہل بیتؑ کو لاحق خطرات سے پریشان ہو کر ان اجتماعات کے ذمہ داروں کو اپنے گھروں پر بلا کے سرگوشی کے عالم میں ان خرافات کو چھوڑنے کی درخواست کرتے ہیں۔ چنانچہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے بھی اپنے بیانات میں اس سلسلے میں حوزہ علمیہ قم کے مؤسس و بانی آیت اللہ عبدالکریم حائری اور ان سے پہلے آیت اللہ بروجردی کی جانب سے کی گئی اس قسم کی کوششوں اور انکی ناکامی کا ذکر فرمایا ہے۔ تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمائیے آپکی کتاب "قیام عاشورا" جسکا اردو ترجمہ دارالثقافۃ الاسلامیہ شائع کر چکا ہے۔

دور حاضر میں شہید آیت اللہ مطہریؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے جنہوں نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور جان کی بازی لگا کر ببانگ دھل، زبان و قلم دونوں ذریعوں سے نہ صرف ان خرافات کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ ان پر مہر باطل بھی ثبت کی ہے۔ آپ کی قوتِ منطق کے ساتھ ساتھ حضرت امام خمینیؒ جیسے عظیم رہبر کی پشت پناہی آپ کے قلم و بیان کیلئے مہر صحت ثابت ہوئے۔ امام خمینیؒ نے ایرانی قوم سے اس عظیم فیلسوف و حکیم کی کتابوں کو فروغ دینے کی بھرپور سفارش کی ہے۔

شہید کے مستدل بیانات اور اس پر امام خمینیؒ کی مہر تائید نے تاجرانِ مصائب امام حسینؑ کے عزائم پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ایران اسلامی میں تو ان کی کمر ٹوٹ گئی اور ہمت قیام نہ کر سکی۔ لیکن ایران سے باہر ہندوستان وغیرہ کے وہ علماء جن کے وسائل زندگی اور عزت و شرف سب انہی خرافات سے وابستہ تھے، صبر

کی تاب نہ لا سکے۔ ان لوگوں نے اپنے بغض و عناد کا اظہار کرنے کیلئے اس مرد مجاہد کا پتلا نذر آتش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ آپ کی روح مطہر کے حق میں انتہائی جسارت آمیز زبان استعمال کی۔ ان پُر تشدد اقدامات کو دیکھتے ہوئے ہندوپاک میں کسی کو ہمت نہ ہو سکی کہ شہید مطہریؒ کی اس کتاب کو اردو زبان میں شائع کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ ایران میں موجود شہید مطہریؒ کے آثار کا دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے والے ادارے بھی یہاں کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے گوسفند و بھیڑیے کی مثال دینے والوں کے جال میں پھنس کر ہمت ہار بیٹھے۔ لہٰذا یہ نسخہ اسی طرح پڑا رہا اور یہاں تک کہا جانے لگا کہ فی الحال یہ کتاب اردو زبان میں نا قابل نشر ہے۔

ان کی یہ گزارشات ایک لحاظ سے قرین قیاس بھی ہیں۔ شہید مطہریؒ اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود اس درجہ پر تو بہر حال نہیں تھے جس پر آج آیت اللہ العظمٰی سید علی خامنہ ای فائز ہیں۔ دور حاضر کے اس عظیم رہبر نے گزشتہ مراجع عظام کے ارمانوں کو اپنی قیادت و رہبری کی طاقت و قدرت سے بلند کرتے ہوئے مراسم عزاداری کے بارے میں اپنا تاریخی بیان صادر فرمایا۔ آپ کا یہ بیان ایران کے تمام ذرائع ابلاغ سے نشر ہوا۔ دیگر مراجع عظام نے بھی رہبر کے اس فتویٰ کی مکمل تائید کی۔ لیکن بد قسمتی سے جس طرح انقلاب اسلامی' ایران کے اندر مسدود ہو کر رہ گیا ہے' اسی طرح رہبر کا یہ بیان بھی اس ملک کی حد تک ہی محدود رہا۔

ایران اسلامی کے وہ نمائندے جو ایران سے باہر کے ملکوں میں اسلام ناب محمدی اور تشیع کے صحیح چہرے کو رواج دینے پر مامور کئے گئے ہیں' انہوں نے بھی یہاں گوسفند اور بھیڑے کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اپنے زعم و گمان کے تحت انہوں نے دین کو بچانے کی خاطر رہبر معظم کے اس بیان کی تردید کر دی تا کہ یہاں کے لوگوں کی

حمایت وخوشنودی حاصل رہے اور ان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھنے پائے۔ اس سلسلے میں انہیں کچھ توانائیاں بھی صرف کرنا پڑیں تاکہ یہاں کی جمعیت پر قابض افراد ان کے خلاف زبان نہ کھول سکیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر ان لوگوں نے زبان کھولی تو ان کے مقام کو صدمہ پہنچے گا اور اگر ان کا مقام گرا تو گویا اسلام کو دھچکا لگے گا۔ گویا ان کے زعم میں اسلام کی بقا ان کی شخصی عزت سے مربوط ہے۔

اسکے برعکس ہم نے طے کر لیا ہے کہ اپنی تمام تر حیثیت کو بالائے طاق رکھ کر قیام امام حسینؑ کے اصل فلسفہ اور محرک کو دنیا کے سامنے واضح و آشکار کرنے کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور مروجہ مراسمِ عزاداری پر چھائے ہوئے خرافات کے گرد و غبار کو اپنی مصنوعی عزت و احترام کے لباس سے پاک کرتے رہیں گے۔ اپنی گزشتہ زندگی میں اس سلسلے میں ہم نے جو خاموشی اختیار کی ہوئی تھی، حسبِ فرمانِ امام حسینؑ ہم اسکے لئے استغفار کرتے ہیں۔ ایک روز ہمیں پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے سامنے جانا ہے، امام حسینؑ کو منہ دکھانا ہے۔ لہٰذا ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی تمام تر توانائیوں کو ان ذوات کی مرضی کو خریدنے میں صرف کرینگے۔

ہم شہید کی تقاریر پر مشتمل اس کتاب کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی عرصہ سے خواہش رکھتے تھے۔ لیکن بوجوہ اس پر عمل نہ ہو سکا تھا۔ یہ تاخیر ہمارے ارادے میں کسی سقم کی وجہ سے نہیں تھی، تاہم انتظار کی گھڑیاں گزرتی گئیں۔ آخر جامعہ تعلیمات اسلامی کے سربراہ حجۃ الاسلام یوسف حسین نفسی صاحب نے اسکی پہلی دو جلدوں کا اردو ترجمہ جسے انہوں نے اپنے ادارے کیلئے کروایا تھا، ہمیں عنایت فرمادیا۔ ہم نے ان کی اس پیش کش کو بصد شکریہ قبول کیا اور سال گزشتہ اسے چھپوا کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا۔ الحمدللہ کتاب کے منظر عام پر آتے ہی

قارئین کرام نے اسکی بہت پذیرائی کی اور اس سال اسکا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔
عزاداریٔ امام حسینؑ کو خرافات اور جھوٹ سے پاک کرنے کی خواہش رکھنے والے طالبانِ حق اور اہل دانش و عقل نے اسکے بعد کتاب کی تیسری جلد کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کرنا شروع کر دیا‘ گرچہ ہم اسکی توقع نہیں کر رہے تھے۔ لوگوں کے اس استقبال نے ہمارا حوصلہ بھی بلند کیا۔ چنانچہ ہم نے جلد از جلد تیسری جلد کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا تہیّہ کیا۔ اس سلسلے میں اپنے عزیز بھتیجے سید محمد سعید موسوی کو ترجمہ کیلئے زحمت دی اور مشفق و مہربان محترم بزرگ سید رسالت حسین کوثر صاحب سے اسکی تصحیح کرنے کی درخواست کی۔ ماشاء اللہ ان دونوں حضرات کی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجہ میں یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

ہماری خوشی کا باعث یہ بات نہیں ہے کہ کتاب کا ترجمہ ہمارے عزیز کے ہاتھوں ہوا ہے‘ بلکہ خوشی ہمیں اس بات کی ہے کہ ہمارے حوزوں میں مصروف تعلیم طلباء‘ کہ جو عزاداریٔ امام حسینؑ میں شامل خرافات سے متعلق قلم وزبان سے کچھ لکھنے یا بولنے کو اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں‘ الحمد للہ موصوف نے اس عمومی رجحان کے برخلاف‘ یہاں قیام کے دوران شب و روز کی ان تھک محنت سے اس کتاب کا ترجمہ مکمل کیا۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو اس راہ پر گامزن رکھے اور انکی توفیقات میں اضافہ فرمائے تاکہ وہ اپنے قلم وزبان سے مقصد حسینی کے فروغ کیلئے بہتر سے بہتر انداز میں کوشاں رہیں۔ رب کریم و غفور سے دعا ہے کہ وہ انہیں ہدایت سے نزدیک فرمائے اور گمراہی سے دور رکھے۔ (آمین)
دار الثقافۃ الاسلامیۃ ان کی اس کاوش کو اس لئے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ

اسطرح انہوں نے اس ادارہ کے امام حسینؑ سے کئے ہوئے معاہدے کو آگے بڑھانے میں معاونت کی ہے۔

خدا سے ہماری دعا ہے کہ اس چراغ کو مزید توانائی عطا فرمائے تاکہ اس کی روشنی پھیلے اور پھر یہ روشنی آسمان حسینی پر چھائے خرافات کے بادلوں کو جلا ڈالے۔ دار الثقافۃ الاسلامیۃ کی امام حسینؑ سے متعلق پیش کی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب اپنی جگہ ایک نسخہ شاخص ہے اور ممتاز ترین مقام رکھتی ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب دوسری کتابوں کو بھی جلا بخشے گی۔

شہید مطہریؒ نے جہاں مراسم عزاداریٔ امام حسینؑ سے متعلق انتہائی جرأت وشہامت وبے باکی کا مظاہرہ کیا ہے وہاں دیگر خرافات وموہومات کے خلاف بھی نہایت جرأت آمیز رویہ اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً آپ نے مراجع عظام کے بارے میں فرمایا کہ ان کے عظمت وکمال کا معترف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی آراء کو مقدس قرار دے کر اختلاف رائے سے گریز کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے مکتب کو جو افتخار حاصل ہے' وہ باب اجتہاد کے کھلا رہنے کے سبب ہے۔ اس افتخار کو دوام بخشنے کیلئے اختلاف نظر کا ہونا ضروری ہے۔ ہمیں آپکی اس فکر اور آپ کے ان اقوال زرین سے مکمل اتفاق ہے۔ اسی اصول کے تحت ممکن ہے کہ ہم بھی اس کتاب میں موجود بعض نظریات سے شاید اتفاق نہ کریں۔ ہمارے اس جملہ کا اطلاق ہر اس کتاب پر ہوتا ہے جسے ہم زیور طباعت سے آراستہ کرنے کیلئے منتخب کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی کتاب میں موجود تمام کلمات الف سے ی تک مثلِ وحیٔ مطلق یا ناقابل اعتراض نہیں ہوتے ہیں۔

والسلام

علی شرف الدین موسوی کراچی

عید سعید فطر ۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

کتاب حاضر "حماسہ حسینی" کی تیسری جلد ہے' جو استاد شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کے اس بارے میں تحریروں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی پہلی دو جلدیں اس شہید بزرگوار کی حادثہ کربلا سے متعلق تقاریر پر مشتمل تھیں جن کا لوگوں نے شایان شان استقبال کیا۔ اس جلد کے مطالب کے بارے میں کچھ ضروری توضیحات درج ذیل ہیں :۔

۱۔ یہ کتاب ایسے مطالب پر مشتمل ہے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ استاد شہید نے لکھے تھے۔ ان مطالب کے لکھنے کا مقصد' قابل توجہ مفاہیم کی یادداشت تھی۔ یہ مطالب دراصل بعد میں مراجعہ کرنے کیلئے یا تقریر سے پہلے تیاری کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ اس کتاب کے مفاہیم اجمال اور تفصیل کے لحاظ سے متفاوت اور مختلف ہیں ان میں سے بعض مطالب ایک مکمل مقالہ کی صورت ہیں' بعض چند سطور سے زیادہ نہیں جبکہ بعض مطالب کی طرف شہیدؒ صرف اشارہ کر کے گزر گئے ہیں۔

۲۔ کتاب حاضر دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پانچ کے موضوعات جدید ہیں جبکہ بقیہ پانچ ابواب کے موضوعات اُنہی تقریروں کے موضوعات ہیں جو جلد اول اور دوم میں چھاپے جاچکے ہیں۔ البتہ یہ پانچ

ابواب کہ جو جلد اول اور دوم سے مشترک ہیں' ان کے مطالب میں ایک فرق ضرور ہے۔ پہلی دو جلدوں میں پیش کئے گئے یہ موضوعات شہیدؒ کی تقاریر پر مشتمل تھے جبکہ اس تیسری جلد کے موضوعات خود ان کے نوشتہ اور یادداشت ہیں اسکے علاوہ مفاہیم میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دونوں ہی ایک دوسرے کو کامل بناتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہوتی اگر تھوڑے سے مشترک مطالب کی وجہ سے ان کو چھاپنے سے صرف نظر کیا جاتا' خصوصاً جبکہ یہ نوشتے یہ بیان کرتے ہیں کہ استاد شہید تقریر کرنے سے پہلے یہ کام انجام دیتے تھے۔ لہٰذا یہ ان کے حقیقی نظریات ہیں جو تمام خطیبوں اور ذاکروں کے لئے سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ وہ پانچ ابواب جن کے موضوعات نئے ہیں' ان کے پہلے باب سے متعلق کچھ قابل ذکر باتیں ہیں۔ وہ یہ کہ اس باب میں سرخیاں مضمون مرتب کرنے والے کی اختراع ہیں جو اس باب کے گوناگون مطالب پر مشتمل ہیں۔ درحقیقت یہ باب نہضت حسینی سے متعلق ایک زبردست بحث ہے۔ گو اسی کا عنوان باب کے تمام مطالب کو جذب نہیں کرتے لیکن اس کے اعظم اور مہمترین مفاہیم کو ضرور بیان کرتے ہیں۔

امید ہے کہ "حماسۂ حسینی" کا یہ مجموعہ حادثۂ کربلا کی بہتر اور بیشتر شناخت کرنے اور اس مقدس نہضت کے اہداف کی راہ میں عمل کرنے میں مؤثر اور مفید واقع ہوگا۔ خداوند متعال سے دعا ہے کہ استاد شہید کے آثار' خصوصاً اس گرانقدر مفکر کے ابھی تک غیر نشر شدہ آثار کی تدوین و نشر کی توفیق عنایت فرمائے۔

۶۵/۶/۱۵

شورئ نظارت بر نشر آثار استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ

پہلا باب

حادثۂ کربلا کی تاریخی بنیاد

کس طرح پیغمبر اکرمؐ کی امت نے پیغمبر اکرمؐ کے فرزند کو شہید کیا؟

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا حادثہ نہ فقط دردناک اور نہ صرف عظیم اور بے نظیر فداکاری کا مظہر ہے بلکہ یہ روحی توجیہ اور علل کے نقطۂ نظر سے بھی ایک بڑا عجیب و غریب حادثہ ہے۔

یہ قضیہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے پچاس سال بعد مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کے پیروؤں کے ہاتھوں سرزد ہو۔ یہ واقعہ ان لوگوں کے ہاتھوں سرزد ہوا جو تشیع اور آل علیؑ کی دوستی کے نام سے معروف تھے۔ اور واقعاً یہ لوگ آل علیؑ سے تعلق رکھتے بھی تھے۔ انہوں نے امامؑ کے خلاف ان لوگوں کے پرچم تلے جنگ کی جو پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے تین چار سال قبل تک آپؐ کے ساتھ جنگ کرتے رہے اور بعد میں جب دوسرے لوگ مسلمان ہو گئے تو یہ لوگ بھی مجبوراً اور ظاہراً مسلمان ہو گئے۔ (بقول عمار یاسر: "استسلموا ولم یسلموا". "ان لوگوں نے اظہار اسلام کیا لیکن اسلام قبول نہیں کیا تھا"۔ ابو سفیان نے تقریباً بیس سال تک پیغمبر اکرمؐ سے جنگ کی۔ اس بیس سال کے آخری پانچ چھ سالوں میں اسلام کے خلاف جو تحریکیں چل رہی تھیں، ابو سفیان اس کا بڑا قائد بن گیا تھا، اور اس کی پارٹی والے یعنی بنی امیہ پیغمبر اکرمؐ کے سخت دشمن تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے

دس سال بعد معاویہ جو ہمیشہ اسلام کے خلاف جنگ کرنے میں اپنے باپ کے دوش بدوش رہا تھا' شام اور سوریہ کا والی ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے تیس سال بعد یہ خلیفہ اور امیر المومنین بن بیٹھا! پیغمبرِ خداؐ کی وفات کے پچاس سال بعد اس کا بیٹا یزید خلیفہ بن گیا۔ اور اس نے دلخراش وضع کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے فرزند گرامی کو ان مسلمانوں کے ہاتھوں شہید کروایا جو شہادتین پڑھتے تھے' نماز پڑھتے تھے' حج انجام دیتے تھے' اسلامی قوانین کے تحت شادیاں کرتے تھے اور اسلام کے آئین کے مطابق اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔ یہ لوگ اسلام کے منکر نہیں ہوئے تھے (اگر اسلام کے منکر ہو چکے ہوتے تو پھر یہ معمانہ رہ گیا ہوتا)۔ یہ لوگ نہ تو امام حسینؑ کی حرمت کے منکر تھے اور نہ ہی اس بات کے معتقد تھے کہ نعوذ باللہ امام حسینؑ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان کا عقیدہ قطعی طور پر یہ تھا کہ امام حسینؑ یزید سے افضل ہیں۔

اب یہ کیسے ہوا کہ ایک تو ابوسفیان کے گروہ نے زمامِ حکومت کو اپنی گرفت میں لے لیا اور دوسرے یہ کہ مسلمان بلکہ شیعہ امام حسینؑ کے قاتل ہو گئے' در حالیکہ وہ انؑ کو مستحق قتل نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی نظر میں آپؑ کے خون کا احترام باقی سب لوگوں کے خون سے زیادہ تھا۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ ابوسفیان کے گروہ نے کس طرح زمامِ حکومت اپنی گرفت میں لی' اس کی وجہ یہ بات بنی کہ بنی امیہ میں سے ایک فرد جو مسلمانوں کے درمیان بدنام بھی نہ تھا اور ابتدائی مسلمانوں میں سے بھی تھا' خلافت پر فائز ہوا۔ اس سے بنی امیہ کے افراد کو حکومت اسلامی میں پیر رکھنے کی جگہ ملی۔ اس نے اس خوبی سے اپنے آپ کو داخل کیا کہ خلافت اسلامی کو اپنی ملکیت کہنے لگا۔ (مروان نے انقلابیوں سے اسی طرح کہا تھا)۔ اگرچہ ان کو

حکومت اسلامی میں داخل ہونے کا موقعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حاصل ہوا تھا جب معاویہ شام اور سوریہ کے زرخیز زمین کا والی بنا۔ خصوصاً اس معما کو نظر میں رکھیں کہ حضرت عمرؓ بہ استثناءِ معاویہ' اپنے تمام حکام کو نصب اور عزل کیا کرتے تھے' ان میں تغیر و تبدل لاتے رہتے تھے لیکن جب معاویہ کی باری آتی تو یہ حکم لغو ہو جاتا تھا اور اس کو انہوں نے کبھی بھی معزول نہیں کیا۔

یہی اموی حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں فساد پھیلانے کا سبب بنے۔ لوگوں نے اُن کے خلاف انقلاب برپا کیا اور اُن کو قتل کر دیا۔ معاویہ ہمیشہ خلافت کے خیال کو اپنے دماغ میں پرورش کر تا رہا تھا۔ اُس نے حضرت عثمانؓ کے قتل سے اپنی تبلیغات کے لئے خوب استفادہ کیا اور عثمانؓ کو خلیفۂ مظلوم' خلیفۂ شہید کا نام بھی دے دیا۔ حضرت عثمانؓ کی خون آلود قمیص کو بلند کیا اور خلیفہ پیغمبرؐ کی مظلومیت کے نعرے کو تقویت بخشی۔ لوگوں سے کہا: عثمانؓ کے قاتلوں کے سربراہ علیؑ ہیں جنہوں نے عثمانؓ کے بعد خلیفہ بن کر انقلابیوں کو پناہ بھی دے دی۔ اس طرح اس نے لوگوں کو کیسے کیسے انداز میں نہیں رُلایا! شام کے لوگ یعنی عرب کا ایک قبیلہ جس نے فتح اسلام کے بعد شام میں سکونت اختیار کر لی تھی' سب ایک دل اور یک زبان ہو کر بولے کہ خلیفۂ مظلوم کے خون کے انتقام کے لئے ہم اپنے خون کے آخری قطرے تک لڑنے کے لئے حاضر ہیں' آپ جو بھی حکم دیں' ہم اطاعت کریں گے۔ اس طرح معاویہ نے اسلام کی قوت کو خود اسلام کے خلاف تیار کیا۔

صدر اسلام کے پیچیدہ واقعات

یہ کیونکر ہوا کہ پیغمبرؐ کی امت نے فرزند پیغمبرؐ کو شہید کرنے کیلئے قدم اٹھائے ؟

تاریخ میں بعض ایسے بے نظیر اور حیرت انگیز حوادث رونما ہوئے ہیں کہ جن کے اسباب وعلل کی توجیہ کرتے وقت، ممکن ہے بعض اشکال سے دوچار ہونا پڑے۔

ان حوادث میں سے ایک اسلام کی بہت جلد پیشرفت اور لوگوں کو اپنے اندر جذب کرنے کا موضوع ہے۔ لیظھرہ علی الدین کله. انہی حوادث میں سے ایک حادثہ اور حرکت قیامِ اباعبداللہ الحسینؑ ہے۔

امام حسینؑ کو قریب وبعید، رشتہ دار اور بیگانہ، سب منع کرتے تھے، اور اس منع کرنے کا سبب کوفہ والوں کی بے وفائی اور غداری تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ امامؑ ان کی منطق کو رد نہیں کرتے تھے۔ لیکن آپؑ کے جوابی کلمات، خصوصاً مکہ و کربلا میں اور راستے میں دیئے گئے خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ بھی ایک منطق رکھتے تھے جو ان لوگوں کی محدود منطق سے کہیں زیادہ وسیع تھی۔ ان لوگوں کی منطق آپکی جان اور فرزندوں کی سلامتی کے گرد گھوم رہی تھی لیکن امامؑ کی منطق دین وایمان اور عقیدہ کی حفاظت تھی۔ امامؑ نے مروان کے نصیحت کی جواب میں فرمایا:

”وعلی الاسلام السلام اِذقد بلیت الامة براع مثل یزید“

”جب امت یزید جیسے کی بیعت میں مبتلا ہو تو اسلام پر میر اسلام ہو“۔

معاویہ اور یزید کا خلیفہ بننا اور ان کا قوت ونیر وئے اسلام کو علی بن ابی طالبؑ اور حسین بن علیؑ کے خلاف تیار کرنا، حالانکہ لوگ دین سے بیزار نہیں تھے، صدر

اسلام کے پیچیدہ حوادث میں سے ایک حادثہ ہے۔

یہاں پر ہمیں دو مطالب کو مورد بحث قرار دینا چاہیئے تاکہ قیام حسینی کی ماہیت' ہدف اور علت واضح ہو جائے۔ پہلی بحث یہ کہ امویوں (جن کا سربراہ ابو سفیان تھا) کا اسلام اور قرآن سے شدید مبارزہ کرنے کی علت کیا تھی؟

دوسری بحث یہ کہ بنوامیہ حکومت اسلامی کو اپنے گرفت میں لینے میں کامیاب ہوئے' اس کے اسباب اور علل کیا تھے؟

پہلا مطلب: دو وجوہات تھیں کہ بنوامیہ' اسلام اور قرآن سے شدید مبارزہ کر رہے تھے۔ پہلی علت نژادی اور نسلی رقابت تھی جو تین نسلوں سے سلسلہ وار چلی آرہی تھی۔ دوسری علت اسلامی قوانین کا رؤسائے قریش خصوصاً بنوامیہ کی اجتماعی نظام زندگی سے کلی طور پر فرق اور ان کی طرز زندگی کو برہم کرنیوالا تھا اور قرآن اس کو ایک قانون کلی سمجھتا تھا۔ سورۂ سبا (آیت ۳۴) میں خداوند عالم فرماتا ہے: وما ارسلنا فی قریة من نذیر الاقال مترفوهاانالما ارسلتم به کافرون "اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے بڑے لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہم تمہارے پیغام کا انکار کرنے والے ہیں"۔ اس کے علاوہ سورۂ زُخرف' واقعہ' مؤمنون اور سورہ ھود میں بھی یہی مطلب ہے۔ ان سب کو چھوڑ کر ہم بنوامیہ کی سرشت کا اگر مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مزاج اور طینت منفعت طلب اور مادہ پرست تھا۔ اس طرح کے مزاج والے انسانوں کی روح پر تعلیمات الٰہی وربّانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اسکا ان کے باہوش ہونے یا بیہوش ہونے سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ تعلیمات الٰہی کے وہی لوگ معتقد ہوسکتے ہیں جن میں شرافت'

بزرگواری اور علوِ نفس کی کرن موجود ہو، جن کے خمیر میں نور، ہدایت اور حیات موجود ہو۔ لتنذر من کان حیاً. انما تنذر من اتبع الذکر . و ننزل من القرآن ماھو شفاء و رحمۃ للمئومنین .لیمیز اللہ الخبیث من الطیب. یہ مفاہیم خود ایک بہت بڑا قانون حیات ہیں۔ ابوسفیان اور عباس کا قصہ اور یہ کہنا ولقد صار ملك ابن اخیك عظیماً اور یہ قصہ بھی باللہ غلبتك یا اباسفیان!(میں اللہ کی وجہ سے تم پر غالب ہو گیا ہوں) اور یہ قصہ : تلقفو ھا تلقف الکرۃ یہ سب ابوسفیان کی کورباطنی کی دلیل ہے۔

لیکن یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اموی گروہ اسلام کے دور میں آخر کس طرح سے ایک فعال اور سربراہ گروہ بن کر سامنے آیا اور کیسے حکومت اسلامی پر مسلط ہو گیا؟

یہاں پر یہ بتاتے چلیں کہ ایک نوبنیاد اور نو ساز جامعہ میں اتحاد و ہمنوائی نہیں ہو سکتی، گرچہ اسباب وحدت کتنے ہی قوی کیوں نہوں ۔۱۔ نوبنیاد اور نو ساز جامعہ اسلامی بھی اگرچہ توحید اور لا الہ الا اللہ کے پرچم تلے ایک نیرو اور قوتِ واحدہ بن چکا تھا، اسلام نے رنگی اور قبائلی اختلافات کو معجزے کی صورت میں ختم کر دیا

۱۔ آیا ہم یہاں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ عجلت نہ کرتے تو بہتر ہوتا اور فتوحات میں نہ لگ جاتے، صبر کرتے تو طبیعی طور پر اسلام دیواروں کو چیر کر نفوذ کر لیتا؟ اس عجلت کا نتیجہ یہی شگافات اور اختلافات ہیں جو ابھی تک موجود ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی کوئی وصیت نہیں کی تھی کہ میرے بعد فتوحات کرنا در آنحالیکہ آپؐ نے کئی نوع کی وصیتیں کیں۔ فتوحات کا ذائقہ شیرین تو ہے لیکن معلوم نہیں کہ عقلاً صائب ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کہ حضرت علیؑ اگر خلیفہ بن جاتے تو آیا آپؑ ان فتوحات کی تصویب کرتے؟ جیسا کہ حکومت پر فائز ہونے کے بعد آپؑ داخلی اصلاح میں لگ گئے۔ اسکے علاوہ یہی فتوحات عربوں کے اخلاق میں فساد پیدا کرنے کا سبب ہوئے۔ پس یہ عجلت ایک طرف مختلف اقوام کا مخلوط جامعہ وجود میں لائی اور دوسری طرف اس نے عرب قوم کے جامعہ پر اثرانداز ہو کر اسے فاسد بنا دیا۔

تھا، لیکن اس کے باوجود یہ ایک طبیعی بات ہے کہ مختلف لوگ جو مختلف نسلوں، مختلف عناصر اور طرح طرح کے طبیعت، عادات، آداب اور عقائد میں پرورش پائے ہوئے ہوں، دینی مسائل کے قبول کرنے اور تربیت دینی کو اپنے اندر جگہ دینے میں، سب یکساں نہیں ہوتے۔ ایک کا ایمان قوی ہوتا ہے تو ایک کا ایمان ضعیف، اور ایک باطنی طور پر شک و کفر والحاد میں بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اساس اسلامی پر قائم جمعیت میں سالوں بلکہ صدیوں میں بھی، سب کو ایک معین حکومت کے تحت قرار دینا آسان کام نہیں ہے [1]۔

خود قرآن نے منافقین کے وجود کو مفت خور (parasite) کا نام دیا ہے۔ یہ کہتے تھے: غرھؤلاء دینھم (ان کے دین نے ان کو دھوکا دیا) اور یہ بھی کہتے تھے انؤمن کما آمن السفھاء (کیا ہم ایمان لائیں جس طرح احمق لوگ ایمان لائے) قرآن کریم نے منافقین کے بارے میں خبروں کا بہت زیادہ اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو ایک مہم خطرے سے دور رکھنا چاہتا ہے [2]۔ عبداللہ بن سلول مدینہ کے منافقوں کا سب سے بڑا سردار تھا۔ قرآن کریم اس کو مولفۃ قلوبھم کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو چارو ناچار اجتماع اسلامی میں داخل ہوئے ہیں، قرآن اس طرح کے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ ان پر نگاہ رکھنی چاہئے اور مسلمانوں کے عمومی احوال یعنی زکوۃ اور صدقات میں سے کچھ ان لوگوں کو بھی دینا چاہئے تاکہ ان میں ایمان تدریجاً قوت پکڑلے، کم از کم آئندہ آنے والی نسلوں میں اسلام واقعی پیدا ہو جائے لیکن ان لوگوں کو حساس اور مہم کاموں میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔

---

[1]۔ اس بارے میں گوستاولون کی کتاب ''تطور عقاید ملل'' کی طرف رجوع کریں۔ وہ روحیہ کے تغیر کو بہت زیادہ تدریجی اور ست جانتے ہیں۔

[2]۔ قرآن کریم شجاعتوں میں سے ایک مخالفین یعنی کفار و منافقین کی منطق کو منعکس کرتا ہے اور یہ بہت زیادہ ہی ذکر ہوا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اپنے خلق کریم سے کسی کو بھی محروم نہیں رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ منافقین اور مئولفة قلوبھم کو بھی اپنے اس خُلق سے نوازتے تھے۔ لیکن محتاط روش کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جب تک پیغمبر اکرمؐ زندہ رہے بنی امیہ کے ضعیف الایمان، مؤلفة قلوبھم یا منافق کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ لیکن افسوس کہ پیغمبرؐ کے بعد یہ لوگ بتدریج حساس عہدوں پر فائز ہو گئے خصوصاً حضرت عثمانؓ کے دور میں، مروان اور اس کا باپ جن کو رسول اللہؐ نے شہر بدر کیا تھا، مدینہ واپس لائے گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے کے دونوں خلفاء نے حضرت عثمانؓ کی ان لوگوں کی مدینہ واپسی کیلئے سفارش قبول نہ کی تھی۔ اور یہی مروان اصل فتنوں اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا سبب بنا۔

بنی امیہ حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت میں عمالِ بیت المال اور دیگر بڑے بڑے مناصب پر فائز ہو گئے۔ انھوں نے دو عوامل یعنی خزانہ اور سیاست کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، فقط ایک قوی اور قدرتمند عامل یعنی دیانت کی کسر باقی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد معاویہ نے ایک عجیب زبردستی اور عیاری کے ذریعے اس کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس طرح سے اس کو بھی اپنا خادم بنالیا۔ یہاں سے پھر وہ اس فوج کو بھی جو دین کے نام پر تھی اور اس دین کی قوت تھی، علی بن ابی طالبؑ جیسی شخصیت کے خلاف تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد معاویہ نے اپنے دور خلافت میں ابو ہریرہ جیسے روحانیوں کو اجیر بنا کر عامل دیانت کے علاوہ عامل روحانیت کو بھی کلی طور پر اپنا زیردست بنالیا۔ اس طرح چاروں عوامل اس کے ہاتھ آگئے یعنی عامل سیاست اور سیاسی عہدے، عامل ثروت، عامل دیانت اور عامل روحانیت۔ عثمانؓ کے دور خلافت میں بنی امیہ کے ہاتھوں جو بیت المال کا خُرد بُرد ہوا اور جس طرح سے مناصب اور عہدے ایک کے بعد دوسرے ہاتھ میں سونپے گئے، یہ باتیں عام

لوگوں کی ناراضگی کا سبب بنیں۔ اس میں اہل دنیا اور اہل دین میں کوئی فرق نہ تھا' دونوں گروہ ان لوگوں کے ان کاموں سے ناراض تھے۔

اہل دنیا اپنی دنیا کی وجہ سے پریشان تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کے دشمن کھائیں اور خود وہ تکتے رہیں۔

اہل دین بھی پریشان تھے کیونکہ اسلام کے اجتماعی اصول معاشرے سے رخصت ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً عمرو عاص اور زبیر بھی مخالف تھے اور ابوذر و عمار بھی مخالف تھے۔ عمرو عاص نے کہا: میں نے کوئی چرواہا بھی نہیں چھوڑا کہ جسے قتل عثمانؓ پر نہ اُبھارا ہو۔ جب قتل عثمانؓ کی خبر ملی تو کہا: انا ابو عبد الله ماحككت قرحة الا ادميتها۔ (میں ابو عبد اللہ ہوں' کسی بھی زخم پر میں نے ہاتھ نہیں رکھا مگر جس سے خون نہ نکلا ہو)۔ یعنی جس زخم کو بھی چھوا' اس سے خون نکال کر ہی رہا۔ امام علیؑ نے جنگ جمل میں زبیر سے فرمایا۔ لعن الله اولا نا بقتل عثمان (خدا لعنت کرے اُس پر جو ہمیں قتل عثمانؓ میں ملوث کرے)۔

حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ سے وہی سلوک اختیار کیا جو آپ کا دوسرے خلفاء کے ساتھ رہا۔ آپؑ نے اپنی عمومی خیر خواہی اور نصیحت سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ جس وقت حضرت عثمانؓ محصور تھے' آپؑ نے اُن کو صحیح راستہ بھی دکھلایا اور آپؑ انہیں کھانا پینا بھی پہنچا دیا کرتے تھے۔ دوسری طرف معاویہ اپنی بہت بڑی طاقت کے ساتھ شام میں تھا۔ وہ اس فتنہ' اس کے مقدمات اور اس کے نتائج سے بخوبی آگاہ تھا اور حضرت عثمانؓ نے بھی اس سے مدد مانگی تھی۔ وہ انقلابیوں کو نیست و نابود بھی کر سکتا تھا[۱]۔ لیکن اس نے سوچا کہ عثمانؓ کے زندہ رہنے سے زیادہ وہ اُن

---

[۱] نہج البلاغہ کے نامہ نمبر ۳۷ میں فرماتے ہیں "فاما اكثارك الحجاج فی عثمان وقتله فانك انما نصرت عثمان حيثُ كان النصر لك وخذلته حيث كان النصرله"۔ "تمہارا عثمانؓ اور ان کے قاتلوں کے بارے میں زیادہ جھگڑنے کا مختصر جواب یہ ہے کہ تم نے عثمانؓ کی مدد اس وقت کی ہے جب مدد میں خود تمہارا فائدہ تھا اور اس وقت لاوارث چھوڑ دیا جب مدد میں ان کا فائدہ تھا"۔ ان جملوں میں معاویہ کی سیاست خوب منکشف ہوئی ہے۔

کے مرنے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر پہنچنے تک تو وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب یہ خبر پہنچی تو اُس وقت اس نے واعثماناہ کی فریاد بلند کی، عثمان کے پیراہن کو علم بنایا، منبر پر جا کر خود بھی رویا، لوگوں کو بھی رُلایا اور قرآن کریم کی اس آیت کو شعار بنایا:

"ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیه سلطانا"۔

"جو مظلوم قتل ہوتا ہے، ہم اس کے ولی کو بدلہ کا اختیار دے دیتے ہیں"۔ (سورۂ اسراء ۳۳)

لاکھوں افراد نے خلیفۂ مظلوم کے خون کا انتقام لینے کے لئے اس کی دعوت قبول کی۔

اس طرح سے اس نے عامل دیانت کا بھی عامل ثروت اور منصب کے ساتھ اضافہ کر لیا[۱] اور کشور اسلامی کی اہم جگہوں سے تمام قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

معاویہ کے قدرتِ خلافت اور روحانیتِ اسلامی پر تسلط حاصل کرنے کے راز میں چند چیزوں کا دخل تھا:

(۱) خود معاویہ کی ہوشیاری اور زیرکی

(۲) خلفاء کی بُری سیاست اور تدابیر، جس نے ان لوگوں کو راہ دی۔

---

[۱] دوسرے الفاظ میں دیانت کے قدر کی افزائش بھی سیاست اور ثروت کی قدرت پر کی اور لوگوں کو یعنی علیؑ کے پیروان کو مادّی لحاظ سے بھی فشار میں رکھا اور معنوی لحاظ سے بھی۔ خطرناک ترین موقع وہ ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں قدرتیں یعنی مادّی اور معنوی قدرت، ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دیتی رہیں اور اس سے ان کا مقصد کسی ملت کے سر پر سوار رہنا ہو۔ البتہ دیانت خود اپنی جگہ ہمیشہ مظلوم کا دفاع کرتی ہے۔ خدا امان میں رکھے اس وقت سے کہ جب لوگوں کی جہالت اور اولیاء کی خیانت کی وجہ سے، یعنی عابدوں کی جہالت اور جسور لوگوں کی خیانت سے، دین سیاست کا آلۂ کار بن جائے۔ اللہ کی پناہ اس وقت سے جب دین، سیاست کا آلۂ کار بن جائے۔

(۳) لوگوں کی جہالت، نادانی اور سادہ لوحی ۱۰

معاویہ اور بنی امیہ نے اسلام کے اصولوں میں سے دو کو محو کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ ایک نسلی امتیاز کی روا رکھ کر عرب کو عجم پر ترجیح دی اور دوسرا طبقاتی فرق کی ایجاد عمل میں لائے جس سے بعض مثلاً عبد الرحمٰن بن عوف اور زبیر جیسے، لاکھوں کی دولت کے مالک بن گئے اور بعض فقیر اور تہی دست ہو گئے۔ حضرت علیؑ بلاوجہ نہیں فرماتے :

"....ان لا یقار وا علی کِظَّة ظالم ولا سغب مظلوم"۔

"ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے مت بیٹھے رہو"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳)

یا آپؑ کا یہ فرمان کہ :

"الا وان بلیتکم قد عادت کھیئتھا یوم بعث اللہ نبیّہُ"۔

"تمہیں جاننا چاہئے کہ تمہارے لئے وہی بلائیں پھر پلٹ آئی ہیں، جو رسولؐ اللہ کی بعثت کے وقت تھیں"۔

بے معنی نہ تھا۔

۱۰۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ خلیفہ یعنی ولی امر کے انتخاب کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ بالفرض ہم قبول بھی کر لیں کہ حکومت اسلامی انتخاب سے ہے نہ کہ انتصاب (نصب کرنا) سے جیسا کہ ان دنوں بلکہ سالوں اور صدیوں سے ہوتا رہا ہے، تب بھی۔ دنیا میں جہاں لوگ آزادی کی لیاقت نہ رکھتے ہوں اور حاکم کے تعین میں کوئی دخل نہ رکھتے ہوں، وہاں ان کو آزادی نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کس نے ان کی یہ آزادی چھین رکھی ہے؟ خود وہ لوگ کہ جو ان کے انتخاب سے ڈرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو آزادی نہیں ملنی چاہئے، یہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ مقام نبوت یہ کام کر سکتا ہے۔ غرض یہ کہ اس وقت کے لوگوں کی جہالت اور عدم صلاحیت کے سبب، بنو امیہ نے اپنی زیرکی اور ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا۔
حضرت علیؑ عدالت کا مجسمہ بھی تھے اور ہوشیاری اور پیش بینی کا مجسمہ بھی۔ بنو امیہ کا فتنہ کہ جو پس پردہ تھا اور اسلامی روپ دھارے ہوا تھا، حضرت علیؑ نے اس کی کلی طور پر پیش بینی کر دی تھی اور لوگوں کو اس سے آگاہ کر دیا تھا، لیکن ان کے کلمات کا ادراک کرنے والا کوئی وجود نہ رکھتا تھا۔

حضرت علیؑ کی اجتماعی قوت اور معاویہ کا دستور مبارزہ

حضرت علیؑ کے اس دنیا سے جانے کے بعد معاویہ خلیفہ بن گیا۔ لیکن معاویہ کی توقع کے بر خلاف حضرت علیؑ کی قوت و طاقت باقی رہ گئی۔ معاویہ کے بیہودہ الفاظ اور متجاوز طور طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ سے بہت زیادہ بیچین تھا۔ لہٰذا اس نے علیؑ کے خلاف تبلیغ کا ستون قائم کیا اور حکم جاری کیا کہ منبروں سے اور خطبوں میں حضرت علیؑ کو سب و لعن کیا جائے۔ اس نے حضرت علیؑ کے قریبی دوستوں کو بے دریغ شہید کیا۔ یہ بھی حکم دیا ہوا تھا کہ جس کسی پر علی کی دوستداری کا گمان ہی کیوں نہو' اسے قتل کر دیا جائے تاکہ حضرت علیؑ کے فضائل کو منتشر ہونے سے روکا جاسکے۔ رقم دیکر حضرت علیؑ کے خلاف اور بنی امیہ کے حق میں احادیث جعل کی گئیں۔ حضرت علیؑ کی فکر کہ جو لوگوں کے دلوں اور سینوں میں جاگزیں تھی' یہ تینوں کام' اس فکر کے خلاف جنگ کرنے کیلئے کئے گئے تھے۔ اسی لئے حجر بن عدی اور عمرو بن حَمِق کو قتل کیا گیا اور اسی لئے کوفہ میں عبید اللہ کو حکم دیا کہ میثم تمار اور رُشید کو شہید کر دے۔ نتیجتاً تشیع کے نام سے موسوم ایک غیر منظّم قوت ہمیشہ حکومتِ بنی امیہ کی مخالفت کرتی رہی۔

بنی امیہ حکومت پر کیسے پہنچے' اس پر ہماری تحقیق صرف تعجب آمیز جہت پر تمام نہیں ہوتی۔ یہ ایک سطحی بات نہیں ہے جو تیرہ صدی پہلے پیش آئی اور ختم ہو گئی بلکہ یہ اسلام کے لئے ایک خطرہ تھا' جو اس وقت اسلام پر عارض ہوا اور خدا جانے کب تک رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی نفسانی کیفیات کی تاریخ کی جانچ پڑتال کریں تو ہمیں بنو امیہ کی تاریخ تک رسائی حاصل کرنی چاہئے۔ بنی امیہ کی فکر در پردہ اسلام کے لبادے میں فکر اسلامی سے جنگ کرتی رہی۔ اُموی فکر کا عنصر اسلامی فکر کے عنصر میں داخل ہو گیا۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ صبح و شام

بنی امیہ پر لعنت بھیجتے ہیں، ان کی فکر میں بھی فکر بنی امیہ کا ایک عنصر موجود ہوتا ہے۔ اور وہ بہ زعمِ خود یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اسلامی فکر ہے اور قطعاً ایسا ہی ہے [۱۰]۔ مثلاً مصرف زکوٰۃ و خمس، استطاعت حج، نفقۂ زوجہ اور اسی طرح دیگر امور میں چند شؤونات کی رعایت کرنا۔

حضرت علیؑ نے بنی امیہ کے تسلط کے خطرے کو بہت زیادہ اہمیت دی اور اس خطرہ کی علامت سے آگاہ کرتے رہے۔ لیکن اس طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوئے۔ خود حضرتؑ بھی فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ بعد میں متوجہ ہو گے :

"فعنده ذلك تود قريش بالدنيا وما فيهالويرونني مقاماً واحداًولو قدر جزر جزور لا قبل منهم ما اطلب منهم اليوم بعضه ولا يعطوننيه".

"وہ وقت ہو گا جب قریش (یعنی بنی امیہ) یہ آرزو کرینگے کہ کاش دنیا و مافیہا اور اس کی تمام دولت دے کر وہ مجھے ایک منزل پر دیکھ لیں چاہے صرف اتنی دیر کے لئے جتنی دیر میں ایک اونٹ نحر کیا جاتا ہے، تاکہ میں ان سے اس چیز کو قبول کر لوں جس کا ایک حصہ آج مانگنے پر بھی وہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۳۔)

بنی امیہ کے فتنوں کے بارے میں آپؑ کے فرامین میں سے چند درج ذیل ہیں :

" ان الفتن اذا اقبلت شبهت، واذا ادبرت نبهت."

" فتنے جب آتے ہیں تو لوگوں کو شبہات میں ڈال دیتے ہیں اور جب

---

[۱۰]۔ بنوامیہ تو چلے گئے لیکن افسوس کہ اموی فکر کے عناصر اور اموی اصول و قواعد باقی رہ گئے اور کچھ تغیر و تبدیل کے ساتھ ہماری زندگی کے اصول کا جزء بن گئے۔ آج بھی معاویہ کی راہ پر چلتے ہوئے لوگ عامل دیانت کو اپنا خادم بنا کر دیانت کے خلاف عامل بن جاتے ہیں۔ بنوامیہ کے اصولوں کے خلاف ایک بات بھی نہیں کرتے جس قدر آنسو عثمانؓ کے پیراہن کے تلے بہائے گئے تھے، اتنے ہی آنسو آج بھی بہائے جاتے ہیں۔

جاتے ہیں تو ہوشیار کر جاتے ہیں"۔(خطبہ نمبر ۹۳)۔

ایها الناس سیأتی علیکم زمان یکفاء الاسلام کما یکفا الاناء بمافیه.

"لوگو! عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں اسلام کو اسی طرح الٹ دیا جائے گا جس طرح سے برتن کو اس کے سامان سمیت الٹ دیا جاتا ہے"۔(خطبہ نمبر ۱۰۳)

فما احلولت لکم الدنیا فی لذتها .

"(بنی امیہ) یہ دنیا تمام لذتوں سمیت تمہیں شیریں نہیں لگے گی"۔ خطبہ نمبر ۱۰۵)

مالی اراکم اشباحاً بلا ارواح.

"آخر کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہیں بالکل بے جان پیکر کی شکل میں دیکھ رہا ہوں"۔(خطبہ نمبر ۱۰۸)

حضرت علیؑ نے چند موضوعات کی پیشین بینی فرمائی تھی :

(۱) بنی امیہ ظلم و ستم اور استحصال کریں گے اور اچھی چیزوں کو خود اپنے لئے انتخاب کریں گے۔ پھر آج کے اس عدل و انصاف اور مساوات کا نشان بھی نہیں ملے گا۔اس وقت آیت لایتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله.

"ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے"(آلعمران ۶۴)

"**لن تقدس اُمةً حتی یوخذللضعیف حقه......**"

"وہ اُمت پاکیزہ کردار نہیں ہو سکتی ہے جس میں کمزور کو آزادی کے ساتھ طاقتور سے اپنا حق لینے کا موقع نہ دیا جائے"۔(مالک اشتر کے نام خط ۵۳ نہج البلاغہ)

"لایکون انتصار احدکم منهم الا کانتصار العبد من ربه"

"ان سے تمھاری داد خواہی ایسی ہی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام اپنے آقا سے یا مرید اپنے پیر سے انصاف کا تقاضا کرے"۔ (خطبہ نمبر ۹۳)

امام علیؑ کی اس پیش بینی کی تصدیق اس وقت ہوئی کہ جب مسلم بن عقبہ نے مدینہ میں لوگوں سے یزید کے لئے عبودیت اور غلامی کی بیعت لی۔

(۲) تمہارے برگزیدہ، نیک، سمجھدار اور روشن فکر لوگوں کو مارا جائے گا اور ہر وہ سر جس میں مغز ہو اور اس مغز میں ذرا سی بھی ایمان کی روشنی موجود ہو، وہ سر تن پر باقی نہیں رہے گا۔

آپؑ نے فرمایا: **"عمت خطتها و خصت بلیتها و اصاب البلاء من ابصر فیها و اخطا البلاء من عمی عنها"**

"میری نگاہ میں سب سے خوفناک فتنہ بنی امیہ کا ہے جو خود بھی اندھا ہو گا اور دوسروں کو بھی اندھیرے میں رکھے گا۔ اس کے خطوط عام ہوں گے لیکن اس کی بلا ان خاص لوگوں کے لئے ہو گی جو اس فتنہ میں آنکھ کھولے ہوئے ہونگے، ورنہ اندھوں کے پاس سے تو وہ بآسانی گزر جائے گا"

(خطبہ نمبر ۹۳)

(۳) احکام اسلامی کا احترام عملاً ختم ہو جائے گا اور کوئی بھی ایسا حرام باقی نہیں رہے گا جو حلال نہ ہو جائے:

"والله لا یزالون حتی لایدعوا لله محرماً الا استحلوه، ولا عقداً الا حلوه، وحتی لایبقی بیت مدر ولا وبر الا دخله ظلمهم ونبا به سوء رعیهم"

"خدا کی قسم یہ یوں ہی ظلم کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ کوئی حرام نہ

بچے گا جسے حلال نہ بنالیں اور خدا کا کوئی عہد و پیمان نہ بچے گا جسے توڑ نہ دیں اور کوئی بھی مٹی کا گھر یا خیمہ باقی نہ رہے گا جس میں ان کا ظلم داخل نہ ہو جائے اور ان کا بدترین برتاؤ انھیں ترک وطن پر آمادہ نہ کر دے"۔

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۸)

عبداللہ بن حنظلہ نے کہا: ہم اس آدمی (یزید) کے پاس سے آرہے ہیں جو ینکح الامھات والا خوات یعنی اپنے ماؤں اور بہنوں سے نکاح کرتا ہے۔

(۴) اسلام تحریف کا شکار ہوگا اور اس کے احکام پلٹ دیئے جائینگے۔ غیر اسلامی عناصر لوگوں کے افکار میں بیٹھ جائیں گے:

"یکفا الاسلام کما یکفا الاناء"۔

"اسلام کو اس طرح الٹ دیا جائے گا جس طرح برتن کو اس میں سامان سمیت الٹ دیا جاتا ہے"۔ (خطبہ نمبر ۱۰۳)

"ولبس الاسلام لبس الفرو مقلوباً"

"اسلام یوں الٹ دیا جائے گا جیسے کوئی پوستین کو الٹا پہن لے"۔

(خطبہ نمبر ۱۰۸)

یہ سب کچھ علیؑ نے جیسے آئینہ میں دیکھا ہو، وقوع پذیر بھی ہوا۔

کچھ لوگ جو حد سے زیادہ حضرت علیؑ سے محبت کرتے تھے، اس کا ایک سبب آپؑ کی سیرت و عدل اور اخلاق کے علاوہ آپؑ کی یہی پیش بینی تھی کہ جو سب کچھ وقوع پذیر ہوا۔

معاویہ مر گیا مگر اموال کا خرد برد، عہدوں کا غصب کرنا کہ جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے شروع ہوا تھا، باقی رہا۔ اس کے علاوہ کچھ اور بُری سنتیں بھی باقی چھوڑ کر گیا:

(۱) حضرت علیؑ پر سب و لعن کرنا۔

(۲) حضرت علیؑ کے خلاف حدیث جعل کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرنا اور لوگوں کو اس پر اُبھارنا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہوں کہ عامل دیانت کو تو عثمانؓ کے قتل کے راستے (سُمرہ بن جندب کا قصہ اور آیہ ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضاة الله) ہاتھ میں لے ہی لیا تھا' اس کے علاوہ عامل روحانیت کو بھی علمائے سوء کے ذریعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

(۳) بے گناہوں کو بے دریغ قتل کرنا جس کی اسلام میں اس سے پہلے کوئی مثال نہیں۔ اسی طرح لوگوں کے احترام کی پامالی' ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور ان کے سروں کو نیزہ پر بلند کرنا' جیسے عمرو بن حمق خزاعی کا سر۔

(۴) لوگوں کو زہر دینا اور اس بزدلانہ کام کو عام کرنا جو مروت اور انسانیت کے خلاف ہے۔ خلفاء کے بعد دوسرے لوگ بھی اس کی پیروی کرنے لگے۔
معاویہ نے امام حسنؑ' مالک اشتر' سعد وقاص کو مسموم کیا۔ اس کے علاوہ عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید جو اُس کے بہترین مددگاروں میں سے تھا' اس کو بھی مسموم کیا۔

(۵) خلافت کو اپنے خاندان میں موروثی قرار دے دیا[۱۰] اور یزید کو' جو ہرگز لیاقت نہیں رکھتا تھا' ولی عہد بنالیا۔

(۶) نسلی امتیاز کی آگ کو ہوا دینا' عرب کو عجم پر' قریش کو غیر قریش پر فضیلت دینا۔

۱۰۔ اس طرح گروہ اموی کی دیرینہ آرزو جس کا اظہار ابوسفیان نے عثمانؓ کے گھر میں کیا تھا: یابنی اُمیه تلقفوها تلقف الکرة اما والذی یحلف به ابوسفیان مازلت ارجوها لکم ولتصبرن الی صبیانکم وراثة' حقیقت کا روپ دھار گئی خود معاویہ کو بھی اس پر یقین نہیں تھا کہ یہ آرزو پوری ہوگی۔ البتہ امامؑ حسینؑ سب سے زیادہ ان نیتوں سے آگاہ تھے اور دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ خلافت کے ساتھ گیند کی طرح کھیل رہے ہیں اور اس کو اپنے بچوں کے لئے موروثی بنا رہے ہیں۔ امام حسینؑ کا قیام گروہ بنو امیہ کے افکار کو عملی صورت دینے میں رکاوٹ بنا۔

ان تمام کاموں میں حضرت علیؑ پر لعن وسب کرنا، علیؑ کے خلاف احادیث جعل کرنا اور یزید کو ولیعہدی پر فائز کرنا، معاویہ کی بدترین تدابیر میں سے شمار ہوتے ہیں۔

یزید ایک جاہل اور کم عقل آدمی تھا۔ خلیفہ زادوں کو گذشتہ زمانے میں خلافت کے لئے تربیت دی جاتی تھی۔ اس کے لئے کچھ مدت تعلیم وتربیت دی جاتی ہے تاکہ حداقل زعامت کے لائق ہوجائیں (جس طرح عباسیوں نے کیا تھا)۔ یزید دیہات میں پلا بڑھا تھا۔ دنیا و آخرت سے بے خبر شخص تھا اور خلیفہ بننے کی قطعاً لیاقت نہیں رکھتا تھا۔

اگر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مال اور مناصب غصب ہوئے اور اگر معاویہ کے زمانہ میں حضرت علیؑ پر لعن وسب ہوئے، حدیثیں جعل ہوئیں، پیغمبر اکرمؐ سے جھوٹ کو نسبت دینا، بے گناہ لوگوں کا قتل اور مسموم کیا جانا، خلافت کو موروثی بنانا اور نسلی امتیاز وجود میں لانا معمول بن گیا تھا، تو یزید کا عہد اسلام و مسلمین کی رسوائی کا زمانہ تھا۔ دوسرے ممالک سے نمائندے آتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی جگہ پر ایک ایسے آدمی کو دیکھتے تھے جو ساری دنیا سے بے خبر ہے، ہاتھ میں شراب ہے، بغل میں ریشمی کپڑوں میں ملبوس بندر بیٹھا ہوا ہے۔ اب اسلام کی کیا آبرو اور عزت باقی رہ گئی۔ یزید، غرور، جوانی، حکومت، اور شراب میں مست تھا۔ اس صورت حال کی واضح عکاسی حضرت سید الشھداء امام حسینؑ کے اس کلام سے ہو جاتی ہے: وعلی الاسلام السلام اذقد بلیت الامة براعٍ مثل یزید .

یزید اعلانیہ فسق و فجور پھیلاتا اور کفر آمیز الفاظ استعمال کرتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یزید نے سب پردے چاک کردیئے تھے۔ ایسے موقع پر قیام کرنا لازمی ہوتا ہے۔ جب خلیفہ مسلمین اعلانیہ فسق و فجور انجام دے، کفر کو فروغ دے، تو

پھر اسلام و مسلمین کی کیا عزت اور آبرو باقی رہ جائے گی ؟

بنابر این ہمارا یہ سوال کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا' اس سوال کی طرح ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ میں کیوں قیام نہیں فرمایا' کیوں قریش والوں کے ساتھ مصالحت نہیں کی ؟ یا حضرت علیؑ کیوں پیغمبر اکرمؐ کی حمایت میں جنگ بدر ' حنین ' احد ' احزاب اور لیلۃ المبیت میں اس قدر رنج اور مصائب کے متحمل ہوئے ؟

یا یہ سوال کہ کیوں حضرت ابراہیمؑ نے تن تنہا نمرود کی عظیم قدرت کے مقابل قیام کیا ؟ یا یہ کہ کس لئے حضرت موسیٰؑ اپنے بھائی ھارون کے علاوہ کسی اور مددگار کے بغیر فرعون کے دربار میں گئے ؟ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا ؟ اس "کیوں" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ امام حسینؑ کا قیام اس وقت اچھا ہوتا کہ جب آپؑ کے پاس بھی یزید کے برابر فوج ہوتی۔ لیکن جواب یہ ہے کہ اگر امام حسینؑ کے پاس یزید کے برابر فوج ہوتی اور آپؑ ایک ایسے اجتماع کے ساتھ قیام کرتے کہ جس میں لوگ دو حصوں میں ہوتے ' دو بہت بڑی صفیں تشکیل پاتیں اور امام حسینؑ ایک صف کے آگے ہوتے تو اس وقت قیام حسینی ایک مقدس اور جاوداں قیام نہ ہوتا۔ یہ سوال "کیوں" تمام مقدس اور تاریخی قیاموں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ قیام مقدس بشری دو تشخص رکھتے ہیں :

ایک تشخص قیام کے ہدف کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ قیام انسانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کیلئے ہو ' توحید کے لئے ہو ' عدل کیلئے ' آزادی کیلئے ' ظلم و استبداد کے خاتمہ کے لئے ہو ' کسب جاہ کیلئے نہ ہو اور نہ مقام اور ثروت حاصل کرنے کیلئے ہو۔ بقول حنظلہ بادغیسی اگر کوئی قیام قوم کا بزرگ بننے کے لئے یا تعصب وطنی یا قبیلہ کے لئے یا نسب کے لئے ہو تو ایسا قیام مقدس نہیں ہو سکتا۔ دوسرا تشخص یہ ہے کہ اس طرح کا قیام بجلی کی چمک کے مانند ہوتا ہے جو انتہائی

ظلمتوں اور تاریکیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایسا شعلہ جو ظلم واستبداد 'انانیت اور دروغ گوئی کے درمیان لو دیتا ہے 'ایک ایسا ستارہ جو رات کے اندھیرے میں انسان کی نیک بختی کے آسمان پر طلوع ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی نہضت یا تحریک ہوتی ہے جس کو "عقلائے قوم!" درست نہیں گردانتے۔

نہضت حسینی کے افتخارات میں سے ایک یہی ہے کہ عقلائے قوم! اس کو درست نہیں سمجھتے تھے کیونکہ یہ عقلاء کے سطح نظر سے بلند تھا' نہ یہ کہ ان کی نظروں سے دور تھا۔ عرفاء نے اس کے عرفانی پہلو کو اور اسکے بالائے عقل زاویہ کو نظر میں لے کر اسے مکتب عشق کا نام دیا ہے۔ ہمارے مرثیہ گو شعراء کی منطق بھی یہی ہے۔ اسکے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس کو معنوی پہلو دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ عشق الٰہی کا مکتب ہے۔ حضرت علیؑ کا بھی فرمان ہے: مناخ رکاب و مصارع عشاق۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عشق اور سلوک میدان کربلا جیسی نمائش گاہ میں کیوں ظہور پذیر ہوا؟ خداوند عالم کے لئے یا' اس معشوق کے لئے تو اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہاں! خداوند عالم کی رضایت دین کی راہ میں فداکاری' سعادت بشر اور عدالت کے قیام کے لئے فداکاری میں ہے کہ جو پیغمبروںؑ کا مقصد اور ہدف بھی تھا۔ ہمارے عرفاء حضرات اگر سچے عاشق ہیں تو کیوں فقط مجلس سماع کی حد تک اپنے عشق کا ثبوت پیش کرتے ہیں؟ عشق حسینؑ بے شک عشق الٰہی ہے' ان کا عشق صادق اور حقیقی عشق ہے۔ ان کا یہ عشق فقط مجلس سماع میں اظہار نہیں بلکہ میدان مبارزہ میں عشق کی تصدیق بھی ہے۔ پس قیام حسینؑ کا افتخار یہ ہے کہ ابن عباس جیسے لوگ اس کو صحیح نہیں جانتے تھے۔ بشر کے وہ تمام مقدس قیام جو تاریکیوں میں ایک شعلے کی مانند لو دیتے ہیں' دوسروں کو صائب نہیں لگتے۔ خود ہمارے زمانے میں مثلاً ہماری روحانی قدرت اگر غیر راہ خدا میں

صرف ہو رہی ہو' اس پر کوئی اعتراض کرے' ان حالات میں جبکہ ہر جگہ پر شیطانی قوت پورے طور پر مسلط ہو کوئی اعتراض کرے اور قیام کرے' تو دونوں صورتوں میں عقلاء اشکال کرینگے اور اس کو بد سلیقہ کہیں گے اور کہیں گے کہ یہ کیا سلیقہ اور رسم ہے' یہ کہاں کی استقامت اور کجروی ہے ؟

پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں امیر المومنینؑ کیا اچھی تعبیر رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں : "ارسله علی حین فترة من الرسل"۔ "آپؐ کو اس وقت نبی بنا کر بھیجا کہ جب یہ دنیا پیغمبرؐ کے وجود سے خالی تھی"۔ "والدنیا کا سفة النور"۔ "دنیا نے نور کو گہن لگا دیا تھا"۔

قرآن کریم حضرت ابراھیمؑ کے قیام کے بارے میں فرماتا ہے :

"ولقد آتینا ابراهیم رشده"۔ "یقیناً ہم نے اس سے پہلے ابراھیم کو اسکی سمجھ بوجھ بخشی تھی"۔ (سورہ الانبیاء آیت نمبر ۵۱)

لفظ رشد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراھیمؑ ایک چیز کا احساس کرتے تھے' جس کا دوسرے لوگوں کو احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کہا "قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم"۔ "کہنے لگے کہ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو"۔ (سورہ الانبیاء آیت نمبر ۶۸)

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرماتا ہے :"ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعا...."۔ "یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور وہاں کے لوگوں کو گروہ گروہ پراگندہ کر رکھا تھا"۔ (سورہ قصص آیت نمبر ۴)

حضرت علیؑ نے بنی امیہ کے فتنہ کے بارے میں فرمایا :"انها فتنه عَمیاءُ مُظلمةً"۔ "سب سے خوفناک فتنہ بنی امیہ کا ہے جو خود بھی اندھا ہوگا اور دوسروں کو بھی اندھیرے میں رکھے گا"۔ (خطبہ نمبر ۹۳)

آپؑ نے یہ بھی فرمایا: ”لتجدن بنی امیه لکم ارباب سوء“ ”تم لوگ بنی امیہ کو ہر آئینہ میں اپنے لئے بدترین حاکم پاؤ گے“۔

اور یہ بھی فرمایا: ”حتیٰ لایکون انتصار احد کم منهم الا کانتصار العبد من ربہٖ“ ”ان سے تمھاری داد خواہی ایسی ہی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام اپنے آقا سے یا مرید اپنے پیر سے انصاف کا تقاضا کرے“۔ (خطبہ نمبر ۹۳)

امام حسینؑ اور دوسرے مصلحین

جنہوں نے قیام کیا

وہ تمام لوگ جنہوں نے بشریت کی خدمت کی ہے 'بشریت پر ایک حق رکھتے ہیں۔ یہ خدمت خواہ از راہ علم ہو' صنعت و ہنر کے میدان میں ہو' یا اکتشاف اور اختراع ہو' فلسفہ حکمت' ادب واخلاق' غرض کسی بھی راہ میں ہو' ان میں سے کوئی بھی راہ حق کے شہداء کے برابر بشریت پر حق نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے بشریت کا ردّ عمل اور اظہارِ تشکر شہداء کے بارے میں دوسروں سے زیادہ ہے۔ تمام اجتماعِ بشر کے لئے عدل اور آزادی اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ تنفّس کے لئے ہوا کی اہمیت ہے جسکے بغیر حیات انسانی کادوام ممکن نہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم" "یعنی ملک کفر کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا"۔ عالم اپنے علم میں 'کشف کرنے والا اپنے اکتشاف میں 'استاد اور تربیت دینے والا اپنے تعلیمات میں' حکیم اور فیلسوف اپنے حکمت اور فلسفہ میں 'شہداء کے مقروض اور مرہون منت ہیں۔ جبکہ شہداء اپنے کاموں میں کسی کے مرہون منت نہیں ہیں' اسلئے کہ یہ شہداء ہی ہیں جنہوں نے دوسروں کو آزادی دلائی تاکہ وہ اپنے فکر' نبوغ اور ذکاوت کا اظہار

کر سکیں۔ شہداء، بشریت کے لئے شمع محفل کے مانند ہیں جو خود تو جل گئے مگر بشریت کی محفل کو روشن کر گئے ۱۰۔ (کسی شہید نے ایک شمع سے کہا کہ آج رات میں نے درو دیوار کو مزین کر دیا......) یا ایھاالنبی انا ارسلناك شاھداً و مبشراً و نذیراً...... و سراجاً منیراً. "اے نبی! یقیناً ہم نے ہی آپ کو گواہیاں دینے والا، خوشخبریاں سنانے والا، آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ "(سورۂ الاحزاب ۴۵، ۴۶)۔ یہاں سراج سے تعبیر ظہور پیغمبرؐ کے زمانہ کے جامعہ کو بیان کرتا ہے۔ اگر لوگ راہ راست پر ہوں تو جامعہ تاریک نہیں رہتا اور پھر چراغ کی حاجت بھی نہیں رہتی۔

ایک ایسے حالات میں یزید خلیفہ بن گیا۔ یزید نے حاکم مدینہ کو لکھا: "خذ حسینا...... بالبیعة اخذاً شدیداً"، یعنی امام حسینؑ سے سختی سے بیعت لی جائے۔ بنابر این وہ بیعت کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہیں تھا۔ اب امام حسینؑ کیلئے تین راستے تھے، جن میں سے آپکو ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ یا بیعت کریں اور تسلیم ہو جائیں۔ یا جیسا کہ بعض لوگ پیشنہاد کر رہے تھے، بیعت نہ کریں اور اگر لازم ہو (البتہ لازم بھی ہوتا) تو اپنے آپؑ کنارہ کشی اختیار کرلیں اور کسی درّہ یا کوہ کے دامن میں پناہ لے کر سرکش لوگوں کی طرح خوف و شجاعت کے درمیان مخلوط زندگی بسر کریں۔ تیسرا راستہ امامؑ کے لئے یہ تھا کہ یزید کے خلاف قیام کریں، یہاں تک کہ شہید ہو جائیں۔ ان تین راستوں میں سے پہلا راستہ بنی امیہ کے اعوان و انصار کا پیشنہاد تھا، جیسے مروان۔ دوسرے راستے کی محمد حنفیہ اور ابن عباس

۱۰۔ شہید اور شہادت کے صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر شہادت اپنے بعد نورانیت کو وجود بخشتی ہے اور اس کو ہم نے ایک فرد کی حالت سے تشبیہ دی ہے کہ اچھے اعمال اور خود فراموشی اس شخص کے قلب میں صفا اور نورانیت ایجاد کرتی ہیں۔ یہ مطلب ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کے بارے میں بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔

نے تجویز دی تھی۔ اور تیسرا راستہ وہ ہے جس کو خود آپؑ نے انتخاب فرمایا۔

اگر امام عالی مقام پہلی راہ کا انتخاب کر لیتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپؑ اپنے دین اور آخرت دونوں کو یزید کی دنیا کیلئے فروخت کر دیتے اور مسلمانوں کے کام سے کچھ سروکار نہ رکھتے۔ جو بھی ہونا ہے سو ہو' یزید کے ساتھ مصالحت کریں اور اپنی جان بچانے کے لئے یزید سے ڈر کر اس کی بیعت کر لیں۔ یہ وہی بات ہے جسکے بارے میں آپ نے فرمایا: یابی الله ذلك لناو رسوله و المومنون و حجور طابت و طهرت وانوف حمية و نفوس ابية. اس کام کی نہ خدا نے اجازت دی ہے' نہ دین خدا نے اور نہ ہی یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ وہ چھاتی کہ جس سے دودھ پیا ہے اور وہ روح عالی کہ جو سینہ میں رکھتے ہیں' اس کام کی اجازت نہیں دیتے۔

لیکن دوسرا راستہ! یہ درست ہے کہ اس راستہ کو اگر اختیار کر لیتے تو بیعت نہ کرتے۔ لیکن موضوعِ بیعت فقط منفی پہلو نہ رکھتا تھا کہ بیعت نہ کریں بلکہ آپؑ اپنے لئے ایک مثبت ذمہ داری بھی معین کر چکے تھے۔ آپؑ نے فرمایا: "ایها الناس من رای سلطاناً جائراً مستحلاً لحُرُم الله......" ان سب باتوں کے علاوہ کہاں امام حسینؑ کی بلند روح اور کہاں دشت و کوہ میں فرار کرنا۔

امامؑ جب مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہے تھے تو آپؑ اس بات پر بھی راضی نہیں ہوئے کہ شاہراہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کریں۔ اپنے بعض ہمراہیوں کی تجویز پر آپ نے فرمایا:

"لا والله لا افارقه حتى يقضى الله ما هو قاض."

"خدا کی قسم میں اس راہ سے جدا نہیں ہوں گا' یہاں تک کہ خدا جو چاہتا ہے' وہی ہو کر رہتا ہے" یہ بھی فرمایا: "لا اعطيكم بيدى اعطاء الذليل ولا اقرفرار العبيد. میں نہ ذلیل و خوار ہو کر کسی کو ہاتھ دینے کو

تیار ہوں اور نہ غلام بن کر فرار کرنے کو"۔ آپؑ کے پدر بزرگوار فرماتے تھے : "واللہ لو تظاھرت العرب علی قتالی لما ولیت عنھا ولو امکنت الفرص من رقابھا لسارعت الیھا".

"خدا کی قسم اگر کُل عرب والے ایک ہو کر مجھ سے جنگ کریں تو میں ان سے روگردانی نہیں کروں گا اگر فرصت ملی تو میں ان کے تعاقب میں جلدی کروں گا"۔

تیسرا راستہ وہی ہے جو آپؑ نے خود انتخاب فرمایا۔

اجتماع میں شہید اور شہادت کی قدر و قیمت

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہر شہادت اجتماع میں ایک نورانیت کو وجود بخشتی ہے۔ اور ہم نے اس کو تشبیہ دی تھی اس نورانیت سے جو کسی فرد کے قلب میں عمل خیر اور خود فراموشی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس قلب نے پاکیزگی پیدا کر لی اور ہدایت پالی اس سے تاریکی زائل ہو جاتی ہے اور اس کے لئے راہ زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ یہ مفہوم شہید اور شہادت کے قدر و قیمت کے بارے میں بحث کے لئے اچھا اور عالی زینہ ہے، خصوصاً قیام حسینی کے دنیائے اسلام میں آثار کے نقطۂ نظر سے۔ اور اس نظر سے بھی کہ اگر امامؑ نے شہادت ہی کے قصد سے حرکت کی، تب بھی آپ ایک صحیح منطق رکھتے تھے۔ یہ جملہ **ان الله شاء ان یراك قتیلاً**، اگر صحیح سند رکھتا ہے تو معنی اور مطلب کے لحاظ سے ایک درست بات ہے۔

منطق منفعت اور منطق حقیقت

منفعت پرستی کی منطق ایک منطق ہے اور حق پرستی اور اصلاح کی منطق دوسری منطق ہے [۱]۔ ابی عبداللہؑ کو عقلائے قوم حرکت سے منع کر رہے تھے۔ ان سب کی نصیحتوں کا محور امام حسینؑ کی شخصی مصلحت، دنیوی زندگی، تن کی سلامتی اور فرزندوں کی حفاظت تھا۔ کہتے ہیں سب سے زیادہ جامع گفتگو ابن عباس کی تھی۔ اگر کسی جگہ پر تعجب کرنا ہو تو ہمیں ابن عباس کی منطق پر تعجب کرنا چاہیئے۔ ابن عباس کی منطق میں جو چیز نہیں ملتی وہ فکر اسلامی، ایثار اور خود فراموشی ہے اور جو چیز منطق

---

[۱]۔ حضرت علیؑ نے سرزمین کربلا کے بارے میں فرمایا: مُناخ رکابٍ و مصارع عشاق۔ (اور اس کی خاک کے بارے میں فرمایا: واهاً لك ایتها التربة لیحشرنّ منك اقوام یدخلون الجنّة بغیر حساب "تجھ پر آفرین ہے اے خاک کہ تیرے اندر سے ایک ایسی قوم محشور ہوگی جو حساب کے بغیر بہشت میں جائے گی"۔

حسینؑ میں نظر نہیں آتی وہ اپنی ذاتی مصالح اور منافع ہیں [۱۰]۔

منطق حسینؑ وہی ہے جو آپؑ نے فرمایا: **خط الموت علی ولد آدم......**

آپؑ نے اپنی منطق کا اظہار حُر ریاحی کے جواب میں فرمایا:

افبالموت تخوفنی. (کیا مجھے موت سے ڈراتے ہو) اس کے بعد وہ چند معروف و مشہور اشعار پڑھے: **سامضی وما بالموت عار علی الفتی......**

ہدف مقدس و حس تعالیٰ و تقدس

کلمۂ شہید اور کلمۂ شہادت ان معمول کے رائج کلمات میں سے ہیں جو ہم فقط کچھ افراد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہر قتل ہونے والا اور ہر مرنے والا شہید نہیں ہے۔ ہر روز سینکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں' ہزاروں انسان مر جاتے ہیں' ہم ان کو شہید نہیں کہتے۔ کلمہ شہید کو ایک بلند و بالا' پاک و پاکیزہ اور نورانی دائرہ نے اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ شہید اس کو کہتے ہیں جو ایک مقدس راہ اور مقدس ہدف کی خاطر اپنی جان دے۔ شہید کی تین خصوصیات ہیں۔

(۱) وہ ایک مقدس ہدف کی راہ میں قتل ہو جاتا ہے۔

(۲) اسے جاودانی اور پایندگی مل جاتی ہے۔

(۳) تیسرے چیز وہ ہے کہ جس کو ہم نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ شہید ایک پاک محیط اور جامعہ عطا کرتا ہے۔

ہم نے یہاں پر کہا "مقدس راہ میں"، یہ نہیں کہا "بزرگ راہ میں"، چونکہ ممکن

۱۰۔ فروغی کے نقل کے مطابق ھربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے کہا: "نیک لوگوں کی بلند ترین آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ آدم سازی میں شرکت کریں یعنی مصلح ہوں"۔ ہمارے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق: خداوند عالم نے ان کے بارے میں فرمایا: عزیز علیه ما عنتّم: "ان پر تمہاری ہر مصیبت شاق ہوتی ہے۔ (توبہ ۱۲۸)

ہے مقصد بزرگ اور بااہمیت ہو لیکن مقدس نہ ہو۔ اسکندر کہ جس نے دنیا کو اپنے قبضہ میں لینے کی آرزو کا تعاقب کیا' اصطلاحاً ہدف تو عظیم تھا لیکن مقدس نہیں تھا' بلکہ عالی اور بلند وبالا بھی نہ تھا۔ اور جو بھی اس راہ میں مارا جاتا ہے' وہ بشر کی نظروں میں محترم اور مقدس نہیں ہوتا ہے ۱۔ اس نے اپنی خود پرستی کے دائرے کو توسیع دی تھی۔ ایسا شخص اگر تمام آسمانی کُرّوں کو بھی تسخیر کر لے' تب بھی اس کا یہ عمل اس کے لئے کوئی تقدس اور احترام کا پہلو پیدا نہیں کرتا۔ عمل اس وقت مقدس ہوتا ہے جب وہ خود پرستی سے ہٹ کر کسی ہدف کا حامل ہو۔ ۱' فقط مکلّف ہونے کے ناطے اور اپنا وظیفہ سمجھ کر اسے انجام دیا جائے۔

خصوصاً وہ تکالیف کہ جو نوع بشریت اور اجتماع کے لئے ہوں "المقتول دون عیا له وماله"۔ "جو قتل ہوا ہو لیکن نہ اپنے عیال کے لئے اور نہ ہی مال و دولت کی خاطر"، وہ شہید ہے کیونکہ اس نے یہ کام وظیفہ 'شرافت' تکلیف

۱۔ شہید وہ ہے جس نے اپنے خون کو قدر اور ابدیّت بخشی اور اسے جاودان بنایا۔ جو شخص اپنے مال کو نیک خدمت اور کار خیر میں خرچ کرتا ہے وہ اس مال کو جاودانگی اور ارزش بخشتا ہے' جو شخص اپنے علمی آثار اور اپنی فکر چھوڑ کر جاتا ہے' وہ اپنی فکر کو ابدیت بخشتا ہے۔ اسی طرح جس شخص نے صنعتی یا فنی آثار چھوڑے ہوں' اس نے اپنے ہنر کو اور جس شخص نے اپنے فرزند یا دوسروں کو تربیت دی ہے' اس نے اپنے عمل کو ارزش اور ابدیت عطا کی ہے۔ شہید اپنے خون سے ارزش اور ابدیت بخشتا ہے۔ شہید اور دوسروں کے درمیان یہ فرق ہے کہ شہید پاکباز ہوتے ہیں "اور سود اوہی اچھا ہوتا ہے جس میں سب کچھ یکجا ہو جائے"۔ عالم یا منفق (انفاق کرنے والا) معلّم یا مربّی (تربیت دینے والا) یا ہنر مند' اب سب کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کے ایک حصہ کو ارزش اور ابدیت بخشتے ہیں۔ ہم اس سے قبل یہ بتا چکے ہیں کہ عالم' مربّی' صنعتگر' فیلسوف' منفق' سب کے سب شہدا کے مقروض ہیں' لیکن شہداء کسی کے مقروض نہیں۔ شہید کا خون زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ ہزار گنا ہو جاتا ہے۔ یہ خون دوسروں میں منتقل ہو جاتا اور ان کی رگ و پے میں ہمیشہ کے لئے دوڑنے لگتا ہے۔ خون شہید کی ابدیت یا جاودانی کا مطلب یہی ہے۔ شہداء حماسہ آفرین ہوتے ہیں' یہی اسکا مطلب ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے بزرگوار اور پیشوایان شہادت کی آرزو کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اسلام ہر زمانہ میں شہید کا محتاج ہے۔

وجدان اور دیانت کی خاطر انجام دیا ہے' نہ کہ مادّی منفعت حاصل کرنے کے لئے۔ چنانچہ اگر کوئی انسان عدل اور آزادی یا توحید اور ایمان کے لئے قتل ہو جائے تو اس کی پاکی اور پارسائی کے بہت بلند درجات ہیں۔

تعالٰی اور تقدس کی حس بشر میں ایک محکم اور استوار حس ہے۔ اس کا سرچشمہ بشر کی روح کی گہرائی میں جاگزیں ہوتا ہے' مثلاً حس حقیقت خواہی (علم)' نیکی خواہی (اخلاق)' زیبائی خواہی (جمال) اور خود یہ وجود' بشر کے معماؤں میں سے ایک ہے کہ انسان محسوس اور ملموس منافع کے ماوراء کچھ امور کے سامنے ایک قسم کی تعظیم و تکریم اور خضوع کرتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہر جھکاؤ اور طلب جو انسان کے اندر سے ظہور کرتی ہے' ایک محتاج عینی کی حکایت کرتی ہے۔ اسکی جو انتہا مشاہدے میں آتی ہے' بدن نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل وجود ہے جو روح انسان میں ہے۔

بشر کے مقدسات کا سلسلہ ذات احدیت پر منتہی ہوتا ہے۔ خداوند عالم قدوس ہے مطلقاً تمام نقصانات سے منزہ ہے۔ "هو الله الذی لا اله الا هو الملك القدوس......" وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں وہ بادشاہ ہے' بڑا پاکیزہ صفت ہے......" (سورۂ احزاب : ۲۳)۔

لہٰذا بشر کے لئے مقدس ترین عمل شرک اور بت پرستی سے جنگ ہے۔

۱۔ یہاں پر اس بات کی تحقیق ہونی چاہئے کہ قداست کا اصلی ملاک (معیار) کیا ہے؟ خود پرستی کیوں پلید ہے اور دوسروں کی خدمت کیلئے' انجام وظیفہ کے لئے اور مسئولیت یا خدا کی رضایت کے لئے عمل کیوں مقدس ہے؟ آیا ملاک' مادیت اور مادہ سے خالی ہوتا ہے؟ آیا ملاک' وجود و عدم ہے؟ آیا ملاک' حرکت اور توقف ہے؟ آیا ملاک' جہان کے اہداف سے ہم آہنگی اور دنیا کی تکاملی کی طرف حرکت ہے؟ آیا تقدس کی علت جیسا کہ متن میں ذکر ہوا' ابدی ہو جانا' جاودانگی اور مرگ سے نجات ہیں؟

مقدس تحریکیں :

مقدس قیام اور تحریکیں انبیائے عظام سے شروع ہوئی ہیں۔ قرآن کریم کے سورۂ شعراء میں انبیاء کے مقدس جہاد کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰؑ، ابراہیمؑ، نوحؑ، ھودؑ، لوطؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور خاتم الانبیاءؐ کی داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ان سب نے بت پرستی، ظلم و ستم، جہل، تعصب، تقلید، اسراف، تبذیر، زمین پر فساد، فحشاء اور موہوم اجتماعی امتیازات سے مبارزہ کیا۔ بشر کے مقدسات بھی ان چیزوں سے تجاوز نہیں کرتے۔

امام حسینؑ اسی راہ پر چلے جس راہ پر تمام انبیاءؑ چلے تھے۔ لیکن امام حسینؑ کے لئے ایک ایسی صورت پیش آئی جو دوسروں کو پیش نہیں آئی تھی۔

یہ اعتراض کہ امام حسینؑ نے کیوں فداکاری کی اور کیوں تسلیم نہیں ہوئے اور کیوں اپنی جان کی حفاظت نہیں کی، درحقیقت تمام انبیاء اور اولیاء پر اعتراض ہے۔ دین کی بنیاد خود فراموشی اور فداکاری میں ہے۔ دین کی منطق ایثار ہے۔ **و یؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصة**"۔ "دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرتے ہیں چاہے، خود انھیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو"۔ (سورۂ حشر آیت ۹) "**ویطعمون الطعام علی حبه مسکنا و یتیما و اسیراً**"۔ "یہ اس کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں"۔ (سورۂ انسان آیت ۸) "**من اصبح ولم یھتم بامور المسلمین فلیس بمسلمٍ**۔" "اگر کوئی مسلمان صبح کرے اور مسلمانوں کے بارے میں کوئی اہتمام نہ کرے، وہ مسلمان نہیں"۔

اپنے جان، ماں، باپ، فرزند، بیوی، رشتہ دار، خاندان، سرمایہ، نوکری، پیشہ، گھر، ان سب سے تعلق ایک انسان کیلئے طبیعی بات ہے، بلکہ ان میں سے اکثر ہر حیوان کے لئے بھی طبیعی ہیں۔ دین آیا ہے تاکہ انسان کو عالی امور کا شیفتہ بنائے اور

عالیتر درس دے: "قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوا نکم و ازواجکم وعشیرتکم واموال اقتر فتموها وتجارة تخشون کسادها و مساکن ترضونها احب الیکم من الله و رسوله و جهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره ط والله لا یهدی القوم الفاسقین"۔

"پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھارے باپ دادا، اولاد، برادران، ازواج، خاندان و قبیلہ اور وہ اموال جنھیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کی طرف سے فکر مند رہتے ہو اور وہ مکانات جنھیں پسند کرتے ہو، تمھاری نگاہ میں اللہ، اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہاں تک کہ امر الٰہی آجائے۔ اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے"۔

(سورہ توبہ آیت نمبر ۲۴)

تحریک حسینی میں ایک قوی ادراک کا وجود

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نہضت کے مقدس، محترم اور متعالی ہونے اور لوگوں کے افکار و عقول میں روحانی سیادت پیدا کرنے کیلئے چند چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے اہداف و مقاصد پاک اور طاہر ہوں۔ ہدف و مقصد شخصی اغراض، مادّی منافع، اپنی آرزوؤں کا حصول، حرص و طمع، جاہ طلبی، شہوت رانی، خود خواہی، خود پرستی، تعصب، قومیت و رنگ نہ ہو۔ نہضت خدا کی خاطر ہو، امر خدا، توحید، عدل و انصاف کیلئے، آزادی اور مظلوم کی حمایت کیلئے اور ضعیف کے دفاع کے لئے ہو۔ **ان فرعون علافی الارض وجعل اهلها شیعاً یستضعف طائفة منهم**...... "فرعون نے روئے زمین پر سرکشی اختیار کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور بنا کر ذلیل کرتا تھا" (سورہ قصص آیت ۴)۔ نہضت مقدس دلوں کو لرزا دیتا ہے۔ یہ نہضت ایک ایسی سوزش ہے جو انسانی ضمیر اور وجدان میں پیدا ہوتا ہے۔ جامعہ انسانیت کی خاطر ہوتا ہے۔ اجتماعِ بشری کے کچھ مقدس اصول ہیں۔ یہاں پر اصولوں کا اجتماعی پہلو ہوتا ہے، نہ کہ انفرادی پہلو[۱]۔ انسانیت کے یہ وہ عالی اصول ہیں کہ انسانی زندگی انہی پر قائم ہے اور انسانی زندگی کی روح یہی اصول ہیں۔ زندگی کے لئے روح ہے جو زندگی کے وسائل سے بلند و بالاتر ہے۔ زندگی کے وسیلوں میں سے اگر ایک وسیلہ موجود نہ ہو تو بشر دوسرے وسائل کے ذریعے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لیکن اگر عدالت، حق، آزادی، کے یہ مقدس کلمات بشریت کی کتاب سے محو ہو جائیں تو یہ ایسا ہے، جیسے "ہوا" کو فضا سے محو

---

[۱] دوسرے الفاظ میں خود پرستی اور منفعت پرستی سے ہٹ کر خود کو جامعہ کے مصالح پر فدا کر دیں، حق و عدالت پر فدا ہو جائیں، حق و عدالت میں تبدیل ہو کر اسکا پیکر بن جائیں اور حق و عدالت کی طرح مقدس ہو جائیں

کر دیا جائے۔ اس فضا میں اگر چراغ نہ ہو' فرش نہ ہو' لاوڈ سپیکر نہ ہو' چادر نہ ہو' پنکھا نہ ہو۔ ان کے نہ ہونے اور "ہوا" کے نہ ہونے میں فرق ہے۔

ان نہضتوں کے مقدس' متعالی اور محترم ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ انبوہِ ظلمت' مایوسی اور مطلق ناامیدی کے درمیان ایسے موقعوں پر کہ جب آسمان بشریت پر کوئی ستارہ نظر نہ آئے' اس وقت یہ نہضتیں بجلی کی طرح چمکتی ہیں اور حقانیت کی مشعل راہ کے مثل نمودار ہو کر آدمیوں کی راہ نمائی کرتی ہیں۔ یہ نہضتیں سکون کے درمیان ایک حرکت اور موت کے سکوت وسناٹے میں ایک چیخ ہیں۔ یہ تاریکی میں بجلی کے مانند اور کثیر کے درمیان قلیل ہیں۔ "کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله"۔ "اکثر چھوٹے چھوٹے گروہ بڑی بڑی جماعتوں پر حکم خدا سے غالب آجاتے ہیں" (سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۴۹)۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نہضتیں خود پرست عقلاء کو صائب نظر نہیں آتیں۔ یہ نہضتیں ایک ایسے بادل کی طرح ہیں جو صحراؤں میں پیاسوں پر برستے ہیں' اس محبوب کی طرح ہیں جو پہلے سے بتائے بغیر عاشق کی افسردہ حالت میں خود کو اس تک پہنچا دیتا ہے۔

وبريد ياتی بوصل حبيب   وحبيب ياتی بلا ميعادِ

"اور وہ قاصد جو دوست کے وصال کی خبر لا رہا ہے۔ اور وہ دوست جو وعدہ کیئے بغیر ہی پہنچ جاتا ہے"۔

ان نہضتوں کے مقدس اور محترم ہونے کی تیسری علت یہ ہے کہ یہ ایک قوی ادارک اور ایک مؤثر بصیرت ساتھ لئے ہوئے ہوتی ہیں جو پردہ کے پیچھے سے ظواہر کو دیکھ سکتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ چشم بصیرت سے خام اینٹ میں اس چیز کو دیکھ لیتی ہیں جو دوسروں کو آئینہ میں بھی نظر نہیں آتی۔ جسطرح گزشتہ دو علتوں کے بیان میں ہم نے اِن آیات قرآنی سے استنباط کیا آیۂ من انصاری الی

اللہ۔ ”کون ہے خدا کی راہ میں میرا مددگار ہو“ (سورہ آل عمران ۵۲) اور آیۂ سراج منیر (سورہ احزاب ۴۶) اور آیۂ یستضعف طائفة (سورہ قصص ۴)، اسی طرح اس علت میں بھی کہ مقدس نہضتوں میں ایک قوی احساس اور بصیرت موجود ہے، قرآن سے استنباط ہوتا ہے یہ ایک چیز کو محسوس کر لیتے ہیں جو دوسرے نہیں کرپاتے۔ یہ ایک چیز کو دیکھ لیتے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ یہاں بھی قرآن سے استنباط ہوتا ہے، جیسے آیۂ ولقد آتینا ابراھیم رشدہ۔ ”اور ہم نے ابراہیمؑ کو اس سے پہلے ہی رشد عطا کر دی تھی“۔ (سورہ الانبیاء آیت نمبر ۵۱) اور آیۂ نحن نقص علیك نبا هم بالحق انهم فتية آمنوا بربهم و زدنا هم هدیً. ”ہم آپ کو ان کے واقعات بالکل سچے سچے بتا رہے ہیں یہ چند جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا تھا“ (سورہ کہف ۱۳)۔ (کلمہ رشد عربی میں بڑھنے اور پھولنے کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ فارسی میں استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے معنی وہی ہیں جو فقہ میں ہے مثلاً کہتے ہیں ”عاقل بالغ اور رشید ہونا چاہئے“ دوسری آیت میں کلمۂ ”زدنا هم هدیً“ بھی اسی رشد کے معنی میں ہے)۔ سید جمال الدین افغانی کی نہضت اس لحاظ سے مقدس ہے کہ یہ اپنے زمانہ سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے۔ یہ سید جمال کے ان خطوط سے پتہ چلتا ہے جو انھوں نے علماء کے نام لکھے ہیں۔

البتہ ان نہضتوں کے مقدس ہونے کے اور بھی پہلو موجود ہیں۔ جیسے فوج اور قوت کا برابر نہ ہونا، ظاہری اور مادی لحاظ سے لیس نہ ہونا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمدؐ نے یکہ و تنہا قیام کیا اور اسی طرح حضرت امام حسینؑ نے بھی (اس پہلو کی دوسری علت کی طرف بر گشت ہے)۔

نہضت امام حسینؑ میں ایک قوی ادراک کا وجود تھا اور وہ یہ تھا کہ بنی امیہ کا

پس پردہ اسلام کے خلاف جاری عمل جسے ظاہر بین لوگ نہیں دیکھ رہے تھے، وہ نہضت حسینی کے شرکاء کو نظر آرہا تھا۔ ابو سفیان نے حضرت عثمانؓ کے گھر میں کہا تھا: یابنی امیہ! تلقفو ھا تلقف الکرة، اما والذی یحلف به ابو سفیان لا جنة ولا نار، وما زلت ارجوھا لکم ولتصیرن الیٰ ابنا ئکم و راثة .

"اے بنو امیہ! ملک ہے اور سلطنت ہے۔ حق، معنویت، جنت، جہنم، یہ سب جھوٹ ہے۔ اس گیند کو اپنے میدان سے خارج نہ ہونے دو۔ ایک دوسرے کے پاس دے دو اور اس کو اپنے بیٹوں کیلئے موروثی قرار دے دو"۔

یزید کی ولیعہدی کا موضوع اور اسکے لئے لوگوں سے بیعت لینا، ان سب میں مقدم امام حسینؑ سے بیعت لینا، ابو سفیان کی خطرناک حزبی فکر کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے تھا۔ اور یہ بھی اپنی جگہ پر ایک اصول تھا۔

لیکن ظاہر بین آنکھیں، تظاہر سے فریب کھانے والے اور ہر چیز کو ظاہر پر حمل کرنے والے لوگ ان امور پر کوئی توجہ نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ جو امام حسینؑ نے فرمایا: وعلی الاسلام السلام اذ قدبلیت الامة براع مثل یزید، ایک حقیقت تھی جسے امام حسینؑ درک کر رہے تھے۔ دوسرے لوگوں نے اس حقیقت کو درک نہیں کیا۔ امام حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ یزید کی خلافت در حقیقت ابو سفیان کے دئے ہوئے اصول "خلافت اپنے بیٹوں کیلئے موروثی بناؤ" کو عملی جامعہ پہنانا ہے۔ آپؑ جان رہے تھے کہ اس صورتحال میں اگر خاموشی اختیار کرلیں گے تو یہ ایک سنت بن جائیگی اور کچھ احادیث بھی جعل ہو جائیں گی کہ خلافت، ابو سفیان کے خاندان میں ہونا چاہئے۔ امام حسینؑ یہود، نصاریٰ، مجوسی، عرب کے مشرکین یا مرتد لوگوں کے ہاتھوں نہیں مارے گئے، مسلمانوں بلکہ ان کے پدر بزرگوار کے دوستوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حتیٰ کہ شامیوں کے ہاتھوں بھی شہید نہیں

ہوئے' کوفیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ البتہ کوفی مرعوب تھے' تمام لوگ رؤسا کے تابع دار تھے اور رؤسا رشوت خور تھے۔ **اما رؤساؤ هم فقد اعظمت رشوتهم وملئت غرائرهم** "ان کے رؤسا کی جھولیاں بھر چکی تھی اور وہ بڑے بڑے بینک دریافت کر چکے تھے"۔ درہم و دینار ان کے راستوں میں بکھیر دیئے گئے تھے۔ لیکن عمدہ چیز یہ ہے کہ عام لوگوں کی درک ضعیف تھی اور وہ جلد بُھلا دینے والے تھے' جیسا کہ ہم آگے اس کی وضاحت کریں گے۔

اس سے پہلے ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کی علتوں میں سے اہم ترین علت' اسی طرح لوگوں کے بنی امیہ کا گرویدہ ہو جانے کی اہم ترین علت' لوگوں کی جہالت تھی۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ امام حسینؑ شخصِ یزید سے جنگ نہیں کر رہے تھے۔ آپؑ کی شخصیت اس سے کہیں بلند و بالا تھی کہ آپؑ کا ہدف کوئی شخص یا فرد ہو۔ آپؑ کا ہدف اصولی اور کلی تھا۔ حقیقت میں امام حسینؑ ظلم اور جہل سے مبارزہ کر رہے تھے۔ چنانچہ زیارت میں ہمیں تلقین اور تعلیم دی گئی ہے کہ اس مقابلہ کا ہدف و مقصد جہل و گمراہی کا خاتمہ اور قلع قمع کرنا ہے۔ زیارت اربعین میں ہے: **وبذل مهجته فيك ليستنقذ عبادك من الجهالة وحيرة الضلالة.** (اور تیری راہ میں اپنا خون بہایا تاکہ تیرے بندوں کو جہالت اور گمراہی کی حیرانی سے باہر نکال لیں)۔

اب ہم اس بات کی توضیح کریں گے کہ لوگوں کی جہالت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے یا کچھ پڑھا نہیں تھا' اسلئے ایسے عمل کے مرتکب ہوئے۔ اور اگر کچھ پڑھے لکھے ہوتے' کچھ تحصیل کئے ہوئے ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ دین کی اصطلاح میں جہالت کو زیادہ تر عقل کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے مراد تنبُّہ عقلی ہے کہ لوگ عقلی بیداری

رکھتے ہوں (دوسرے لفظوں میں مشاہدے میں آنیوالے واقعات کا تجزیہ و تحلیل اور کلیات کو جزئیات پر تطبیق کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔ اسکا انپڑھ اور پڑھا لکھا ہونے سے چنداں ربط نہیں ہے۔ علم 'کلیات کو حفظ اور ضبط کر لینے کی قوت ہے اور عقل سے مراد تحلیل کرنے کی قوت ہے۔) بالفاظ دیگر امام حسینؑ لوگوں کی فراموشکاری سے شہید ہوئے۔ کیونکہ لوگ اگر اپنی پچاس ساٹھ سالہ تاریخ کو مد نظر رکھتے اور ان میں اگر عبرت پکڑنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی قوت بیدار ہوتی اور یہ تعبیرِ سیدالشہداء : ارجعوا اِلی عقولکم . اگر اپنے گزشتہ پچاس ساٹھ سالہ تجربہ پر غور کر کے عقل سے کام لیتے' ابو سفیان اور معاویہ کی اور کوفہ میں زیاد کی جنایات اور خاندان بنوامیہ کے جرائم کو اگر نہ بھلاتے' ذاتی منفعت کے لئے معاویہ کے ظاہری دین کا دم بھرنے سے اگر فریب نہ کھاتے اور اس کی گہرائی میں جا کر غور کرتے اور یہ حساب کرتے کہ آیا دین و دنیا کے لئے حسینؑ بہتر ہیں یا یزید و معاویہ اور عبیداللہ' تو ہرگز اس طرح سے واقعہ رونما نہ ہوتا۔ پس در حقیقت اس واقعہ کی اصل علت یہ تھی کہ لوگ جو نسبتاً اسلام کے معتقد تھے' انہوں نے خاندانِ رسالت کے ساتھ یہ رویّہ رکھا تھا' درحالانکہ سب قربتہً الی اللہ کفار سے جنگ میں شرکت کیلئے حاضر تھے۔ یہاں فقط اور فقط لوگوں کی فراموش کاری تھی اور وہ مکر و فریب سے دھوکا کھا گئے تھے۔ یعنی اُنہیں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ پشت پردۂ نفاق کو دیکھ لیتے۔ وہ شعائرِ اسلامی کے ظاہر کو محفوظ دیکھ رہے تھے' لیکن اصول اور معانی کے درمیان سے رخصت ہو جانے کی طرف انکی توجہ نہ تھی۔ البتہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا کہ اس حادثہ میں رعب' خوف و ہراس اور درندگی ایکطرف اور رؤساء کے اخلاق کی تباہی' اُنکی رشوت خوری' اُنکی طمع اور چھوٹے لوگوں کی قبیلہ کے رؤسا کی اندھی اطاعت' (عرب قبیلوں کی خو کے مطابق)

دوسری طرف 'اس حادثہ کے وقوع کے مہم عوامل میں سے ہے۔

یہ حادثہ سو فیصد ایک اسلامی حادثہ ہے۔اُس دشمن کے قول کے مطابق امام حسینؑ کو اپنے نانا کی تلوار سے مارا گیا۔اس کی علت لوگوں کی جہالت و ظاہر بینی اور حفظ ظواہر و شعائر سے فریب کھانا تھا۔

اس حادثہ کے جملہ عوامل میں سے ایک 'جسکا اس میں زیادہ دخل تھا' وہ کے محرکین میں سے ایسے لوگوں کا ایک گروہ تھا جو فطرتاً جنایت کار تھے۔"عقاد" کے بقول :المسخاء المشوّهين اوليك الذين تمتلی صدور هم بالحقد على ابناء آدم ولاسيما من كان منهم على سواء الخُلق و حسن الاحدوثة ' فاذا بهم يفرغون حقد هم لعدائه' وان لم ينتفعوا باجر او غنيمة."یہ مسخ شدہ بد شکل لوگ ہیں۔ان کے سینوں میں فرزندان آدم خصوصاً خوش اخلاق اور نیک آثار کے حامل لوگوں کے لئے کینہ بھرا ہوا ہے۔اسی وجہ سے انہوں نے اپنے تمام کینوں کو دشمنی میں ان کے سر پر پھینک دیا'اگرچہ اس کام سے ان کو کوئی پاداش یا غنیمت نصیب نہیں ہوئی"۔

امام حسینؑ کی شہادت میں داخل عوامل کا خلاصہ

ہم یہاں پر تاریخی بحث کے اعتبار سے اس طرح سے عناوین مرتب کر سکتے ہیں کہ امام حسینؑ کو کن لوگوں نے اور کس لئے شہید کر دیا؟اسی طرح 'کن لوگوں نے اور کس لئے آپؑ کی مدد کی؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کن لوگوں نے شہید کیا یا کن لوگوں نے مدد کی 'تو وہ تو معلوم ہے۔مگر یہ بات کہ کن چیزوں نے شہید کیا یا مدد کی 'اس کا جواب یہ ہے کہ امام حسینؑ کو رے کی حکومت کی لالچ نے 'مال کی طمع نے (خولی نے کہا جئتك بغنا الدهر)'رؤساء کے رشوت لینے کے (اما رؤساؤهم فقد

اعظمت رشوتهم وملئت غرائرهم)' بد دلی نے' عام لوگوں کی مرعوبیت نے' یزید کی محبت کی طرف میل نے (ابن زیاد چاہتا تھا کہ یزید کے دل میں اس کے باپ سے جو کدورت ہے کہ اس کے باپ نے یزید کی ولی عہدی پر تعلل کیا تھا' اس کی تلافی کرے)' ذاتی خباثت نے (جیسے شمر)' اور مستی' غرور' تکبر' بد بختی اور یزید کے اوچھے پن نے اور ان سب سے بالاتر عام لوگ جو مسلمان تھے' معتقد تھے' لیکن فراموش کار تھے' جنہوں نے اپنی ساٹھ (۶۰) سالہ تاریخ پلٹ کر نہیں دیکھی تھی' جو گزر چکے تھے ان کو فراموش کر دیا تھا اور ظاہری کاموں سے فریب کھا گئے تھے' ان سب نے حسینؑ کو شہید کیا۔

کن چیزوں نے امامؑ کا ساتھ دیا؟ ایمان نے' ساٹھ سالہ تاریخ پر توجہ نے (جیسا کہ زہیر اور امثالِ زہیر کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے)' جوانمردی اور مردانگی کی حس نے' غیب پر ایمان نے اور ان ہی جیسی دوسری صفات نے آپؑ کی مدد کی۔

ایک نہضت کے تقدس کے علل

گزشتہ مطالب سے مربوط رہتے ہوئے‘اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرینگے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جس کے سبب ایک قیام مقدس‘پاک‘ عظیم اور لائقِ احترام ہو جاتا ہے تاکہ پھر وہ دوسری تحریکوں کے لئے مِلاک‘مایہ‘اصول اور معیار بن جائے۔ مقدس ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اس کی طرف ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح مافوق مادّی اور مافوق طبیعی چیزوں کی طرف نگاہ کرتے ہیں۔ پھر یہ اس حد تک عظیم اور محترم ہو جاتا ہے کہ کسی بھی نہضت کا اس کے مقابل قیاس نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اُس سے تشبیہ دی جاتی ہے اور وہ پیروی کے قابل ہوتی ہے۔

تقریباً چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس نہضت کی قداست اور خارق العادہ اہمیت ہونے کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں :

۱۔ اس نہضت کا ہدف قداسیت[۱]‘ تعالی اور عظمت ہے‘یعنی جو ہدف ہے‘وہ حقیقت ہے‘نہ کہ ذاتی منفعت۔ یہاں فداکاری ہے اور منفعت کی قربانی ہے ‘حقیقت کیلئے اور خدا کی راہ میں۔ ظاہر ہے اگر کوئی اسلئے قیام کرے کہ پانی اور روٹی ملے‘کسی مقام اور منصب پر پہنچ سکے‘مال و دولت یا قدرت حاصل ہو جائے‘بقول حنظلہ بادغیسی اگر قیام کرے سردار ہونے کے لئے یا نیشنلسٹ (Nationalist) یعنی ملّی اور وطنی تعصب کے لئے‘ایسے قیام مقدس نہیں ہوتے۔بلکہ ایسے قیام میں تو دوسروں کو وسیلہ بنایا جاتا ہے‘اسلئے قیام کرنے والا محکوم بھی ہو جاتا ہے‘خواہ نتائج موافقت میں ہوں یا شکست ہو۔ ایسا قیام

۱۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مقدس و متعالی ہدف اور عظیم ہدف میں فرق ہے۔ اسکندر‘نادر شاہ‘اسماعیل اور اِن جیسے دوسرے لوگ عظیم ہدف کے مالک تھے لیکن ان کے ہدف مقدس نہیں تھے۔ یہ لوگ خود خواہی اور جاہ طلبی کے عظیم نمونے تھے‘نہ آزادی چاہنے والے تھے اور نہ حقیقت جو اور نہ ہی خیر خواہی بشر دوستی اور خدا پرستی کے کوئی بڑے نمونے تھے۔

کسی معاملہ یا تجارت کی طرح ہوتا ہے کہ کبھی اس میں نفع ہوتا ہے تو کبھی نقصان۔ یہ نفع و نقصان کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس طرح کا قیام منافع کی خاطر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ساتھ مقابلہ و مبارزہ ہوتا ہے۔ اسی دلیل کے تحت ایسے قیام بے وقعت ہیں۔ امام حسینؑ کا اپنے پدر بزرگوار کی پیروی کرتے ہوئے یہ فرمانا:

"اللهم انك تعلم انّهُ لم يكن ما كان منّا مُنا فَسَةً فى سلطان ......"

در حقیقت اپنی آرزو اور اپنے درد دل کا بیان ہے۔

لیکن اگر قیام و مبارزہ، دو نفر کے درمیان شخصی نوعیت کا نہ ہو، منافع کے خاطر نہ ہو بلکہ ایک قسم کے عقیدہ، ظلم، فساد، شرک اور بت پرستی پر مبنی حکومت کے خلاف ہو، بشریت کو اجتماعی غلامی سے نجات دلانے اور خطرناک اعتقاد سے بچانے کے لئے ہو، بالاخر بشریت کو عفریت جہل و ضلالت، ظلم و استبداد اور استحصال سے نجات دلانے کے لئے ہو (**وبذل مهجته فيك ليستنقذ عبادك من الجهالة وحَيرةِ الضلالة**، خدا کے حکم کی تعمیل اور رضائے حق کی تحصیل کے لئے ہو (**ان صلاتي ونسكي ومحياى ومماتي لله رب العالمين**)، ایثار اور فداکاری کی بنیاد پر ہو، خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر یہ مبارزہ خالصتاً اللہ کی خوشنودی کیلئے ہو اور کوئی بھی منفعت آڑے نہ آئے بلکہ منفعت کو حقیقت کی خاطر خطرے میں ڈال دے، ایسا مبارزہ در حقیقت بشر کی روحِ حقیقت پرستی کا ایک جلوہ ہے اور خود پرستی کی ضد میں ہے۔ یہ مبارزہ **انی اعلم مالا تعلمون** کا مصداق ہے، جو طبیعتاً تقدس اور عظمت پیدا کرتا ہے۔ ایسا مبارزہ حدیث **هجرت الى الله اور الى الرسول** کا مصداق ہے۔ بالفاظ دیگر قداست کا ایک پہلو صاحب نہضت کے درد کی

نوعیت اور اس کی آرزو کی نوعیت سے مربوط ہے۔

قیام امام حسینؑ اس عنصر سے حد اعلیٰ کے درجے تک توانگر تھا۔ اس قیام میں آپؑ کے تمام منافع کی کلی طور پر یقین دہانی ہو رہی تھی۔ اسلام و مسلمین کو ظلم کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے، آپؑ اپنے جان و مال اور تمام تر ہستی کو خطرے میں ڈال دینے کے لئے خود حاضر ہو گئے تھے۔ اس بناء پر آپؑ سو فیصد ایک شہید اور ایک پاکباز ہیں، بلکہ سید الشہداء اور پاکبازوں کے سالار ہیں۔

۲۔ کسی نہضت کو پاکیزگی، بلندی اور جنبہ جاودانی دینے کیلئے دوسرا عامل اس معاشرہ کے خاص شرائط ہیں^۱۔ روز روشن میں چراغ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور چاندنی رات میں جب مطلع صاف ہو تو تاروں بھرے آسمان کی اہمیت کم ہوتی ہے لیکن مطلق تاریکی میں جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، یہ زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ یہ اس پانی کے مانند ہے جو بیابان میں کسی پیاسے پر برسے یا اس بارش کی مانند جو بہت زیادہ بے آب و خشک زمین پر بادل سے برسے۔ بالفاظ دیگر یہ دوسرا عامل ایک ایسی قدرت ہے کہ جو "انا ربکم الاعلیٰ" کہنے والے فراعین و نماردید کے مقابلے میں اور ان مغروروں، ستمگروں اور خونخواروں کے مقابلہ میں کہ جن کی تلواروں سے خون ٹپکتا ہے، آتش جنگ روشن کرتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: **"افضل الاعمال (افضل الجهاد) كلمة عدل عند امام جائر"۔**

۱۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس طرح کے قیام تاریکی میں، بجلی کی ایک لپک ہیں، سکوت، استبداد اور ظلم کے درمیان ایک مقدس شعلہ ہیں، ایک ایسا ستارہ ہیں جو شب کی تاریکی میں بھٹکے ہوؤں کو راہ بتلانے کیلئے طلوع ہوا ہے۔ ایسے قیام مظہر عشق ہوتے ہیں اور عام معاشی حساب گروں کی عقل میں نہیں سما سکتے۔

''افضل ترین اعمال (یا افضل ترین جہاد) جائر و ظالم حاکم کے سامنے حق کی بات کرنا ہے''۔

جس ماحول میں آزادی ہو' وہاں پر آزادی کی بات کرنا کوئی کمال نہیں۔ لیکن جس ماحول میں ظلم و ستم کی قدرت اور حکومت ہو' جہاں انسانی نفوس سینوں میں محبوس ہوں' گُدّی سے زبانیں نکالی جارہی ہوں' ہاتھ اور پاؤں کاٹے جارہے ہوں' سروں کو نیزوں پر بلند کیا جارہا ہو' مطلق یأس چھائی ہوئی ہو اور بہ تعبیر امیرالمومنینؑ :''یظن الظّان الدنیا معقولة علی بنی امیه''۔ ''بنی امیہ کے مظالم نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا ہے کہ بعض لوگ خیال کررہے ہیں کہ دنیا بنوامیہ کے دامن سے باندھ دی گئی ہے'' ایک ایسے ماحول میں آزادی کا دم بھرنا ہنر کی بات ہے۔ امیرالمومنینؑ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۹۳ میں فرماتے ہیں :

''الا وان اخوف الفتن عندی علیکم فتنة بنی امیة. فانها فتنة عَمیاءُ مظلمة: عمت خطتها' وخصت بلیتها' واصاب البلاءُ من ابصر فیها 'واخطاالبلاء من عمی عنها. وایم الله لتجدن بنی امیة لکم ارباب سوءٍ بعدی کالناب الضروس: تعذم بفیها' وتخبط بیدها' وتزبن برجلها' وتمنع درها'لایزالون بکم حتی لا یترکوا منکم الا نافعا لهم او غیر ضائربهم' ولایزال بلاؤهم عنکم حتی لایکون انتصار احدکم منهم الا کانتصار العبد من ربه''.

''یادرکھو میری نگاہ میں سب سے خوفناک فتنہ بنوامیہ کا ہے جو خود بھی اندھا ہوگا اور دوسروں کو بھی اندھیرے میں رکھے گا۔ اس کے خطوط عام ہوں گے لیکن اس کی بلا خاص لوگوں کے لئے ہوگی جو اس فتنہ میں آنکھ

کھولے ہوں گے، ورنہ اندھوں کے پاس سے تو یہ بآسانی گزر جائے گا۔
خدا کی قسم! تم بنو امیہ کو میرے بعد بدترین صاحبان اقتدار پاؤ گے جن کی مثال اس کاٹنے والی اونٹنی کی سی ہو گی جو منہ سے کاٹے گی، ہاتھ مارے گی یا پاؤں چلائے گی مگر دودھ نہ دوہنے دے گی۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی برقرار رہے گا، جس سے صرف وہ افراد بچیں گے جو ان کے حق میں مفید ہوں یا کم از کم نقصان دہ نہ ہوں۔ یہ مصیبت تمھیں اسی طرح گھیرے رہے گی یہاں تک کہ تمہاری داد خواہی ایسی ہی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام اپنے آقا سے انصاف کا تقاضا کرے"۔

بنابر این کسی قیام کی قدر و قیمت، اس کی شہامت کے پہلو میں ہے اور جلاّدوں، ستمگروں، فراعین و نماردیو کو حقارت کی نظر سے دیکھنے میں ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور رسول اکرمؐ کے قیام ان شر و فساد پھیلانے والے حاکموں کی قدرتوں کے مقابلہ میں تھے۔ وہاں غیر مساوی حالات تھے مگر ان برگزیدہ ہستیوں نے تن تنہا قیام کیا اور کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله "اکثر چھوٹے چھوٹے گروہ بڑی بڑی جماعتوں پر حکم خدا سے غالب آجاتے ہیں" (سورۂ بقرہ: ۲۴۹) کے مصداق بنے۔ یہ سب چیزیں قیام کو قدر و قیمت دیتی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ کچھ لوگ جیسے کتاب "شہید جاوید" کے مصنف نے قیام امام حسینؑ کو موجہ بتایا ہے اور کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اہل کوفہ قدرتمند اور قابل اعتماد تھے جس کی بناء پر آپ نے اُنپر اعتماد کر کے قیام کیا۔ جبکہ قیام حسینی کی عظمت اس میں ہے کہ امامؑ نے یکہ و تنہا قیام کیا لیکن اس کی روحی اور فکری روش ایسی تھی کہ اس وقت کی دنیا کو ہلا کر

رکھ دیا اور اس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔

۳۔ تیسرا عامل روشن بینی ' اجتماعی آگاہی ' جہت شناسی اور آزمودہ کاری کے مرتبہ سے مربوط ہے۔ ایک ہوشیار ڈاکٹر کے مانند جو بیماری کی بھی شناخت رکھتا ہے اور اس کا علاج بھی جانتا ہے ' مقدس نہضتوں کے سالار ملت کے خواب کے نوع کو بھی جانتے ہیں اور ان کو بیدار کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نہضت ایک بینش ' درکِ قوی ' فوق العادہ بصیرت اور بہت زیادہ دور بینی کے ساتھ ہے (اس معروف مثل کے مانند کہ وہ اینٹ میں اس چیز کو دیکھ لیتے ہیں جو دوسرے آئینہ میں نہیں دیکھ پاتے)۔ ایک اصطلاح میں اس کو قیامِ پیش رس (نہ کہ زودرس) کہتے ہیں یعنی آنے والے خطرہ کی علامات کو بھانپ لینا اس سے قبل کہ دوسرے اس خطرے کا احساس کریں۔

یہاں نفس مطلب یہ ہے کہ بنو امیہ نے ان دنوں ایک چال پس پردہ چھپا رکھی تھی۔ امام حسینؑ نے اس جریان کی طرف توجہ فرمائی اور اس کو سامنے لا کر بے نقاب کیا۔ حتیٰ کہ یزید کا شراب پینا بھی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا جو بعد میں پردہ چاک کر کے سامنے آگیا۔ ابو سفیان نے حضرت عثمانؓ کے گھر پر ایک فوق العادہ خطرناک سیاسی فکر دی تھی ' اس نے کہا تھا :

"یابنی امیة تلقفوها تلقف الکرة و لتصیرن الی اولادکم وراثةً"

"اے بنو امیہ اسے (خلافت کو) اٹھالو اس طرح کہ جسطرح سے گیند اٹھاتے ہیں اور اسے اپنی اولاد میں وراثت قرار دے دو"۔ ظاہراً اس کا نظریہ یہ تھا کہ دین کی آڑ لیکر اور احادیث جعل کر کے خلافت کو موروثی قرار دے دے۔

اور امام حسینؑ کا یہ فرمان : وعلی اما والذی یحلف به ابوسفیان ......

الاسلام السلام اذ قد بلیت الامۃ براع مثل یزید بتایا ہے کہ آپؑ نے شاید ابو سفیان کی فکر کو عملی جامہ پہنتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

امام حسینؑ اپنے کام کے اثر پر ایمان رکھتے تھے اور بار بار فرماتے تھے:

''میرے بعد یہ لوگ سرنگون ہونگے''۔

یہ امامؑ عالی مقام کے درک قوی کی ایک اور دلیل ہے۔

سید الشہداء کا لقب

پہلے ”سید الشہداء“ رسول اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا لقب تھا۔ بعد میں یہ لقب اباعبداللہؑ کیلئے مختص ہو گیا۔ اباعبداللہؑ کی شہادت حضرت حمزہؓ کی شہادت کو بھلا دیتی ہے۔ اباعبداللہؑ کے اصحاب کی ہیئت ایسی تھی کہ وہ پہلے کے تمام شہداء سے سبقت لے گئے۔ خود اباعبداللہؑ نے فرمایا:

”انی لا اعلم اصحاباً اوفیٰ ولا خیراً من اصحابی ولا اھل بیت اوصل ولا افضل من اھل بیتی“۔

”میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اور نیک خصلت اصحاب کو نہیں جانتا اور اپنے اہلبیتؑ سے زیادہ ہمدرد اور افضل اہلبیتؑ کو نہیں جانتا“۔

امام حسینؑ کے اصحاب وہ تھے جو دوست کی طرف سے بھی آزاد تھے اور دشمن کی طرف سے بھی۔

خود امامؑ نے فرمایا:

”ان لوگوں کو میرے علاوہ کسی اور سے کچھ غرض نہیں“۔

خود آپؑ نے ان سب کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ فرمایا:

”رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جاؤ“۔

آپؑ نے اپنے سر کو بھی نیچے کر لیا تھا تا کہ آپؑ کا دیکھنا کسی کے لئے مروت و حیاء کا سبب نہ بنے۔ بنا بر این اصحابِ امامؑ نہ دشمن کی تنگی میں گرفتار تھے جیسے طارق بن زیاد کے اصحاب کہ طارق نے کشتیوں اور ایک دن سے زیادہ خوراک کے علاوہ سب کچھ جلا دیا تھا، نہ دوست نے ان سے کوئی خواہش اور التماس کی تھی اور نہ ہی وہ مروّت کی وجہ سے رُکے تھے۔ حتیٰ اس خیال سے کہ شاید ان کی طرف نگاہ کرنا ان

کے فیصلے پر اثر انداز ہو، آپؑ نے اس سے بھی اجتناب کیا[۱]۔

اصحابِ امام حسینؑ اور اہل بدر و صفین

گزشتہ مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب امام حسینؑ، پیغمبر اکرمؐ کے اہل بدر اور حضرت علیؑ کے اہل صفین سے افضل تھے۔ اسی طرح عمر سعد کے اصحاب بھی ابو سفیان کے بدر والوں اور معاویہ کے صفین والوں سے شقاوت میں برتری رکھتے تھے۔ کیونکہ عمر سعد کے اصحاب ابو سفیان کے بدریوں کی طرح عقیدہ اور عادت کے تحت جنگ نہیں کر رہے تھے اور معاویہ کے صفینیوں کی طرح قتل عثمان جیسا کوئی مسئلہ بھی پیش نہیں آیا تھا کہ جس سے لوگ اشتباہ میں پڑے ہوں۔ یہ لوگ ایک ایسی حالت میں جنایت کے مرتکب ہوئے کہ دل کی ندا اور ضمیر کی فریاد ان کے عمل کے خلاف تھی: قلوبهم معك وسيوفهم عليك. "ان کے دل آپ کے ساتھ تھے مگر ان کی تلواریں آپ کے خلاف تھیں" یہ لوگ روتے بھی تھے اور قتل کا حکم بھی دیتے تھے۔ آنسو بھی بہاتے تھے اور حسینؑ کے بچوں کے کانوں سے گوشوارے بھی چھینتے تھے۔ لرزتے بھی تھے اور حسینؑ کے سر اقدس کو بدن مبارک سے جدا کرنے کا آہنگ بھی رکھتے تھے۔

جہل اور ظلم سے مبارزہ

ہمارے زمانے میں مرض سے مبارزہ، فقر سے مبارزہ اور جہل سے مبارزہ عام اصطلاحیں ہیں اور ان کو مقدس اعمال بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ ان میں سے کوئی بھی

---

[۱] خلاصہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں صدفی صد یہ جملہ جو ظاہراً ابن ابی الحدید سے ہے، صادق آتا ہے "آثروا الموت"۔ امیر المومنینؑ کی ایک معروف حدیث ہے (جو نفس المہموم ص ۱۱۰ پر موجود ہے) مناخ رکاب و مصارع عشاق، شهداء لا يسبقهم من كان قبلهم ولا يلحقهم من بعد هم "یہ سواروں کے اترنے کی جگہ اور عاشقوں کی قتلگاہ ہے، یہ ان شہداء کی جگہ ہے کہ نہ ان سے پہلے والے شہداء ان پر سبقت لے سکے اور نہ آئندہ آنے والے ان کے مقام تک پہنچ سکیں گے"۔

مبارزہ جہل اور ظلم کے ساتھ مبارزہ کی برابری نہیں کرسکتا کہ یہاں پر فداکاری لازم ہے۔ قرآن کریم میں شہداء کو انبیاء اور صدیقین کا ردیف بتایا گیا ہے۔

"ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين و الصديقين و الشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا".

"اور جو بھی اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی فرمانبرداری کرے' وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے نعمت دی ہے' جیسے نبی اور صدیقین اور شہداء اور صالحین' اور یہ بہترین رفیق ہیں"۔ (سورۂ نساء آیت ۶۹)

شہید کیلئے غسل و کفن نہیں' شہداء کا خون پانی سے اولیٰ تر ہے۔

اہلِ کوفہ کیوں امام حسینؑ سے جنگ کرنے نکلے؟

کوفیوں کا امام حسینؑ کی محبت کا دم بھرنے کے باوجود ان سے جنگ کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں پر رعب اور دہشت طاری تھی جو زیاد اور معاویہ کے دور سے چھائی ہوئی تھی۔ خود عبید اللہ نے بھی میثم' رُشَید' مسلم اور ہانی کو شہید کر کے لوگوں کو مرعوب کر رکھا تھا۔ بالفاظ دیگر لوگ مرد و عوزت سب ہی درندگی کا شکار تھے۔ وہ اپنی قوت ارادی کھو چکے تھے اور اپنی عقل کے مطابق کوئی مستحکم فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ واقعۂ کربلا کے ایام میں بھی جو فوجی سستی دکھلاتا یا آہستہ چلتا' اسے قتل کر دیا جاتا۔ اِس سے دوسرے اپنا کام سمجھ گئے۔ کچھ لوگ حرص و طمع' مال اور دنیا کے مقام کے پیچھے تھے' جیسے خود عمر سعد جو اپنے وجدان کے عذاب میں گرفتار تھا: فوالله ما ادری وانی لحائرا فکر فی امری ...... "خدا کی قسم کچھ سمجھ میں نہیں آتا' میں ابھی سرگردان ہوں' بعد میں اپنے کام کے بارے میں سوچوں گا"۔

عبید اللہ بن زیاد نے کوفہ میں داخل ہوتے ہی عرفاء کو بلوایا اور کہا: "اگر

عرفاء میں سے کوئی مخالف ہے تو میں اُس پر اپنی عطا ساقط کروں گا"۔

عامر بن مجمع عبیدی (یا مجمع بن عامر) نے کہا: "اما رؤساؤھم فقد اعظمت رشوتھم وملئت غرائرھم". "لیکن ان کے بزرگوں کو بڑی بڑی رشوتیں ملی ہیں اور ان کی جھولیاں رشوت سے بھر گئی ہیں"۔

دو چیزیں جو حسینؑ کی آنکھوں کی روشنی کا سبب تھیں

ایام کربلا میں اور اس عجیب ابتلاء کے وقت چند چیزیں ایسی تھیں جو ابا عبداللہ کی مصیبتوں میں اضافہ کا سبب ہوئیں۔ ان سب مصائب سے بڑھ کر کچھ پست فطرت اور ناروا باتیں، بے ادبی اور وحشیانہ حرکتیں تھیں جو کوفہ والوں کی طرف سے دیکھنے میں آئیں۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جن سے آپؑ کی آنکھیں روشن اور دل خوش و خرم رہا اور وہ دو آپؑ کے اصحاب اور اہل بیتؑ تھے۔ ان کی وفاداری، جان نثاری اور بے مضائقہ خدمت یا دوسرے الفاظ میں ان لوگوں میں موجود صفا و وفا اور انکی آپؑ کے ساتھ ہمگامی اور ہم آہنگی دیکھ کر آپ کا دل شاد اور خرم تھا۔ (ایک صاحب عقیدہ و ایمان و مسلک شخص کے لئے کوئی بات بھی اتنی خوشی کا باعث نہیں ہوتی جتنی خوشی لوگوں کو ہمگام اور ہم آہنگ دیکھنے میں ہوتی ہے)۔ آپؑ مکرر مختلف مواقع پر تہ دل سے ان کے لئے دعا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؑ کا یہ فرمان کہ: انی لااعلم اصحاباً ابر ولا اھل بیت اوصل ولا اوفیٰ من اصحابی، ...... "میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اور نیک خصلت اصحاب کو نہیں جانتا اور اپنے اہلبیت سے زیادہ ہمدرد اور افضل اہلبیتؑ کو نہیں جانتا" حکایت کرتا ہے کہ ابا عبداللہ ان پر اعتماد کامل رکھتے تھے اور آپؑ کے دل کو خوشی انہی سے حاصل تھی۔

یہ بات مسلّم ہے کہ ابو ثمامہ صائدی کے نماز کے تذکرہ نے کہ ہم آخری نماز آپ کے پیچھے پڑھنا چاہتے ہیں، یقیناً حسینؑ کے دل کو شاد کیا ہوگا کہ آپؑ نے ان

کے حق میں دعا فرمائی۔اس سے بھی بڑھ کر سعید بن عبداللہ حنفی کی عجیب فداکاری اور پھر" أوَفَيتُ "؟(کیا میں نے آپؐ سے وفا کی ؟) کہنے نے امامؑ کے دل کو کس قدر تقویت پہنچائی ہوگی۔

ابا عبداللہؑ نے جن چند افراد کے لئے دعا کی ان میں سب سے زیادہ جانسوز خود اپنے جوان کیلئے تھی۔فرمایا: امید ہے جلد از جلد جدؐ بزرگوار کے ہاتھوں سیراب ہوگے۔شب عاشورا قاسم کے اس جواب نے حسینؑ کے دل کو کتنا شاد اور روشن کیا ہوگا، جب قاسمؑ نے موت کے بارے میں کہا تھا:

"احلی من العسل".

"موت میرے نزدیک، شہد سے زیادہ شیرین ہے"۔

اباعبداللہ نے روز عاشورا کچھ لوگوں کے لئے دعائیں کی تھیں :

۱۔ ابو ثمامہ صائدی

۲۔ حضرت علی اکبرؑ

۳۔ شب عاشورا جب سب نے کہا کہ ہم آپؐ سے جدا نہیں ہونگے تو سب کے لئے دعا کی، فرمایا: جزاکم الله خیراً ."خدا تمہیں جزائے خیر دے"۔

(نفس المہموم ص ۱۲۲)

مصلحین الٰہی کے فلسفۂ قیام کے بارے میں قرآن کا بیان

سورۂ مبارکہ ہود آیات نمبر ۱۱۶ اور ۱۱۷ میں خدا فرماتا ہے :

"فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیّة ینهون عن الفساد فی الارض الاّ قلیلاً ممّن انجینا منهم واتّبع الذین ظلموا ما اترفوا فیه وکانوا مجرمین .وماکان ربّك لیهلك القری بظلم واهلها مصلحون".

"پس تم سے پہلے والے زمانے اور نسلوں کے لوگوں میں سے ایسے صاحبان عقل کیوں نہ پیدا ہوئے جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے' علاوہ ان چند افراد کے جنہیں ہم نے نجات دے دی اور ظالم لوگ تو اپنے عیش کے ہی پیچھے پڑے رہے اور یہ سب کے سب مجرم تھے۔ اور آپ کے رب کا کام یہ نہیں کہ کسی بستی کو ظلم کر کے تباہ کر دے' جبکہ اس کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

قرآن کریم کی اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں آیا کہ جسکی قوم نے اس کی مخالفت نہ کی ہو اور وہ بھی قوم کی مخالفت میں اٹھ کھڑے نہ ہوئے ہوں۔ ایسا نہیں تھا کہ پیغمبر آسمان سے کوئی بات لے کر آئے ہوں اور لوگوں کی نظام زندگی سے غیر مربوط باتیں کی ہوں اور ایسا بھی نہیں تھا کہ کچھ لوگ فقط اس لئے کہ ہر بات کی مخالفت ہو یا مخالفت کرنے کا مرض رکھتے ہوں' اس وجہ سے پیغمبروں کی مخالفت کرتے ہوں۔ خیر ایسا نہیں ہے۔ (ہر چند کہ ہم لوگ عموماً اپنے مطلب کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں اور جب بھی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں آدمی بے جہت اور بغیر کسی علت کے (نہ کہ بغیر حق و عدالت کے) مخالفت کرتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ لوگ تو پیغمبروں کی بھی مخالفت کرتے رہے ہیں۔)

پیغمبرانِ بر حق لوگوں سے مخالفت اور مبارزہ کرنے پر قیام کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ لوگ اِس مخالفت کی علت کے طور پر ایک منطق گھڑ لیا کرتے تھے اور یہ کہ پیغمبروں کی مخالفت کرنے کے لئے تشویق دینے والے اور اِس مخالفت میں کھڑی ہونے والی نہضتوں کے علمدار کچھ خاص لوگ تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو پیغمبروں کی مخالفت نہ کرنے والے عام لوگوں کے ذہنوں کو تشویش میں ڈالکر پریشان کرنے کے لئے کوئی منطق وضع کر لیتے تھے' قرآن

کریم نے ان سب باتوں کو ذکر کیا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اس مخالفت کی اصل وجہ عیّاشوں کا عیش یا بالفاظ دیگر زندگی میں موجود ظالمانہ نظام ہے۔ سورۂ سبا آیت ۳۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"وما ارسلنا فی قریة من نذیر الا قال مترفوها انّا بما اُرسلتم به کافرون"۔

"اور ہم نے تو جس بستی میں جو بھی آگاہ کرنے والا بھیجا، وہاں کے عیش و عشرت میں پڑے (آسودہ حال) لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں"۔

سورۂ زخرف آیت نمبر ۲۳:

"و کذٰلك ماارسلنا من قبلك فی قریة من نذیر الاّ مترفوها انّا وجدنا آباء نا علی اُمّة وانّا علی آثارهم مقتدون ـ قال: اولو جئتکم باهدیٰ ممّا وجدتم علیه آباء کم قالو انّا بما ارسلتم به کافرون"۔

"اسی طرح آپ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے عیش و عشرت میں پڑے (آسودہ حال) لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم تو انہی کی پیروی کرنے والے ہیں، کہا اگرچہ میں تمہارے پاس اس سے بہتر طریقہ لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے منکر ہیں جسے دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے"۔

اس آخری آیت میں خاتم الانبیاء کی ابتلاء کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ یہ ابتلاء عمومیت رکھتی تھی اور ان سب کا درد، عیش و عشرت، اسراف اور ظالمانہ وضع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ انکی یہ بات کہ ہمارے باپ دادا ایسے تھے، اپنی اسی عیش

وعشرت کی حمایت کے لئے خود تراشیدہ منطق ہے تاکہ عیش وعشرت سے محروم، جو بے چارہ اور ضعیف ہیں اور جن کے نجات کے لئے یہ جدید دعوت آئی ہے، ان کو فکری لحاظ سے گمراہ کریں اور ان کی فکر میں یہ بات ڈال دیں کہ ماضی کی سُنتیں لازم الاحترام ہیں۔ اگر ان کا ہدف یہ نہ ہوتا تو وہ خود ان سُنتوں سے ذرّہ برابر بھی لگاؤ نہ رکھتے۔

قریش کے رؤسا پیغمبر اکرمؐ پر اشکال کرتے تھے کہ کیوں کھانا کھاتے ہیں، کیوں راہ چلتے ہیں، کیوں ان کے پاس سونے کا کوئی خزانہ اور میوے کا کوئی باغ نہیں ہے؟۔ آیا واقعاً ابو سفیان اور ابو جہل جیسے لوگ شک و شبہ میں گرفتار تھے اور اپنے شک کا اظہار کرنے کے لئے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے یا پھر وہ دوسروں کو شک میں ڈالنے کے لئے ایسی باتیں کرتے تھے؟ کیا وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کو پیغمبر مانتے تھے، اس بات کے معتقد تھے کہ ابراہیمؑ کچھ نہیں کھاتے تھے اور لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے نہ تھے اور سونے کا ذخیرہ اور میوہ کا کوئی باغ رکھتے تھے؟، یہ سب باتیں مستضعفین کو فریب دینے کا بہانہ تھا۔

بہر حال قرآن کریم پیغمبروں کا ہدف اور مقصد، معاشرہ میں عدالت کا قیام بتلاتا ہے۔

”لقد ارسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط“۔

”یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں“۔

(سورۂ الحدید آیت ۲۵)

جب انبیاء ایسا ہدف و مقصد رکھتے تھے تو وہ لوگ جو اجتماعی عدالت کو نیست و نابود کرنا اور اجتماع کو اپنے مکر و فریب میں رکھنا چاہتے تھے یقیناً مخالفت کریں گے

اور یہی ابو سفیان جیسے لوگوں کی پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کرنے کی سب سے بڑی علت ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ خود آپس میں بھی ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ قریش کے بزرگوں کی پیغمبر اکرمؐ سے مخالفت کرنے کی اصل بنیاد وہی ہے کہ جس بنیاد پر فرعون نے موسیٰؑ کی، نمرود نے ابراہیمؑ کی اور ہر پیغمبر کی قوم اس پیغمبر کی مخالفت کی تھی۔

آیہ :"فلولا کان من القرون من قبلکم ......"(سورۂ ہود :۱۱۶) سے چند مطالب کا استفادہ ہوتا ہے :

۱۔ روئے زمین پر فساد پھیلانے سے روکنا اور فسادیوں سے مبارزہ کرنا واجب ہے۔
۲۔ یہ کہ تعداد میں کم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔
۳۔ فساد کی علتوں کی علتِ غائی عیش و عشرت ہے۔
۴۔ کسی ملت کی بقا کی محافظ عدل ہے۔ ملک کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتا ہے لیکن اگر اس میں عدالت نہ ہو تو وہ باقی نہیں رہتا۔

بیضاوی اس آیت میں "اولوا بقیةٍ" (سورۂ ہود آیت نمبر ۱۱۶) کے معنی "اولوا بقیة من الرّای والعقل یا الوالفضل ویا اُولُوا الابقاء(یعنی وہ لوگ جو اپنے نفوس سے ابقاء کرتے ہیں (باقی رہتے ہیں) بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعد والی آیت "وما کان ربك لیُهلك القری بظلم......""آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کردے"(سورۂ ہود : ۱۱۷) میں بِظُلمٍ سے مراد شرک ہے۔ پس پوری آیت کے معنی یہ ہونگے کہ پروردگار عالم کسی بستی کو شرک کی بدولت ہلاک نہیں کرتا، اگر وہاں کے لوگ اصلاح کرنے والے اور عدالت کے پاسبان رہیں۔

شہرستانی کا کلام اس بابت کہ تمام حوادث کے بیج قرن اول میں بوئے گئے۔

صاحبِ کتاب ''سمّوا المعنی'' (عبداللہ علائلی) صفحہ ۵ پر شہرستانی کی ''ملل و نحل'' سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے :

''کُلُّ التبلیلات التی مرت بالتاریخ الاسلامی سواء فی العقیدۃ اَو السیاسۃ یمکننا أن نحدلھا مرتجعاً و مرداً فی حوادث صدر التاریخ''۔

''تمام مشکلات اور گرفتاریاں جو تاریخ اسلام پر گزر گئی ہیں، عقیدہ میں ہوں یا سیاست میں، ہمیں ان سب کا سرچشمہ صدر تاریخ کے حوادث میں ڈھونڈنا چاہیے۔''

مرد بزرگ کون ہے ؟

تاریخ کی بزرگ شخصیتیں، عظمت اور بزرگی :

افراد کی عظمت اور بزرگی کی پیمائش کا پیمانہ انکی روحانی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ افراد کی عظمت کی پیمائش کا ذریعہ ان کا جسمانی یا نسلی امتیاز نہیں ہوتا۔ ہمیں تاریخ میں ایسے افراد اور اشخاص ملتے ہیں جن کا تاریخ کے برجستہ افراد میں شمار ہوتا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں یہ نمایاں ہوتے ہیں اور روئے زمین پر پہاڑ کی چوٹیوں کی مانند بلندی رکھتے ہیں، جبکہ انکے مقابل دوسرے تمام افراد کنکریوں کی طرح شمار ہوتے ہیں۔ انسان ہر نقطہ سے بالخصوص اگر اس بلندی پر کھڑا ہو کر دیکھے تو بعض اسقدر ریزہ ریزہ اور چھوٹے ہیں کہ اصلاً دکھائی ہی نہیں دیتے۔

مثلاً سکندر، نپولین، نادر شاہ، شاہ اسماعیل اور ان جیسے لوگ تاریخ کے بزرگ اور برجستہ افراد ہیں۔ اسی طرح انبیائے بزرگ اور اولیائے بزرگ الٰہی بھی، جیسے ابراہیمؑ، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور محمدؐ و علیؑ تاریخ کی برجستہ اور بشریت کی بزرگ ہستیاں ہیں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ آیا پہلے گروہ کی بزرگی اور دوسرے گروہ کی بزرگی باہم قابل پیمائش ہے یا نہیں ؟ ہرگز نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گروہ اول کے لوگ اس جہت

سے عظیم ہیں کہ وہ بڑے ہمت والے اور قوی الارادہ تھے لیکن ان کی آرزوں اور خواہشات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا اور وہ کسی کم اور چھوٹی چیز پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ جب انسان ان میں سے بعض کی ہمت اور دلاوری کے بارے میں پڑھتا ہے تو ان کی عظمت و بزرگی کے سامنے اسکی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی تعظیم کے لئے سر بھی خم کر دیتا ہے اور اپنے دل میں ان کے لئے ایک قسم کی محبت کا احساس کرتا ہے (فردوسی کے شاہنامہ سے نفوسِ انسانی میں جو اثر پیدا ہوتا ہے' وہ اسی قسم کا ہے)۔ لیکن دوسرے دستہ کی بزرگی اور عظمت ایک دوسری نوع اور جنس ہے۔ یہ ایسی بزرگی ہے جو پاک و پاکیزہ مقام پیدا کرتی ہے' یہاں تک کہ خود ان کے نام بھی مقدس ہو جاتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں محمدؐ' علیؑ' حسینؑ مقدس نام ہیں۔ اسی طرح ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے ناموں کو بھی پاکیزہ گی کے ایک دائرہ نے احاطہ کیا ہوا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ یہ صحیح ہے کہ دستۂ اول بزرگ اور عظیم ہے لیکن ان کی عظمت اور درشتی ایک طرح سے خود خواہی اور خود پرستی کی عظمت و بزرگی ہے۔ وہ سب ایک بڑے درندے اور بڑے حیوان ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک آدمی بہت خوش خوراک ہے یہانتک کہ دس آدمیوں کے برابر کھاتا ہے' لیکن اس پر انسان کبھی تعجب کرتا ہے اور کبھی کبھی آفرین بھی کہہ دیتا ہے۔ کوئی چھوٹی چیز کھانے والا ہے اور کوئی بڑی چیز۔ کوئی کسی چھوٹی ریاست کا طالب ہے اور کوئی بڑی ریاست کی طلب رکھتا ہے۔ مثلاً ایک دس گھرانوں پر مشتمل دیہات کے مالک یا سربراہ کی فکر اور آرزو ان دس گھروں کی کدخدائی (مالکیت) ہے' یہ ایک چھوٹا جاہ طلب ہے۔ جس شخص کی کدخدائی (مالکیت) ہزار خانوادوں پر مشتمل قصبہ پر ہے' اُس کی نوعیت بھی یہی ہے لیکن وہ زیادہ تند خو ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی شہر یا کسی صوبہ یا کسی ملک کی حکومت کے پیچھے ہو' اسی نسبت سے وہ اور بڑا جاہ

طلب ہے۔ اور وہ شخص جس کے سر میں ساری دنیا کا حصول اور جہاں داری کا سودا ہو' وہ ان سب سے زیادہ اور بہت بڑا جاہ طلب انسان ہے۔ ان سب کی شخصیت عظیم ہے لیکن ان کی یہ عظمت' ان کی خود خواہی میں مضمر ہے۔ یہ عظیم درندے' عظیم جاہ طلب اور عظیم صاحبان استحصال ہیں۔ انہوں نے وسعت روح اور شخصیت کی توانائی تو پیدا کر لی لیکن یہ روح و شخصیت کی وسعت ذاتی حوائج کے لئے ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ساری دنیا کو ہڑپ کر لیں۔ یہ زمانے کے شکم پرست لوگ ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا کو خود کا جزء (حصہ) بنالیں۔ دنیا کی تمام شخضیتوں کو مٹادیں سوائے اپنی اور اپنے طفیلی شخصیتوں کے' یعنی وہ شخصیتیں جو ان کا جزء بن چکی ہیں اور جنکی شخصیت کو یہ نگل گئے ہیں۔ پس یہ لوگ بزرگ ہیں اور فعال بھی' لیکن سرطان کے غدود کی طرح ایک بے تناسب سلول (cellule) کے ساتھ بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں اور یہی ان شخصیتوں کا مقصد ہے۔ اور یہ سرطان ان کے بدن کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ اسکے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے اندر وسعت شخصیت پیدا کرتا ہے۔ جس طرح ماں وسعت شخصیت پیدا کرتی ہے تاکہ اس کا فرزند اور اس کی شخصیت' مستقل' محفوظ اور محترم ہو جائے' وہ اس کی شخصیت کے لئے اسی طرح کام کرتی ہے' گویا وہ اپنے لئے کرتی ہے' وہ یہ نہیں چاہتی کہ ان شخصیتوں کو اپنے اندر ہضم کر لے بلکہ چاہتی ہے کہ ان کی حفاظت کرے اور انہیں مستقل و محترم شمار کرے۔ اس دوسرے گروہ کے لوگ سرطان کے غدود کی طرح نہیں ہوتے بلکہ ایک روح قوی کی منزلت رکھتے ہیں جنکے پیکر میں اجتماع دوڑ رہا ہوتا ہے اور وہ سبکو زندہ اور فعال بنائے رکھتے ہیں۔ وہ اس کے مصداق نہیں: من اَصبحَ ولم یهتمَّ بامور المسلمین فلیس بمسلم"۔ (جس نے صبح کی لیکن مسلمانوں کے امور کا اہتمام نہ کیا' پس وہ مسلمان نہیں)۔ انہوں نے اپنی انسانی

شخصیت کو بڑھا کر روح بشری میں وسعت پیدا کرلی ہوتی ہے، نہ کہ حیوانی پہلو میں۔ وہ اپنے وجدان اور ایمان میں وسعت پیدا کر لیتے ہیں۔ مولوی کے بقول :

روح حیوانی ندارد اتحاد تو مجو این اتحاد از روح باد

گر خورد این نان نگردد سیر آن ور کشد بار این نگردد آن گران

حیوان کی روح اتحاد نہیں رکھتی، تُو ہوا میں اس اتحاد کو مت تلاش کر۔

یہ اگر نان کھالے تو بھی سیر نہیں ہوتا۔ اگر اسے بوجھ کھینچنا پڑے تو یہ اس کے لئے گراں نہیں ہوتا۔ (حیوان جو ٹھہرا)

ہم آج کیوں حسینؑ پر فدا ہو رہے ہیں؟ اسلئے کہ جس کیلئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا "حسین منی و انا من الحسین"، ہم سب آج اپنے اندر اس چیز کا احساس کر رہے ہیں۔ یعنی ہم حسینؑ کو خود سے اور خود اپنے آپ کو حسینؑ سے جدا نہیں دیکھتے۔ ہم حسینؑ کو ایک ایسا شخص نہیں سمجھتے جو اپنے شخصی تقاضوں کے انجام دینے کی فکر میں ہو، ہم ان کو ایک کُلّی روح سمجھتے ہیں جو قبل از وقت ہمارے فکر مند تھے۔ پس وہ ہم سے ہیں اور ہم ان سے۔ وہ بشریت سے ہیں اور بشریت ان سے ہے۔ وہ ہماری روح میں اور ہماری سر نوشت کے ساتھ آمیختہ ہیں۔ ہم انؑ سے ہیں اور وہ ہم سے ہیں۔

ان کی شخصیت کا (توسعہ) وسعت وہی تھا جو توسعہ علیؑ رکھتے تھے۔ آپؑ فرماتے تھے :

"وحسبُك داءً ان تبیت ببطنة وحولك اكبادٌ تحنّ الى القد".

"تمہارے لئے یہی درد کافی ہے کہ سیر ہو کے سو جاؤ اور تمہارے اطراف میں لوگ تشنہ جگر رہ جائیں"۔

یا فرماتے تھے :

"وهذا اخو غامدٍ وقد ورد خيله الانبار...... ولو ان امرء مسلماً

مات علیٰ ھذا اسفاً......"۔

"دیکھو صفیان بن عوف غامدی کی فوج "انبار میں داخل ہو گئی ہے اور اس نے حسان ابن حسان بکری کو قتل کر دیا ہے اور تمہارے سپاہیوں کو ان کے مراکز سے نکل باہر کر دیا ہے۔ اور مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ دشمن کا ایک ایک سپاہی مسلمان یا مسلمانوں کے معاہدہ میں رہنے والی عورت کے پاس وارد ہوتا تھا اور اسکے پیروں کے کڑے، ہاتھ کے کنگن، گلے کے گلوبند اور کان کے گوشوارے اتار لیتا تھا۔ وہ سوائے اناللہ پڑھنے اور رحم و کرم کی درخواست کرنے کے، کچھ نہیں کر سکتی تھی اور وہ سارا سازوسامان لے کر چلا جاتا تھا نہ کوئی زخم کھاتا تھا اور نہ کسی کا خون بہتا تھا ۔اس صورتحال کے بعد اگر کوئی فرد مسلمان صدمے سے مر بھی جائے تو قابلِ ملامت نہیں ہے"۔ (خطبہ نمبر ۲۷)

شخصیت کا توسعہ یہ ہے کہ واقعاً انسان کہہ اٹھے:

من از بینوائی نیم روی زرد   غم بینوایان رُخم زرد کرد

(میرا چہرہ بینوائی کی وجہ سے زرد نہیں ہوا بلکہ بینوا لوگوں کے دئے ہوئے غم نے میرا چہرہ زرد کر دیا ہے)

توسعۂ شخصیت یہ ہے جو امام حسینؑ نے فرمایا:

انی لم اخرج اشراً ولا بطراً "میں فسا پھیلانے یا دولت خواہی کیلئے نہیں نکل رہا ہوں"۔

یا یہ فرمایا: **من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحُرم الله**

"اگر کوئی حاکم کو حرام خدا کی حلال کرتا دیکھے......"

----☆----☆----☆----

کربلا کی تمام مصیبتیں اس لئے تھیں کہ امام نے اپنی رائے کا سودا نہیں کیا

معاویہ کے مرنے سے قبل اور اسی طرح اس کے مرنے کے بعد یعنی یزید کے دور میں ان لوگوں کا امامؑ سے بس ایک ہی تقاضا تھا۔ جب حسینؑ مدینہ میں تھے یا جب مکہ آئے، اسی طرح راستے میں اور کربلا میں وہ لوگ امامؑ سے صرف ایک امتیاز کے طلبگار تھے۔ اگر امامؑ یہ ایک امتیاز ان کو دیدیتے تو پھر ان لوگوں کو امامؑ کے کسی کام سے غرض کوئی نہ تھی اور اس پر وہ امامؑ کو انعامات بھی دیتے۔ امامؑ نے بھی یہ جو اتنی رنج و مصیبتیں برداشت کیں، اپنا اور اپنے عزیز و اقارب کا تن شہادت کی راہ میں دیدیا، یہ سب اس لئے تھا کہ اس ایک امتیاز کو نہ دیں۔ وہ ایک امتیاز اپنے عقیدہ اور رائے کو فروخت کرنا تھا۔ اُس زمانے میں آجکل کی طرح سے انتخابات یا حق رائے دہی کے لئے صندوق نہیں تھے ہوا کرتے تھے بلکہ بیعت ہوتی تھی۔ اُس زمانے کی بیعت آجکل کی رائے دہی تھی۔ پس امامؑ اگر ایک غیر وجدانی اور غیر شرعی رائے دے دیتے تو شہید نہ ہوتے۔ امامؑ شہید اسلئے ہوئے تاکہ اپنی رائے اور اپنا عقیدہ فروخت نہ کریں۔

کربلا بشر کی معنویت و روحانیت کی نمائشگاہ تھی نہ کہ جنایت کی

ہمارے زمانے میں یہ معمول ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک صنعتی نمائش لگاتے ہیں اور کبھی تو بین الاقوامی صنعتی نمائش کا اہتمام کرتے ہیں۔ ظاہراً ۱۰ سال میں ایک بار تمام دنیا ایک نمائشگاہ ترتیب دیتی ہے۔ کہتے ہیں ایفل ٹاور EIFEL TOWER ایک نمائشگاہ کی یادگار ہے جو ساٹھ سال پہلے بنایا گیا تھا۔ تین چار سال پہلے برسلز-BRUS

(SELES میں بھی ایک نمائش لگی تھی جس میں مشرق و مغرب کے تمام ممالک نے شرکت کی تھی اور تمام دنیا سے لوگ وہاں جمع ہوئے تھے۔ ان نمائشوں کا مقصد بشر کی فکری اور عملی محصولات (کارکردگی سے حاصل کردہ نتائج) کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہاں جا کر انسان بشر کی فکر کی عظمت و فعالیت اور ہنر نمائی کے درجہ کو سمجھ پاتا ہے۔ وہاں پر ہر نوع کی چیزیں، سوئی سے لیکر عظیم کارخانوں کے نمونے لا کر دکھائے جاتے ہیں۔ ہم سانحۂ کربلا کو بھی ایک نمائشگاہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن علم و صنعت کی نہیں بلکہ معنویت اور معرفت کی نمائشگاہ۔ اس نمائشگاہ میں ناظر بشر کی اخلاقی قدرت، روحی اور معنوی قدرت کی عظمت کی تہ تک پہنچ سکتا ہے اور یہ سمجھ سکتا ہے کہ بشر کس حد تک درگذشت کرنے والا، فداکار، آزاد، خداپرست، حق خواہ اور حق پرست ہو سکتا ہے۔ اور کس قدر صبر و رضا، تسلیم و شجاعت، مروّت و کرم اور بزرگواری کے معانی کے ظہور اور نمود کی قدرت رکھتا ہے۔

عام طور پر اہل منبر جب چاہتے ہیں کہ کربلا کے قضیہ کو بڑا بنا کر پیش کریں تو مصیبتوں اور ظلم و ستم کے پہلو کو بڑا کر کے پیش کرتے ہیں۔ مصیبتوں کے پیدا کرنے، حتیٰ جعل کرنے کی جستجو میں بھی لگے رہتے ہیں۔ اپنے بیانات اور تشبیہات میں مصیبتوں کو مختلف زاویوں سے مجسم کر کے 'اس واقعہ کے فاجعہ (غم انگیز واقعہ) ہونے کو تقویت دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ حادثۂ کربلا کی بزرگی کس نظر سے ہے؟ آیا اس کی بزرگی فجیع ہونے کے حوالے سے ہے؟ قطعی طور پر یہ فاجعہ ایسا ہے کہ اسکی نظیر کم ہے۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی نے کتاب ''الآثار الباقیہ'' میں ''نفس المہموم'' سے اسی بات کو نقل کیا ہے اور اسی طرح دوسرں نے بھی یہ بات کہی ہے۔ لیکن دنیا میں اس فاجعہ سے عظیم بلکہ شاید عظیم تر فاجعہ زیادہ ہوئے ہیں۔ خود مدینہ کا فاجعہ کربلا کے فاجعہ سے کمتر نہیں تھا۔

واقعۂ کربلا کی عظمت سید الشہداء اور آپؑ کے یاران کے لحاظ سے ہے' نہ کہ ابن زیاد وابن سعد اور ان کے تابعین کے لحاظ سے۔ یہاں سعادت کی عظمت مراد ہے' نہ شقاوت کی عظمت۔ کربلا جہاں بشر کی شقاوت 'بدی اور پلیدی کے اظہار کی ایک نمائشگاہ ہے' اس سے کہیں زیادہ روحانیت' معنویت اعلیٰ اخلاق اور انسانیت کی نمائشگاہ ہے۔ لیکن اہل منبر اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہمیں اس واقعہ کو اس پہلو سے دیکھنا چاہئے کہ ابا عبداللہؑ 'اباالفضلؑ اور حضرت زینبؑ اس داستان کے قہرمان ہیں' اس جہت سے نہ دیکھیں کہ شمر اور سنان اس داستان کے قہرمان ہیں۔

کیوں "حُر" نے اپنی روحی کیفیت کو تغیر بخشا؟

کہا گیا ہے کہ جناب "حُر" کی حضرت سید الشہداءؑ سے گرویدگی کی ایک علت یہ تھی کہ وہ زیادہ مدت تک آپؑ کے ہمراہ رہے تھے اور آپ کو نزدیک سے جانتے تھے۔

اصحاب حسینؑ میں سے کوئی بھی دشمن کی پناہ میں نہیں گیا بلکہ دشمن کے لشکر کے افراد اپنے ساتھ ملحق کئے

نہضت حسینی کے کمال اور قوت کا ایک مظہر یہ حقیقت ہے کہ تمامتر ظلم اور رنج و مصیبت میں رہ کر بھی کوئی ایک فرد بھی دشمن سے نہیں جاملا۔ اسکے بر خلاف لشکرِ غالب سے جناب حُر اور دوسرے تیس (۳۰) افراد کے دل اپنی طرف کھینچ لئے۔ اباعبداللہؑ اصرار کرتے رہے کہ جو جانا چاہے چلا جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؑ چاہتے تھے کہ آپ کی نمائشگاہ کامل ہو اور آپؑ کے اصحابؓ کے درمیان کسی قسم کے ضعف کا وجود نہ ہو تاکہ مشکل کے موقع پر سستی کا مظاہرہ نہ ہو۔

جنگ بدر اور صفین میں ایسی صورت (مشکل کے وقت سستی دکھانا) زیادہ

عیب شمار نہیں ہوتی تھی لیکن کربلا میں یہ عیب شمار کیا جاتا تھا کیونکہ کربلا کی بنیاد خود فراموشی اور فداکاری پر تھی۔ معمول یہ ہے کہ غالب مغلوب کا دل چھین لیتا ہے' نہ کہ مغلوب غالب کا اور یہاں روح کے لحاظ سے یہ لوگ (کاروانِ حسینیؑ) غالب تھے اور اس لحاظ سے وہ لوگ (لشکرِ عمر سعد) شکست خوردہ' مغلوب اور ان کے زیر اثر قرار پاتے ہیں۔

شہادت سید الشہداءؑ کا سب سے زیادہ دردناک پہلو

شہادت سید الشہداءؑ کا ایک پہلو سب سے زیادہ دردناک ہے اور لوگ اس کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ وہ موضوع "یتقربون الی اللہ بدمہ" ہے۔ وہ لوگ امام حسینؑ کا خون بہا کر قرب الٰہی حاصل کرنا چاہتے تھے اور اسی حوالے سے انہوں نے سید الشہداءؑ کے قتل کا دینی جواز بنایا تھا۔ بڑا فرق ہے اس بات میں کہ بھیڑیا کسی گوسفند کو کھا جائے اور اسمیں کہ کھا جائے اور لوگ اس عمل کو قربۃً الی اللہ قرار دے دیں اور دوسرے کے عمل کو مصالح ملی کے خلاف قیام اور ملت سے خیانت گردانیں۔ جبکہ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ جہت سب سے بالاتر تھی۔ سب سے بڑے گناہ وہ ہیں جو اخلاق' روحانیت اور صلح کے نام پر کئے جاتے ہیں۔

امام حسین کی شہادت کے تین مرحلے

امام حسینؑ تین مرتبہ شہید ہوئے۔ ایک یزیدیوں کے ہاتھ' آپؑ کے تن مبارک کی شہادت' دوسری بار کردار کشی کی صورت میں' آپؑ کی شہادت جو یزیدیوں کے بعد آنے والوں' بالخصوص متوکل عباسی کے ہاتھوں ہوئی۔ تیسری مرتبہ اہل منبر کے ہاتھوں آپؑ کے ہدف کی شہادت۔ ان تینوں میں سے تیسرا مرحلہ سب سے اہم ہے۔ جناب زینبؑ کے اس جملہ میں جو آپؑ نے یزید سے

فرمایا: **كد كيدك واسع سعيك** (تو تمام مکرو فریب اور حیلہ کو بروئے کار لا اور جو بھی کوشش کر سکتا ہے کر......) اس جملہ میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں۔

امام حسینؑ کا مکتب مصلح سازی کا مکتب ہے گناہکار انسان بنانے کا نہیں

امام حسینؑ کا مکتب گناہکار سازی کا مکتب نہیں بلکہ مکتب انبیاءؑ کو دوام بخشنے کا مکتب ہے کہ جن کا سورۂ الشعراء میں ذکر ہوا ہے۔ ہمیں ہر سال اور ہر وقت آپؑ کے ذکر کی تجدید کرتے رہنا چاہئے تاکہ آپؑ زندہ صورت میں لوگوں کے درمیان باقی رہیں۔ چونکہ نبوت ختم ہو گئی ہے اسلئے اب یہی مکتبِ حسینی 'انبیاءؑ کے وحی اور الہام کے منبع کی منزلت پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں خداوند عالم کی طرف سے پیغمبروں پر وحی کی گئی ہے کہ جس موقع پر لازم جانیں قیام کریں 'اب سلسلۂ وحی تو نہیں ہے 'لہٰذا اب مکتب حسینی مردان بزرگ کو وحی اور الہام کرتا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ مصلحین کی صورت میں قیام کریں 'نہ کہ انبیاء کی صورت میں چونکہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے۔

فروغی ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) سے نقل کرتے ہیں کہ " نیک لوگوں کی سب سے بڑی آرزو آدم سازی میں شرکت کرنا ہے "، یعنی صالح انسان بنانے کا مکتب قائم کرنا ہے۔ مکتب حسینؑ نہ فقط یہ کہ گناہکار سازی کا مکتب نہیں بلکہ صالح سازی سے بھی بڑھکر ' مصلح سازی کا مکتب ہے۔

سیاست اموی کی خصوصیات: نژادی تعصب کی آگ کو بھڑکانا اور شعر وشاعری کی ترویج

اموی حکمران چند چیزوں کی حمایت اور چند چیزوں سے مبارزہ کرتے تھے۔ جن چیزوں کی حمایت کرتے تھے 'ان میں سے ایک نژادی یا نسبی امتیاز کے تعصب

کی آگ کو پھیلانا تھا۔ کتاب "الامام الصادق" میں لکھا ہے کہ حجاّج نے بصرہ میں اپنے والی کو خط لکھا کہ میرا یہ خط ملتے ہی تم "نبطیہ" (عجمیوں) کو خود سے دور کردیہ تمہارے دین اور دنیا دونوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔

والیٔ بصرہ نے اس خط کے حوالے سے متقین اور قاریان قرآن کو حکم سے مستثنیٰ رکھ کر اس پر عملدرآمد کی خبر حجاّج کو دی۔ حجاّج نے ایک اور خط لکھا کہ اس کے ملتے ہی اطباء کو جمع کرو کہ وہ تمہارے سوتے ہوئے تمہارا معائنہ کریں اور اگر کوئی نبطی رگ پیدا ہو گئی ہو تو فوراً اسے قطع کردیں۔

دوسری چیز جس کی اموی حمایت کرتے تھے' وہ شاعری کی ترویج تھی خصوصاً زمانۂ جاہلیت کے اشعار۔ بزم مشاعرہ کے قیام کے علاوہ وہ کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دیں کہ اشعار میں بھی حکمت ہے۔ کتاب "ابن خلکّان" کی جلد چہارم صفحہ ۳۲۸ پر ابو عبیدہ نحوی شرح حال میں لکھتے ہیں :

"وذکرالمبرد فی کتاب الکامل اَنَّ معاویة بن ابی سفیان الاَمَویَّ قال:اجعلُوا الشّعرَ اکبرَ ھَمَّکُم وَاَکثَرَ آدابِکُم فَاِنَّ فیہِ مَآثِرَ اَسلافِکُم وَمَواضِعَ اِرشادِکُم فَلَقَد رَأیتُنی یومَ الھَزیمَۃِ وَقَد عَزَمتُ عَلَی الفِرارِ فمارَدَّنی اِلاّقولُ ابنِ الاِطنابَۃِ الاَنصاریِّ......"

"مبرّد نے کتاب کامل میں لکھا ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان نے کہا : تم لوگوں کی ہمت و کوشش اور بہترین ادبیات' اشعار ہونا چاہئے کیونکہ تمہارے گزشتگان کے آثار اور تم لوگوں کی ارشاد و رہبری اشعار ہی میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جس دن میں نے شکست کھائی اور جنگ سے فرار اختیار کرنے لگا تو ابن المنابہ انصاری کے ان اشعار کے علاوہ کسی اور چیز نے مجھے فرار کرنے سے باز نہ رکھا : عفت کو اپنانے کے لئے ایک بہت

بڑی قیمت دینا پڑتی ہے۔ بہت سی خوبیوں سے اپنے لئے عفت کو خریدو' خواہ اس کے لئے نفس کو ناگوار باتیں برداشت کرنا پڑے۔ اسکے لئے دلیری اور جوانمردی کی پیشانی کو رگڑ دینا پڑتا ہے۔ جب بھی نفس پر بیتابی کا غلبہ ہوتا تھا تو میں کہتا تھا کہ آرام کرو۔ یہی سب میرے لئے میدان کارزار سے فرار سے رکنے کا باعث بنا' تاکہ صالحی' شائستگی اور نیک آبرو سے خود کی حمایت کر سکوں۔"

معاویہ کے یہ جملے حقیقت میں سنت نبوی اور قرآن کریم کی آیت کریمہ :
"اَلشُّعَرآءُ یَتَّبِعُھُمُ الغاوٗنَ "اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں"
(سورۂ الشعراء آیت نمبر ۲۲۴) سے مبارزہ ہیں۔

معاویہ اس وقت قرآن کریم کی آیاتِ جہاد کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوا؟ اور کیوں کران تعصب سے بھرے ہوئے اشعار کی طرف متوجہ ہوا؟

البتہ حکمت آمیز اشعار کا کہیں پر بطور مثال پیش کرنا کوئی عیب نہیں ہے جیسا کہ خود اباعبداللہ نے کربلا کی طرف حرکت کرتے وقت ایک انصار کے اشعار کو اپنے لئے مثال کے طور پر دہرایا۔ "سامضی ومافی الموت...... "لیکن معاویہ کا ایک کلی طور پر یہ بیان دینا کہ "اجعلوا الشعر اکبر همکم" بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اُن اشعار میں اور ان میں بہت زیادہ فرق ہے۔

جرجی زیدان اپنی کتاب "تمدن اسلام" کی جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۳۱ پر لکھتے ہیں: بنی امیہ کے نزدیک لوگوں کے تین گروہ تھے :

۱۔ حکّام۔ یہ خود عرب والے تھے۔
۲۔ اُنکے موالی یعنی غلام۔ یہ آزاد شدہ مسلمان تھے۔
۳۔ ذمّی۔

چنانچہ معاویہ مصر کے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے: "اس ملک کے رہنے والوں کے تین طبقے ہیں۔ یہ یا انسان ہیں یا شبیہِ انسان ہیں یا نسناس یا لاناس (جانور) ہیں۔ طبقہ اول عرب، دوسرا طبقہ بندگان اور غلام اور تیسرا گروہ ذمّی یعنی قبطیان ہیں"۔

جرجی زیدان کی اسی کتاب کی جلد چہارم میں ایک باب "عصر اموی میں حکومت کی سیاست" کے نام سے ہے۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں کہ بنو امیہ اہل ذمّہ سے پیسہ لینے کی خاطر سخت گیری کرتے تھے۔ اگر وہ لوگ پیسہ دیتے تو ان کو زیادہ دوست رکھتے تھے۔ وہ اس بارے میں کتاب "خِطَط" مقریزی کا حوالہ دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

☆ شجاعت حسینی (یعنی شجاعت بدنی) کے ظاہر ہونے کے (مواطن) مواقع۔

☆ مرّوت حسینی کے ظاہر ہونے کے مواقع۔

☆ صبر کے مواقع۔

☆ غیرت، حمیّت اور اباء نفس کے ظاہر ہونے کے مواقع۔

☆ توجہ بہ خدا ۱۰۰

☆☆☆☆☆☆

رضا اور تسلیم

کتاب "راہنمائی دانشوران" میں اس رباعی کو رکن الدین محمود خوافی کی

۱۰۰۔ یہاں پر استاد شہید کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخہ میں نیچے توضیح کی غرض سے کچھ جگہ چھوڑی ہوئی ہے لیکن مطالب لکھے ہوئے نہیں ہیں۔

طرف نسبت دی گئی ہے۔

غواصی کن گرت گُہر می باید　　غواصان را چار ہنر می باید

سر رشتہ بہ دست یار و جان در کف دست　　دم نازدن و قدم نہ سر می باید

اس رباعی میں تسلیم کی حقیقت کو مثبت جہت سے خوب بیان کیا گیا ہے۔ تسلیم کے معنی سکونت، سکون اور توقف نہیں بلکہ تسلیم سے مراد حرکت کی کیفیت کو تغیر دینا ہے۔

اس رباعی میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایک غواص جو دریا کی تہ میں حرکت کرتا ہے اور ایک آدمی جو سڑک پر معمول کی حرکت کرتا ہے، ان دونوں حرکتوں میں چار جہت سے فرق ہے۔

۱۔ خواص کے کام کا دارومدار دوسرے کے ہاتھ ہے۔ اس کے لئے امر کا حکم دینا خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ خداوند عالم پر توکل کر کے چلا جاتا ہے۔ یہاں پر اسکا پروگرام اسکی ہوائے نفس کا تابع نہیں۔

۲۔ ایسا اقدام بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کام کی انجام دہی میں کئی بڑے اژدھوں اور گھڑیال کے درمیان جانا پڑتا ہے اور ہر لحظہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کسی ایک عظیم الجثہ گھڑیال کے منہ کا لقمہ بن جائے۔

۳۔ اس عمل میں دم سادھنا، منہ بند کرنا اور حرکت کرنا اس فوجی جوان کی طرح سے ہے جو اپنے کمانڈر کے فرمان کے تحت ہے اور فرمان ملتے ہی ہاتھ اٹھا کر کے بتاتا ہے کہ وہ سن رہا ہے اور اطاعت میں حرکت کناں ہے۔

۴۔ غواص کو سر کے بل جانا ہوتا ہے نہ کہ پاؤں سے۔ دوسرے لفظوں میں اسکے کام میں انتہائی میل، شوق اور عشق لازم ہے، فقط اس کی فروتنی، اطاعت اور اس کا دم سادھ لینا کافی نہیں ہے۔ پرستش کے لئے عشق اور محرکاتِ

داخلی لازم ہیں۔ احرار اور عشاق جیسی بندگی ہونا چاہئے۔

قرآن کریم میں پہلی اور تیسری جہت کی طرف اشارہ ہے۔ خدا فرماتا ہے:

"فلا وربك لایومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم"

"تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مؤمن نہ ہونگے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو حَکَم نہ بنائیں......"۔ (سورۂ نساء آیت نمبر ۶۵)

جب غواص یہ چاروں ہنر پیدا کرلیتا ہے' تب وہ دریا کی تہ سے موتی حاصل کرپاتا ہے۔

شجاعت روحی' قلبی' عمل' قیافہ اور زبان کے تعادل کی حفاظت

عقاد کہتا ہے: ملك جأشه و كل شئ من حوله يوهن الجأش۔ وہ اپنے قلب کے مالک تھے حالانکہ آپ کے اردگرد تمام چیزیں قلب کو کمزور کرنے والی تھیں۔

اباعبداللہ کی شہادت اور مظلومیت کے بارے میں عام طور پر ذاکرین کی منطق

مرنے اور وفات پانے کی چند قسمیں ہیں :

١۔ طبیعی موت مرنا (نہ کہ اخترامی موت)، یعنی کوئی انسان طبیعی عمر کو پہنچا اور گزر گیا۔

٢۔ اخترامی موت جو طبیعی عوامل کے ذریعہ ہو جیسے جوانی میں وبا، طاعون اور اس طرح کے دوسرے امراض سے مرنا۔

٣۔ اخترامی موت جو کسی حادثہ اور سانحہ کی وجہ سے ہو جیسے زلزلہ یا سیلاب یا موٹر کار کے حادثہ کی وجہ سے کوئی مر جائے۔ ان مواقع پر کسی نے عمداً نہیں مارا ہوتا اور نہ ہی اس میں مقتول کی کوئی تقصیر ہوتی ہے۔

٤۔ اخترامی موت جس کا سبب غیر طبیعی عوامل ہوں، جیسے کوئی ایسا حادثہ یا سانحہ جس میں قصور خود مقتول کا ہو۔ مثلاً کسی آدمی کا نشہ کی حالت میں موٹر کار چلانے کے سبب حادثہ میں ہلاک ہو جانا۔ اس ہلاکت میں ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کا کوئی قصور نہیں۔

٥۔ ایسی اخترامی موت جو کسی حادثہ اور سانحہ کی وجہ سے واقع ہوئی ہو مگر اس میں مقتول اور دوسرا شخص دونوں ہی قصوروار ہوں۔ جیسے عام طور پر لجاجت، تعصب، جہالت، مستی اور ضد میں یا مثلاً فحاشی خانہ میں دو افراد ایک ہر جائی عورت کی خاطر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں، یہاں تک کہ قتل کر دیتے ہیں۔

٦۔ اخترامی موت جو قتل عمد کی وجہ سے ہوئی لیکن مقتول کا اسمیں کسی قسم کا کوئی قصور نہیں بلکہ صرف قاتل کی جنایت سبب موت بنی ہو امثلاً ایک شخص،

کسی دوسرے شخص کو، خود اسکے اپنے کسی قصور کے بغیر قتل کر دیتا ہے یا مثلاً کوئی اپنا راستہ چل رہا ہے اور دوسرا شخص اس شخص کو نشانہ بناتا ہے۔ یا مقتول کے باپ بھائی یا کسی دوسرے رشتہ دار سے بدلہ لینے کی خاطر اسے مار دیتا ہے تاکہ اس کے خاندان کو اس شخص کے مرنے سے دکھ پہنچے۔ یا مقتول کے مرحوم باپ سے خاندانی نفرت کے نتیجہ میں اسے بلا تقصیر مار دیتا ہے۔ یا اس شخص کے وجود کو اپنے لئے مزاحم سمجھتا ہے، **مثلاً** یہ کہ جب تک یہ شخص زندہ رہیگا فلاں عورت اس کے عشق کو قبول نہ کریگی یا فلاں مقام و منصب اس شخص کے ہوتے ہوئے اس کو نہیں مل سکے گا، اگرچہ یہ شخص خود اس کے عشق اور مقام میں ذرا بھی مزاحم نہیں پھر بھی وہ اسے مار دیتا ہے۔

۷۔ جانبازی و فداکاری اور شوقِ شہادت میں مرنا۔ یہاں مقتول خود کو اپنے عقیدہ اور ہدف و مقصد کی راہ میں فدا کرتا ہے۔ یہ مرنا بھی عمداً ہے۔ مرنے والا اپنے مقدس اور عالی ہدف کی راہ میں مارا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انتخابی موت ہے کہ انسان آگاہانہ طور پر اپنے ہدف کو تحقق بخشنے کیلئے اس موت کو انتخاب کرتا ہے تاکہ اسے اس کا ہدف حاصل ہو جائے۔

۸۔ انتخابی موت کی ایک اور نوع بھی ہے اور وہ ہے خودکشی جس میں انسان حوادث کا مقابلہ کرنے سے فرار کرنے کے لئے اپنے آپ کو مار دیتا ہے۔ ایسا انسان کے ضعیف اور کمزور ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ تمام مرنے والوں اور مارے جانے والوں کے اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض افسوسناک ہیں اور بعض پر افسوس نہیں ہوتا۔ بعض حقیقت میں مقتول کیلئے سزا کی صورت ہیں اور بعض ایسے نہیں ہیں۔ بعض اموات ضایع اور تلف ہو جانے والی اموات ہیں اور بعض نہیں۔

پہلے قسم کی موت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شخصی اعتبار سے اسف انگیز نہیں ہے چونکہ مرنے والا عادی موت مرا ہے اگر چہ کہ اجتماع کے حوالہ سے ممکن ہے بعض افراد کے جانے سے نقصان ہوا ہو۔ دوسری قسم کی موت انسان کا تلف ہونا ہے اور یہ مقام افسوس بھی ہے لیکن کوئی دوسرا شخص اس میں مورد ملامت نہیں ہوتا۔ اسی طرح تیسری قسم کی موت بھی ہے۔ چوتھی قسم واقعاً مقتول کی جزا اور سزا ہی ہے۔ اسی طرح پانچویں قسم بھی ہے سوائے اسکے کہ اس میں قاتل اور مقتول' دونوں مورد ملامت ہیں۔ دوسری' تیسری' چوتھی اور پانچویں اقسام میں تلف ہونا' ضایع ہونا اور برباد ہو جانا موجود ہے۔ چوتھے اور پانچویں قسم میں عمومی اخلاق پر افسوس کرنے کا مقام ہے کہ کیوں اتنی زیادہ پستی میں گر گئے۔ چھٹی قسم کی موت میں دونوں طرف افسوس کا مقام ہے' مقتول کا تلف ہونا اور قاتل کا اخلاق بد' دونوں افسوسناک ہیں۔ اس قسم کی موت میں انسان متأسف ہوتا ہے کہ ایک شخص بے تقصیر' بے دریغ تلف اور برباد ہو گیا۔ لیکن ساتویں قسم کی موت وہ ہے جس میں انسان قاتل کے اخلاق اور روحیہ پر افسوس کرتا ہے اور اثر لیتا ہے' لیکن مقتول کے لئے اسکے دل میں تحسین اور تعظیم ہوتی ہے اور اس کو' اپنے لئے نمونۂ عمل قرار دیتا ہے۔

عام طور پر ذاکرین کی کوشش رہتی ہے کہ شہادت امام حسینؑ کو چھٹی قسم میں شامل کریں' یعنی ایک مظلوم اور بے گناہ شخص کو بے سبب قتل کیا' جان تلف کی' ضایع اور برباد کیا۔ حالانکہ امام حسینؑ کی شہادت ساتویں قسم کی موت ہے' نہ کہ چھٹی قسم کی۔ عام طور پر سید الشھداء کے حادثہ کا ذکر کرتے وقت اظہار تأسف کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ سید شہداء مارے گئے افسوس آقا امام حسینؑ ضایع ہو گئے۔ ہماری غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ہم امام حسینؑ کو

ضایع شدہ شمار کرتے ہیں۔ ہماری اس سوچ کے برعکس امام حسینؑ نے اپنے خون کے ہر ایک قطرہ کو ایک دنیا کے برابر قیمت بخشی۔ آیا وہ شخص جس نے ایک ایسی لہر ایجاد کی جو صدیوں تک ستمگروں کے محلات کی بنیادوں کو متزلزل کرتی رہی بلکہ جس نے انہیں بنیاد سے اکھاڑ پھینکا، حتیٰ کہ ہمارے اس زمانہ میں بھی اکثر پُر جوش اور گرم حوادث محرم ہی میں پیش آتے ہیں، آیا اس شخص کا خون ضائع ہو گیا ہے؟ جس شخص کی شہادت نے کروڑوں نمازی، روزہ دار اور جان فدا کار پیدا کئے، آیا وہ ضایع اور ہدر ہو گیا ہے؟

آیا امام حسینؑ کے پاس کوئی خصوصی دستور تھا؟

ایک امر جو کربلا کی داستان کو اس کے محور سے ہٹانے کا موجب بنا ہے اور جو اسے عام لوگوں کیلئے محل استفادہ ہونے اور بہرہ برداری سے خارج کر دیتا ہے اور بالآخر ان تمام اہداف سے جو آنحضرت کی عزاداری کے امور سے متعلق نظر میں ہیں، منحرف کر دیتا ہے، وہ یہ قول ہے کہ سید الشہداء کی تحریک کی علت ایک خصوصی اور شخصی[۱] الحکم کے مانند ایک پوشیدہ فرمان تھا۔ اور یہ خصوصی حکم امامؑ کو خواب یا بیداری میں دیا گیا تھا۔ اسلئے اگر یہ صحیح ہے کہ امامؑ ایک خصوصی حکم رکھتے تھے کہ حرکت فرمائیں تو اس صورت میں دوسرے لوگ ان کو اپنا مقتدا اور امام نہیں بنا سکتے ہیں کہ وہ اس نظیر پر عمل درآمد کریں اور پھر وہ حسینؑ کے لئے کسی "مکتب" کے قائل بھی نہیں ہو سکتے۔ اسکے برخلاف میں تو یہ کہتا ہوں کہ امام حسینؑ کی حرکت اسلام کے عمومی احکام سے مستنبط اور منتج ہوئی اور امام نے اپنی روشن اور صائب رائے سے ان احکام کو تطبیق کیا کیونکہ آپ اسلام کے احکام کو

---

[۱] اس مقام پر ہمیں قضایائے شخصیہ، خارجیہ اور حقیقیہ کے درمیان فرق کا پتہ چلنا چاہئے اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ متأخرین کے نزدیک احکامات کا صدور قضایائے حقیقیہ کے تحت ہے۔

بھی خوب سمجھتے تھے اور اس زمانہ کے وضع سے بھی کماحقہ واقف تھے، نیز حکمران طبقہ سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ لہٰذا آپؑ نے ان احکام کی تطبیق اپنے زمانہ پر کی اور قیام اور حرکت کو اپنا وظیفہ جانا۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے ایک معروف خطبہ میں رسولؐ خدا کی معروف حدیث سے استناد فرمایا:

"**من رأیٰ سلطاناً جائراً**...... مزید فرمایا: **الا ان ترون ان الحق لایعمل به وان الباطل لایتناهیٰ عنه لیرغب المومن**...... یہاں پر لیرغب الامام نہیں کہا بلکہ کہا **لیرغب المومن** یعنی یہ ہر مومن کا وظیفہ تھا، نہ کہ فقط امام حسینؑ کا وظیفہ، اسلئے کہ وہ امام تھے۔

لیکن عام طور پر خطیب اور ذاکر حضرات اپنے خیال میں امام حسینؑ کے مقام کو بلند کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کو یزید اور ابن زیاد کی ذات سے مبارزہ کرنے کا خصوصی حکم آیا تھا اور اس سلسلے میں وہ خواب یا بیداری میں اس حکم کے آنے کے بارے میں ہزاروں باتیں بنا کر پیش کرتے ہیں۔ نتیجتاً قیام امام حسینؑ کو عام انسانوں کے لئے قابل اقتدا ہونے اور ولکم فی رسول الله اسوة حسنة[۱] کے دائرۂ عمل سے خارج کر لیتے ہیں اور ہماری اصطلاح میں قیام حسینیؑ کو زمین سے آسمان پر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے اقوال پیش کرتے ہیں جیسے:

"اپنے آپ کو بنیاد بنا کر صالحین اور اولیاء عظام کے اعمال کے بارے میں قیاس مت کرو"۔

اس سلسلے میں جتنی زیادہ خیال بافی کی جائے گی اور جس قدر جن وملک، خواب وبیداری اور خصوصی حکم کے موضوع پر بولا جائے گا، یہ نہضت اتنا ہی ہمارے لئے نمونہ عمل بننے کے لائق نہیں رہے گی۔

---

[۱] مسلمانو! تمہارے لئے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے (سورۂ احزاب ۲۱)

اب آپ خود غور کریں کہ آیا امام حسینؑ کسی خصوصی حکم کے تحت کام انجام دیں تو ان کا مقام زیادہ بلند ہوتا ہے یا عمومی احکام کے تحت اس عمومی حکم کو اپنے وقت کے حالات پر منطبق کر کے (وہ بھی ایسے حالات میں جہاں ابن عباس جیسے بڑے بڑے اور باہوش اور زیرک صحابہ اس کی تطبیق سے عاجز تھے)، عمل کریں تو ان کا مقام بالاتر ہوتا ہے؟ ہم مشرقی لوگ عزت و مقام کو فقط ایسے لوگوں کیلئے سزاوار سمجھتے ہیں کہ جن کے بارے میں مثلاً کہا جائے کہ فلاں شخص بھید کھولنے والا ہے یا اہل کرامت و معجز نما ہے یا جِنات کو مسخر کیا ہوا ہے یا ملائکہ سے میل ملاپ رکھتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ امام حسینؑ ملکوتی مقام کے مالک ہیں بلکہ آپؑ جمیع مقام و منزلت کے مالک ہیں۔ آپؑ ایک انسان کامل ہیں۔ انسان کا مقام فرشتوں سے بھی بلند و بالا ہے۔ انسان کے کمال کی انتہا یہ نہیں کہ فرشتوں سے میل ملاپ ہو بلکہ اس کے کمال کی انتہا انسان کامل ہونا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جبرئیل مقام معراج تک پہونچنے سے عاجز رہ گئے۔ اگر کہیں گے کہ امام حسینؑ نے فرشتوں کی راہنمائی میں قیام کیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آپؑ خود اپنی ذاتی عقل اور تشخیص کے ذریعے اپنا وظیفہ (شرعی ذمہ داری) تشخیص دینے پر قادر نہیں تھے۔

لیکن اگر یہ کہیں گے کہ آپؑ نے خود اپنی عقل کے ذریعے اپنی شرعی ذمہ داری کا تعین کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپؑ کی ذاتی عقل و شعور سب سے بالاتر تھی اور آپ نے کوئی الہامی کام انجام نہیں دیا۔ الہام وہاں پر ہوتا ہے جہاں عقل اور شرع کی ہدایت و راہنمائی کافی نہیں ہوتی، جبکہ صورتحال یہ ہے امام حسینؑ کے لئے عقل اور شرع کی راہنمائی کافی تھی۔ بنابرایں: ان اللہ شاءَ ان یراك قتیلاً کے معنی یہ ہیں کہ مشیتِ تشریعیٔ عمومی کے تحت امام حسینؑ نے قیام فرمایا، نہ

کہ مشیت تکوینی یا کسی ایسی خصوصی مشیت کے تحت، جو خود آپؑ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو۔ قدیم زمانے میں ہمارے علماء کرام نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ کلمۂ ان اللہ شاء ان یراك قتیلا میں مشیت سے مراد مشیت تکوینی ہے یا مشیت تشریعی؟ اور سب نے یہ قبول کیا ہے کہ یہاں مراد مشیت تشریعی ہے۔ لیکن اس بارے میں بحث نہیں کی ہے کہ مشیت تشریعی سے مراد وہی مشیت کلی (عمومی) ہے کہ جس میں تمام مسلمین شامل ہیں یا ایسا نہیں بلکہ یہ ایک مشیت تشریعی اور حکم تشریعی تو ہے لیکن یہ امام حسینؑ کے ساتھ مختص تھا، فقط انہی کے لئے تھا۔

ہم اس مطلب پر ایک دوسری طرح سے بھی بحث و گفتگو کر سکتے ہیں اور وہ زیادہ عاقلانہ بھی ہوگا۔ آیا امام حسینؑ نے جو قیام کیا وہ امام ہونے کی وجہ سے کیا تھا یا ایک مومن اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے؟ دوسرے لفظوں میں، اگر ہم چاہیں کہ حدیث ان اللہ شاء ان یراك قتیلاً کے حوالے سے بحث کریں تو سوال یوں ہوگا کہ اس سے مشیت تکوینی مراد تھی یا مشیتِ تشریعی۔ اگر تشریعی مراد تھی تو اس صورت میں آیا یہ خصوصی اور شخصی حکم تھا یا کل عامۃ الناس کے لئے ایک کلّی اور مجموعی حکم تھا۔ اور اگر کلی حکم تھا تو اس صورت میں آیا یہ فقط امام اور مسلمین کے پیشواؤں کے لئے تھا یعنی یہ ایک ایسا حکم تھا جو فقط آئمہ اطہارؑ کے لئے وضع ہوا تھا یا پھر یہ حکم تمام مومنین اور مسلمین کے لئے تھا؟ ان سوالوں کے جوابات کی وضاحت کیلئے مثالیں ذکر ہونا چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں آئمہ صالحین کے خصوصی وظیفوں یا تکالیف کا ذکر ہو، وہاں پر یہ فرق بھی واضح ہونا چاہئے کہ امام کی جو ذمہ داریاں ہیں، وہ مسلمانوں کے سرادار اور سربراہ ہونے کے حوالے سے ہیں یا امام کے صاحب مقام ولایت اور وصایت ہونے کی وجہ سے ہیں؟

معاویہ ویزید میں فرق

امام حسینؑ نے مدینہ میں مروان بن حکم سے فرمایا: **وعلی الاسلام السلام اذ قد بُلیتِ الامة براعٍ مثل یزید**. آپؑ کے اس فرمان میں "مثل یزید" کے کلمہ پر غور وخوض کرنا چاہئے کہ یزید میں وہ کون سی خصوصیت تھی جو معاویہ میں بھی نہیں تھی؟ اس بارے میں ہم کچھ باتیں تو پہلے عرض کر چکے ہیں' تاہم یہاں پر دو اور مقدموں کا اضافہ کرتے ہیں۔

پہلا مقدمہ: ہمیں یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ یزید اور معاویہ جس طرح کے تھے اور آج کل جس طرح ہمیں ان کی کامل شناخت حاصل ہے' اسی طرح اس زمانہ کے لوگ بھی ان دونوں کو صحیح طور پر جانتے تھے۔ (جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی بعض گزشتہ جنایتکار لوگ پارساؤں میں شمار ہوتے ہیں کیونکہ کسی نے ان کو نہیں پہچانا جیسے شاہ عباس صفوی)۔ ان دِنوں وسائل اور روابط کے نہ ہونے کے باوجود امام حسینؑ نے یزید کی مکمل طور پر شناخت کی لیکن عام لوگ کماحقہ اس سے آگاہ نہ تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ جب کچھ لوگوں کے ساتھ شام کے سفر سے واپس لوٹے تو یزید کے خلاف اسقدر متحرک ہوئے کہ بولے: "ہم ڈر گئے کہ کہیں شام میں ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نہ ہو جائے"۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے آٹھ بیٹوں کے ہمراہ یزید کے خلاف مبارزہ کر کے اپنی جانیں دے دیں اور شہید ہو گئے۔ پس امام حسینؑ نے کچی اینٹ میں جو دیکھا وہ دوسروں کو آئینہ میں بھی نظر نہیں آتا تھا۔

دوسرا مقدمہ: ایک خلیفہ جو خود غیر صالح انسان ہو لیکن نظام امور کو صحیح طریقے پر چلاتا ہو اور دوسرا خلیفہ جو حالِ حاضر میں ہی مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہو' ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں جب یہ طے پایا کہ

حضرت عثمانؓ کی بیعت کی جائے تو حضرت علیؑ نے فرمایا:

"لقد علمتم انی احقُّ الناس بها من غیری، و واللہ لاسلمن ماسلمت امور المسلمین ولم یکن فیها جورٌ الا علّی خاصةً التماساً لأجر ذلك وفضلهِ و زُهداً فیما تنا فستموهُ من زخرفهِ و زبرجه"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور خدا گواہ ہے کہ میں اس وقت تک حالات کا ساتھ دیتا رہوں گا جب تک مسلمانوں کے مسائل ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے تاکہ میں اس کا اجر و ثواب حاصل کر سکوں اور اس زیب و زینت دنیا سے بے نیازی کا اظہار کر سکوں، جس کے لئے تم سب مرے جا رہے ہو"۔ (نہج البلاغہ ۷۴)

امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے اور آئمہ اطہارؑ نے عزائے حسینی کو قائم کرنے کی ترغیب کیوں دی؟

ہمیں ہمیشہ دو سوالوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اچھا ہے کہ ان سوالوں کے جواب پہلے سے جان لیں تاکہ خود ہمارا ذہن بھی روشن رہے اور ضرورت کے وقت جواب دینے میں بھی عہدہ برا ہو سکیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آئمہ دینؑ نے کیوں یہ حکم دیا کہ عزائے امام حسینؑ کو ہمیشہ قائم کیا جائے، جسکے نتیجے میں ہم دو مہینے محرم اور صفر میں مسلسل بلکہ ان دو مہینوں کے علاوہ بھی اپنا وقت عمر، دولت اور طاقت، یعنی ہر چیز صرف کرتے ہیں۔

پہلے سوال کے بارے میں تو بہت ساری باتیں کہی جا چکی ہیں۔ دشمنوں کا کہنا ہے کہ امام حسینؑ حکومت حاصل کرنے کا قصد رکھتے تھے، اس وجہ سے مارے گئے۔ انکا اپنا ایک ذاتی ہدف تھا جہاں تک نہ پہنچ سکے۔ نادان دوست کہتے ہیں کہ آپؑ اس لئے شہید ہوئے کہ امت کے گناہ بخش دیئے جائیں۔ امام حسینؑ کے بارے میں گویا یہ وہی بات کرتے ہیں جو نصاریٰ حضرت مسیحؑ کے بارے میں کہتے تھے۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کو آسمانی اور خیالی حکم قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جسے خود امام حسینؑ نے پہلے روز فرمایا: "ماخرجت اشراً ولا بطراً .." یا دوسری جگہ پر فرمایا: "الا ترون ان الحق لایُعمل به، وان الباطل لا یتناهیٰ عنه، لیرغب المومن فی لقاء الله محقاً......" یا ایک اور جگہ پر کہا: "ایها الناس من رأیٰ سلطاناً جائراً......"

دوسرے سوال کا جواب یوں ہے کہ کوئی بھی تکلیف شرعی حکمت کے بغیر

نہیں ہوتی۔ امام حسینؑ کی عزاداری کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے خاندان رسالتؐ کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے یا اُنھیں تسلیت پیش کی جائے یا ذاکرین عزاء کے مطابق عزاداری جناب زہراؑ کو پرسہ دینے کیلئے ہے۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ جتنا زیادہ گریہ کریں گے، اتنا زیادہ حضرت رسولؐ خدا اور حضرت زہراؑ کو تسلی ہوگی۔ اس صورت میں ہم نے حضرت رسولؐ خدا، حضرت زہراؑ اور حضرت علیؑ کو کتنا اور کس قدر ادنیٰ تصور کیا ہے جبکہ یہ لوگ ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے تھے اور شہادت ہی کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ۱۳۲۰ سال گزرنے کے بعد بھی وہ لوگ نالہ وزاری اور بیتابی کے عالم میں ہیں۔ در حقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ عزائے حسینی کا مقصد یہ ہے کہ کربلا کی یہ داستان ایک تعلیمی اور تربیتی مکتب کی صورت میں ہمیشہ باقی رہے۔ حقیقت میں اگر ہم پہلے سوال کا جواب صحیح طور پر دیدیں تو دوسرے سوال کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا۔ کتاب "لؤلؤ مرجان" کے صفحہ ۳ پر "کامل الزیارۃ" سے نقل ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے عبداللہ بن حمّاد بصری سے فرمایا:

"بلغنی ان قوما یأتونه (یعنی الحسینؑ) مِن نواحی الکوفه و ناساً من غیرهم ونساءً یَندُبنَهُ وذلك فی النصف من شعبان فمن بین قارءٍ یقرا، وقاصٍ یقُصُّ ونادب یندبُ وقائل یقول المراثی۔ فقلت له: نعم، جعلت فداكَ قدشهدت بعض ماتصف ۔فقال: الحمدلله الذی جعل فی الناس من یفدُ الینا ویَمدَحُنا ویرثی علینا، وجعل عدونا من یطعن علیهم من قرابتنا اومن غیرهم یهدّ دونهم و یُقبِّحونَ مایصنعونَ"۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیمۂ شعبان کو اطراف کوفہ سے ایک گروہ اور ان

کے علاوہ کچھ دوسرے مرد اور عورتیں امام حسینؑ کی قبر مطہر پر آکر آہ وبکا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور بعض حادثہ کربلا کو بیان کرتے ہیں، بعض نوحہ خوانی کرتے ہیں اور بعض مرثیہ پڑھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: میں آپؑ پر قربان! ہاں! جو آپؑ نے بیان فرمایا، میں نے بھی اس میں سے کچھ دیکھا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: شکر خدا کا جس نے لوگوں میں ایسے افراد بھی قرار دیئے جو ہمارے پاس آتے ہیں، ہماری ستایش کرتے ہیں اور ہمارے لئے مرثیہ خوانی کرتے ہیں، اور ایسے لوگوں کو ہمارا دشمن قرار دیا جو ان کی عیب جوئی کرتے ہیں، ان پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں خواہ وہ ہمارے قبیلہ و خاندان سے ہوں یا غیر ہوں"۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۸ پر نقل ہے: اِنَّ لقتل الحسینؑ حرارة فی قلوب المومنین لا یُبرد ابداً ۔(بہ تحقیق ابو عبداللہ الحسینؑ کی شہادت سے مومنین کے دلوں میں ایک سوزش اور حرارت ہے جو کبھی ٹھنڈی نہ ہو گی) پس یہاں سے معلوم ہوا کہ عزائے حسینی کے قیام کا فلسفہ دشمن کو ڈرانا، دھمکانا ہے اور اُس کے کاموں کی مذمت کرنا ہے۔ اس دستہ کی تعریف اور اس طرح کے کام کرنے والوں کو شوق دلانا، حوصلہ افزائی کرنا اور دوسرے گروہ کی مذمت کرنا اور ان کے طریقہ پر کام کرنے والوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے[ح۱]۔

البتہ حضرت زہراؑ خوش تو ہوتی ہیں لیکن اس زاویئے سے کہ حضرت زہراؑ،

ح۱۔ اس پیرگراف کے حاشیہ میں استاد شہید نے لکھا ہے: آیا عزاداری کا مقصد ہمدردی اور تسلیت دینا ہے؟ یا اس کا مقصد ثواب حاصل کرنا ہے؟! درحالیکہ خود ثواب اور اچھے اور معقول کام کیلئے ذاتی مصلحت ہوتی ہے۔ پس ہمیں پہلے حکم کی علت میں جو ذاتی مصلحت ہے اس کو دیکھنا چاہئے کہ کیا ہے تاکہ اس کے بعد ثواب کی باری آئے کہ جو حکم کی علتوں میں سے ہے۔

حضرت رسولؐ خدا، حضرت علیؑ، نیز حضرت امام حسینؑ کی نیت اور ہدف ایک ہی ہے۔ ان سب کا ہدف اور مقصد ہے یَتلُوا عَلَیھِمْ آیاتِہٖ و یُزَکِّیھِم ویُعَلِّمُھُمُ الکتاب والحِکمَۃ ۔"جو ان پر آیات الٰہیہ کی تلاوت کرتا ہے، انہیں پاکیزہ بناتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔(سورۂ آل عمران ۱۶۴)

حضرت زہراؑ خوش ہوتی ہیں تو اس وجہ سے کہ ان کے فرزند حسینؑ کے ذکر کے وسیلے سے لوگ دنیا و آخرت میں سعادت مند ہوتے ہیں۔ لوگ اسی راستے پر چل پڑتے ہیں جس راستے پر حسینؑ چلے تھے۔

معاویہ کے مرنے کے بعد امام حسینؑ سے بیعت طلب کی گئی۔ آپؑ حاکم مدینہ کے گھر تشریف لے گئے اور بیعت نہ کی۔ دوسرے دن مروان بن حکم نے ایک گلی میں امام حسینؑ کو دیکھا تو اس نے نصیحت کے طور پر امام حسینؑ سے بیعت کرنے کو کہا۔ آپؑ نے فرمایا: "وعلی الاسلام السلام اذقدبُلِیَتِ الأُمّۃ براعِ مِثلِ یزید"۔("جب امت یزید جیسے کی رعیت میں ہو تو اسلام پر میرا اسلام ہو")

آپؑ کے اس فرمان میں"و براع مثل یزید" کے کلمہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یزید ایک ایسی خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ خصوصیت حتیٰ معاویہ میں بھی نہیں۔ شیعہ عوام کے نزدیک یزید اور غیر یزید میں کوئی فرق نہیں، اسلئے کہ سب باطل اور غاصب رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے درمیان فرق ہے۔ سب غاصب ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ انکے درمیان فرق ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ جب لوگ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں بیعت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو اس وقت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"لقدعلمتم انی احق الناس بھا من غیری و واللہ لأسلمن ماسلمت امورالمسلمین ولم یکن فیھا جور الا عَلَیَّ خاصۃ التماساً

لا جر ذلك وفضله وزهداً فيما تنافستموه من زخرفه و زبرجه".

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور خدا گواہ ہے کہ میں اس وقت تک حالات کا ساتھ دیتا رہوں گا جب تک مسلمانوں کے مسائل ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے تاکہ میں اس کا اجر و ثواب حاصل کر سکوں اور دنیا کی اس زیب و زینت سے اپنی بے نیازی کا اظہار کر سکوں جس کے لئے تم سب مرے جا رہے ہو"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۷۲)

اور ابی بکرؓ سے بیعت کے موقعہ پر فرمایا:

"شقوا امواج الفتن بسفن النجاة......"

"ایھاالناس! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر نکل جاؤ......"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵)

پس فرق ہے دو غاصبوں کے درمیان۔ ایک وہ غاصب جو عام لوگوں کا حافظ و نگہبان بنا ہوا ہے، مگر اپنی ذاتی مصلحت کے تحت۔ اور دوسرا غاصب وہ ہے جو کسی چیز کو بھی اہمیت نہیں دیتا۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یزید سارے ماسلف سے مختلف تھا۔

ہم اس سے قبل ابن زیاد اور یزید کے احوال میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس فاجعہ کی اور اس آگ کی جو سب سے پہلے خود ان کے دامن میں لگی، علت یہ تھی کہ یزید جوان اور نا آزمودہ تھا۔ شاعر عرب کہتا ہے کہ:

"ان الشباب والفراغ والجدہ   مفسدةٌللمرءِ اىُّ مَفسدَةٍ"

"انسان کے لئے جوانی، بے کاری اور دولت و ثروت بہت بڑا سبب فساد ہے"

☆☆☆☆☆☆

امام حسین علیہ السلام پر گریہ وزاری کا مسئلہ

سید الشہداء امام حسینؑ سے مربوط مسائل میں ایک مسئلہ آپؑ پر گریہ وزاری کا مسئلہ ہے۔ خود رونے اور ہنسنے پر چند زاویوں سے بحث و گفتگو ہونا چاہئے:

۱۔ سب سے پہلے اس زاویہ سے کہ یہ انسان کے مختصات میں سے ایک ہے اور یہ اس کے عرض خاص[۱] میں شمار ہوتا ہے۔

۲۔ جسمی اور روحی مبادی اور علل کے زاویہ سے۔

۳۔ جسمی اور روحی آثار و عوارض کے زاویہ سے۔

۴۔ اخلاقی لحاظ سے اس پر بحث و گفتگو اور علمائے اخلاق و آداب کے اس بارے میں ثابت شدہ عقیدہ کا بیان۔

۵۔ رونے اور ہنسنے کے اجتماع پر اثرات۔

۶۔ رونے اور ہنسنے کے اقسام۔ آیا رونے کے تمام اقسام بُرے ہیں اور ہنسنے کے تمام اقسام اچھے۔ یا ایسا نہیں؟

یہ تمام رونے اور ہنسنے کے وہ مختلف زاویئے ہیں جن پر بحث و گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ امام حسینؑ پر گریہ لذت بخش ہے جو انسان کے دل کو صفا اور روشنی بخشتا ہے۔ یہاں پر امام حسینؑ کے مکتب اور ٹریجڈی (Trajedy) اور کمیڈی (Comedy) کے درمیان ایک مقایسہ ہونا چاہئے۔ کمیڈی اور ٹریجڈی کی فلموں کی طرف اور اُن اشعار کیطرف جو ہمارے شاعروں نے گریہ اور مدح کے باب میں لکھے ہیں' ان سب کی طرف اشارہ ہونا چاہئے۔ جیسے کہ یہ شعر:

---

[۱] "غرض خاص" ایک منطقی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی وجہ سے انسان باقی حیوانوں سے جدا ہوتا ہے۔ (مترجم)

"گریہ بر ہر درد بے درماں دواست
چشم گریاں، چشمۂ فیض خداست"۔

یعنی "ہر لاعلاج درد کا علاج رونا ہے اور روتی آنکھیں خداوند عالم کے فیض ورحمت کا چشمہ ہیں"۔

رونا اور ہنسا انسان کے شدید ترین احساسی کیفیت کا مظہر ہیں۔ جب لوگوں کو رُلانے اور ہنسانے کی قدرت کسی کو حاصل ہو جاتی ہے تو در حقیقت وہ ان کے دلوں کا مالک ہو جاتا ہے اور پھر ان کے میل و محبت سے کھیلتا ہے۔ انسان کے قلب کا کام عقل کے کاموں سے ہٹ کر ہے۔ ابھی تک لوگوں کے دلوں کو عقل کے کنٹرول میں لائے بغیر اور بغیر کسی ہدف و مقصد کے یا امام حسینؑ پر رُلا کر کھیل کھیلا گیا ہے۔ بلکہ تنہا ہدف رکھنا بھی کافی نہیں، نظم و نسق بھی ہونا ضروری ہے۔

مجلّہ ریڈیو ایران کے شمارہ ۷۰ میں ڈاکٹر حسن علوی کا ایک علمی مقالہ ہے جس میں انہوں نے اشک چشم کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ہم اس کو یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مگرمچھ کے آنسو جھوٹے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ڈارون نے ۱۸۹۰ء میں اپنی کتاب بعنوان "انسان اور حیوان کے احساسات اور رنج والم" میں لکھا ہے کہ ہاتھی احساسات کے اثر کے تحت آکر گریہ کرتا ہے لیکن اس موضوع کی کسی وجہ سے ابھی تک تائید نہیں ہو سکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہنسنے کی بہت سی انواع واقسام ہیں جیسے محبت میں ہنسنا، کسی کے تمسخر میں ہنسنا، خوشی میں ہنسنا، کسی چیز سے متاثر ہو کر یا غصہ میں ہنسنا۔ اسی طرح رونا بھی ہر وقت غم واندوہ کی وجہ سے نہیں ہوتا اور یہ تو سب کو پیش آتا ہے اور گریۂ شوق کی لذت کو تو سب ہی نے چکھا ہوگا۔ مناظر میں سے بہترین منظر خوشی کے آنسو ہیں۔ میں یہاں پر اپنی بات کو حافظ کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

دل بسی خون بہ کف آورد ولی دیدہ بریخت

اللہ اللہ کہ تلف کرد و کہ اندوختہ بود ؟

"دل بہت خون بھر رہا لیکن آنکھوں نے بہادیا' اللہ اللہ ! جتنا جمع کیا تھا سب تلف کر دیا"۔

کتاب "کلیلہ و دمنہ" میں ایک عرب شاعر کہتا ہے کہ : اگر آنسو نہ ہوتے تو "وداع" کی سرزمین میں آگ لگ جاتی۔ سعدیؔ کہتا ہے : "بگذار تا بگریم چون . ." یعنی "مجھے چھوڑ دو تا کہ میں رولوں......"

حافظؔ کہتا ہے :

دل سنگین تورا اشک من آوردہ بہ راہ　　　سنگ را سیل تواند بہ لب دریا بُرد

"میرے آنسو تمہارے سنگین دل کو راہ پر لے آئے' پتھر کو سیلاب دریا کے کنارے لے جاسکتا ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆

تحریفِ کلمہ اور تحریفِ حادثۂ امام حسینؑ

امام حسینؑ کا حادثہ تحریفِ ظاہری' لفظی اور پیکری کا بھی شکار ہوا اور دوسری طرف اس میں معنوی' عقلی اور باطنی تحریف بھی ہوئی ہے۔ اِن مباحث پر بھی مفصّل گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں اسی کتاب میں "کربلا کے تاریخی واقعہ میں تحریفات کی یادداشت" کے عنوان سے بحث ہوئی ہے۔ اسی طرح اِس عنوان پر کتاب کی جلد اول میں بحث چھپ چکی ہے۔

امام حسینؑ نے خلفاء کے مقابل اور اسلام کے مقابل قیام کرنے کے درمیان تجزیہ کیا

قیام حسینی کا اثر:

ابا عبداللہ کے قیام کے بزرگ ترین آثار میں سے ایک اثر یہ ہے کہ آپؑ نے خلفاء کے مقابل قیام کرنے اور اسلام کے مقابل میں قیام کے درمیان تجزیہ و تحلیل کیا۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اگر امام حسینؑ یزید کے مقابل میں قیام نہ کرتے تو ممکن تھا کہ یزید کے سیاست نہ جاننے اور اس کے بُرے کاموں کی وجہ سے وہ لوگ جو اسلام سے کچھ بھی عشق و علاقہ نہیں رکھتے تھے، یزید کے خلاف قیام کرتے۔ اگر چہ ہمیں تاریخ اسلام میں بہت سے ایسے قیام نظر آتے ہیں جو دستگاہ خلفاء کے مقابل میں ہوئے ہیں لیکن خلفاء کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی حمایت کا پہلو بھی رکھتے ہیں، مثلاً بنو امیہ کے خلاف ایرانیوں کا قیام۔ لیکن ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ یہ امام حسینؑ تھے جنہوں نے پہلی بار ایک مسلح جماعت کی معیت میں خلافت کے مقابل قیام فرمایا۔ آپؑ کی ذات تھی کہ جس نے اسلام کو حکمران ٹولے سے جدا کر دیا بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دستگاہ حکومت کے خلاف قیام کرنے کا راستہ کھول دیا۔ آپؑ کا یہ قیام دوسروں کے لئے نمونہ اور دستور عمل بن گیا، نیز یہ کہ خلیفہ کا ہمیشہ اپنے آپ کو اسلام کے حامی کے عنوان سے پیش کرنے کا تاثر نقش باطل قرار پا گیا اور وہ اسلام کا حزب مخالف بن کر سامنے آ گیا۔

امام حسینؑ کے قیام سے پہلے بھی فردی یا اجتماعی قیام ہوتے رہے ہیں۔ لیکن وہ تمام قیام یا مسلح اور فردی قیام تھے یا پھر غیر مسلح گروہ کی صورت میں تھے۔ مسلح

اور اجتماعی انقلاب و شورش کا آغاز بہر حال امام حسینؑ نے کیا۔ (حضرت عثمانؓ کے خلاف جو قیام ہوا تھا' وہ بھی ایک لحاظ سے اسلام اور خلافت کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی نوعیت کا تھا)۔

اُن دنوں خلافت ایک عالی ترین سیاسی اور روحانی مقام سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ معروف ہے کہ خلفائے عباسی نے کسی حد تک اپنے روحانی مقام کی حفاظت کی۔ خلفائے جبّار کے اس روحانی مقام کو آخری بار جس شخص نے شکست دی اور پھر اس کو بلند ہونے نہیں دیا' وہ خواجہ نصیر الدین طوسی تھے' جو بہت بڑے شیعہ عالم ہیں۔ آپ ہلاکو بادشاہ کے شریک کار رہے تاکہ خلافت کی جبار دستگاہ کو اسلام کے درمیان سے ہٹا دیں۔ لیکن سعدیؔ مقام خلافت کے مرثیہ میں کہتا ہے:

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین از برای قتل مستعصم امیر المومنین

"امیر المومنین مستعصم کے قتل پر آسمان کو حق ہے کہ زمین پر خون برسائے"۔

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ حتیٰ شیخ سعدی بھی مقام خلافت کے روحانی جلال کے زیر اثر تھے۔

حادثہ کربلا کے دو چہرے

"واذقال ربك للملائكة انى جاعلٌ فى الارض خليفةً قالوا أتجعلُ فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء ونحن نسبّحُ بحمدك ونقدّس لك .قال انى اعلمُ مالاتعلمون".

"اے رسولؐ اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے گا' جبکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس

کرتے ہیں' تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

(سورۂ بقرہ آیت ۳۰)

انسان کی زندگی تاریکی اور روشنی' بدنمائی اور زیبائی' اچھائی اور برائی کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کو فرشتوں نے دیکھا تھا وہ ابن آدمؑ کا تاریک پہلو تھا اور جس کی طرف خدا نے اشارہ کیا' وہ ابن آدمؑ کا روشن پہلو تھا' جو تاریک پہلو پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

حادثۂ کربلا کے دو ورق ہیں' سیاہ ورق اور سفید ورق۔ سیاہ ورق پر ایک بہت بڑی جرم و جنایت کی داستان ہے' ایک بہت زیادہ تاریک اور وحشتناک واقعہ ہے۔ ہم آگے چل کر بے رحمی' قساوت قلبی' پستی اور نامردی کے تقریباً بیس (۲۰) مظاہر کی نشاندہی کریں گے جو اس واقعہ میں انجام پائے۔ اس زاویہ سے بے رحمی' قساوت قلبی اور درندگی کی آخری حد' اس واقعہ میں نظر آتی ہے۔

سفید ورق پر ایک ملکوتی داستان ہے' ایک انسانی حماسہ ہے۔ یہ ورق آدمیت' عظمت' صفا' بزرگی اور فداکاری کا مظہر ہے۔

پہلے ورق کے لحاظ سے یہ واقعہ ایک غم واندوہ ناک واقعہ ہے اور دوسرے ورق کے لحاظ سے یہ ایک پاک اور مقدس قیام ہے۔ اس واقعہ کے تاریک پہلو کے لحاظ سے اس کے قہرمان شمر' ابن زیاد' حرملہ' عمر سعد...... وغیرہ ہیں اور اس کے روشن پہلو کے لحاظ سے اس واقعہ کے قہرمان امام حسینؑ ہیں' ابوالفضل العباسؑ' علی اکبرؑ' حبیب ابن مظاہرؓ' زینب کبریٰؑ' ام کلثومؑ' ام وہبؓ اور ان کی مثل دوسری شخصیات ہیں۔ پہلے زاویہ کے اعتبار سے یہ واقعہ اس قابل نہیں کہ ۱۳۲۰ سال سے زیادہ عرصہ کے بعد بھی اس عظمت اور صمیم قلب کے ساتھ اس کے ذکر کی تجدید ہوتی رہے اور وقت' دولت' اشک اور احساسات اُس پر صرف ہوں۔ اس لحاظ

سے نہیں کہ ہم ایک ظلم و جنایت کے واقعہ سے استفادہ نہیں کر سکتے (ممکن ہے انسانی زندگی کے منفی پہلو سے بھی سبق لیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ لوگوں نے لقمان سے پوچھا: "تم نے ادب کس سے سیکھا"؟ جواب دیا: "بے ادبوں سے") اور نہ اس زاویئے سے کہ ظلم و جنایت کی یہ داستان زیادہ اہم نہیں یا کوئی سبق آموز داستان نہیں۔ چنانچہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ داستان اس زاویہ سے بھی اہم ہے اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ وفات پیغمبرؐ اسلام کے ۵۰ سال بعد خود مسلمانوں بلکہ شیعوں کے ہاتھوں امام حسینؑ کا شہید ہونا ایک نہایت ہی قابل توجہ معمّا ہے بلکہ اس واقعہ کا ظلم و جنایت کا پہلو اسی لئے قدر و اہمیت دینے کے قابل نہیں ہے کہ ایسے واقعات مختلف شکل و صورت میں بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ قرن اول، قرن دوم، قرن جدید اور خود ہمارے زمانے میں بھی ایسی جنایت کی بہت داستانیں گزری ہیں۔ چند سال قبل یعنی ۱۹۴۰ عیسوی میں ایک شہر پر بم گرا کر اس شہر کے ۶۰ ہزار چھوٹے، بڑے بے گناہ افراد مارے گئے۔ دنیا کے شرق و غرب میں جنایتی واقعات بہت ہو چکے ہیں اور اب بھی واقع ہوتے رہتے ہیں، مثلاً نادر شاہ ایک جنایتکار قہرمان ہے، اسی طرح ابو مسلم، بابک خرم دین، صلیبی جنگیں، اور اندلس کی جنگیں جنایت بشر کے عظیم مظہر ہیں۔

لیکن واقعہ کربلا نے دوسرے پہلو یعنی سفید ورق کے لحاظ سے بے پناہ قدر و قیمت پیدا کی ہے۔ اسی وجہ سے یہ واقعہ اس زاویے سے اپنا نظیر کم رکھتا ہے، بلکہ بے نظیر ہے۔ دنیا میں امام حسینؑ سے بھی افضل لوگ گزرے ہیں لیکن امام حسینؑ کی طرح کا کارزار اُنھیں پیش نہیں آیا۔ امام حسینؑ رسمی طور پر اپنے اصحاب اور اہل بیتؑ کو بہترین اصحاب اور بہترین اہل بیتؑ شمار کرتے ہیں۔

ہمیں اس واقعہ کے روشن اور نورانی پہلو پر بحث و گفتگو اور تحقیق کرنا چاہئے۔

اس واقعہ پر اسلئے گفتگو ہونا چاہیئے کہ یہ واقعہ آیت کریمہ :**انی اعلم ما لا تعلمون** کا مصداق ہے۔ اسلئے نہیں کہ یہ واقعہ آیہ **ومن یفسدُ فیھا ویسفکُ الدماء** کا مصداق ہے۔ اس زوایہ سے اس پر بحث و گفتگو ہونا چاہیئے کہ اس کے قہرمان امام حسینؑ اور زینب کبریٰؑ ہیں' اس زاویہ سے نہیں کہ عمر سعد اور شمر اس واقعہ کے قہرمان ہیں۔ (بنت الشاطی نے "بطلۃ کربلا" کے نام سے ایک بہت خوب کتاب لکھی ہے)۔

عواملِ نہضتِ امام حسین علیہ السلام

ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا؟

امام حسینؑ کے قیام میں چند عوامل پر نظر رکھنا چاہیئے :

الف۔ معاویہ امام حسینؑ سے یزید کی خلافت کے لئے بیعت اور دستخط چاہتا تھا۔ اس بیعت اور دستخط کرنے کے کیا اثرات اور لوازم تھے ؟ابو بکرؓ یا عمرؓ یا عثمانؓ کی بیعت کرنے یا معاویہ کے ساتھ صلح کرنے اور یزید کے ہاتھوں بیعت کرنے میں کیا فرق تھا؟ عقّاد کے بقول اس بیعت کا اولین اثر حضرت علیؑ پر سبّ و لعن کے عمل (جو معاویہ کے زمانہ میں شروع ہوا تھا) پر دستخط ثبت کرنے اور دوسری طرف یزید کے ولیعہد اور خلافت کا وارث ہونے پر دستخط ثبت کرنے کے مترادف تھا۔

ب۔ خود امامؑ نے فرمایا : اسلام میں ایک اصول ہے جس کے مطابق ظلم اور فساد کے مقابل میں سکوت اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور وہ اصول امر بہ معروف اور نہی از منکر ہے۔ خود آپؑ نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کیا : "**من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لِحرُمِ الله** ......"اور یہ بھی فرمایا : "**الاترون انّ الحق لایُعمل بهِ**......".

ج۔ اہل کوفہ نے آپؑ کو دعوت دی، آپؑ کے نام خطوط لکھے اور جناب مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھوں اٹھارہ (۱۸۰۰۰) ہزار افراد نے بیعت کی۔ ہمیں یہاں دیکھنا چاہئے کہ آیا امامؑ کے اس قیام کا اصلی عامل اہل کوفہ کی دعوت تھی یعنی اگر ان کی دعوت نہ ہوتی تو آپؑ کبھی بھی قیام یا مخالفت نہ کرتے اس کے ہاتھوں (نعوذباللہ) بیعت کر لیتے؟ یہ تمام باتیں امام حسینؑ کے عقیدہ اور رائے کے خلاف تھیں اور آپؑ قطعاً ایسا نہ کرتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوفہ میں امام حسینؑ کے بیعت سے امتناع کی خبر پہنچی تو اہل کوفہ جمع ہوئے، سب نے آپس میں عہد کیا اور دعوت نامہ لکھا۔ پہلے ہی روز جب مدینہ میں آپؑ سے بیعت طلب کی گئی، بلکہ معاویہ نے جب اپنی حیات میں ہی آپؑ سے یزید کے لئے بیعت طلب کی تو امام حسینؑ نے انکار کر دیا۔ یزید کی بیعت کرنا اس کی حکومت کو صحیح تسلیم کرنے کے مترادف تھا، جس کا لازمہ اسلام کی نابودی پر اِمضا (مُہر ثبت کرنا) تھا۔

"وعَلَیَ الاسلام السَّلامُ اذقدبُلیتِ الامۃُ براعٍ مثلُ یزید. پس بیعت سے انکار کا موضوع خود اصول پر مبنی تھا۔ امام حسینؑ حاضر تھے کہ شہید کر دیئے جائیں مگر بیعت نہیں کرینگے۔ کیونکہ بیعت کرنے میں جو خطرہ تھا اس کا رخ اسلام کی طرف تھا، نہ کہ خود امامؑ کی ذات کی طرف۔ بلکہ اس خطرہ کا رخ اسلام کی اساس یعنی حکومت اسلامی کی بنیاد تھا اور یہ ایک جزئی اور قابل تقیہ مسئلہ نہیں تھا۔

لیکن اس قیام کا دوسرا موضوع (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) اپنی جگہ اصول پر مبنی تھا۔ اس اصول میں اس پہلو کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ آیا وہاں پر امر بہ معروف اور نہی از منکر کے شرائط یعنی تبلیغ سے اثر ہونے اور اس سے

کسی نتیجہ کا احتمال تھا بھی یا نہیں ؟ خود امام حسینؑ کے فرمودات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اس بات کی طرف متوجہ تھے کہ آپ کے بعد آپ کا خون انقلاب لائے گا اور آپؑ کی شہادت سے لوگ خواب غفلت سے بیدار ہونگے۔ پس آپؑ کی شہادت مؤثر تھی۔ آپؑ کے فرمودات یہ ہیں :

"ثُمَّ ایم الله لاتلبثُون بعدها الا کریثما یُرکب الفرس حتی تدور بکم دور الرَّحیٰ وتقلق بکم قلق المحور" .

"پھر خدا کی قسم! اس کے بعد تم اتنی ہی دیر رہ سکو گے جتنی دیر گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتی ہے۔ یہاں تک کہ چکی کی گردش تم کو گردش دے گی اور پیس ڈالے گی"۔

یاریاش کے نقل کے مطابق کسی شخص کے جواب میں فرمایا :

"ان هولاء اخافونی وهذه کتب اهل الکوفه وهم قاتلی فاذا فعلوا ذالك ولم یدعوا لله محرما الا انتهکوه بعث الله الیهم من یقتلهم حتی یکونوا اذل من قوم الامة. (فرام الامة)".

"ان لوگوں نے مجھے ڈرایا ہے۔ یہ اہل کوفہ کے دعوت نامے ہیں۔ یہی میرے قاتل ہیں۔ مجھے قتل کرنے کے بعد پھر یہ کسی حرمت کی ہتک سے گریز نہیں کرینگے۔ خداوند عالم ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کردیگا جو انہیں قتل کردینگے یہانتک کہ وہ خرقۂ حیض سے بھی زیادہ ذلیل تر ہوجائینگے"۔

اسی طرح کا جملہ اپنے اہل بیتؑ سے دوسری وداع کرتے وقت فرمایا :

"استعدوا للبلاء واعلموا ان الله حافظکم ومنجیکم من شر الاعداء ویعذب اعادیکم بانواع البلاء".

"تم لوگ ہر قسم کی مصیبتوں کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور یہ جان لو کہ خدا تم سب کا حافظ اور مددگار ہے اور وہی تمہیں دشمنوں کے شر سے نجات دے گا اور وہی تمہارے دشمنوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرے گا"۔

لیکن یہ تیسرا عامل بس اسی قدر مؤثر تھا کہ ان کے خطوط سے امام کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن اگر کوفہ نہ گئے ہوتے تو کیا آپؑ کے لئے کوئی امن وامان کی جگہ تھی؟ اگر امامؑ مکہ یا مدینہ میں رہتے تو وہاں بھی آپؑ کو خطرہ لاحق تھا کیونکہ آپؑ یزید کی بیعت سے انکار کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ یزید کی خِلافت پر معترض بھی تھے۔ امام حسینؑ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ حرم خدا میں شہید کئے جائیں۔ اسی طرح شاید حرم نبویؐ میں بھی شہید ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ امام حسینؑ نے وسطِ راہ میں اصحاب حُر ریاحی سے جو فرمایا تھا اور عمر سعد نے ابن زیاد کے نام جو خط لکھا تھا' اس سے بھی پتہ چلتا ہے اور خود آپؑ نے کربلا میں بھی یہی فرمایا تھا کہ اگر تم لوگ میرے آنے پر راضی نہیں ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں"۔

آپؑ کے اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کوفہ کی دعوت کوفہ آنے کی وجہ ضرور بنی لیکن ان کے خطوط کی وجہ سے آپؑ نے قیام نہیں فرمایا۔ اسی وجہ سے آپؑ نے فرمایا اگر تم لوگ راضی نہیں ہو تو میں کوفہ سے واپس چلا جاؤں گا اور یہ نہیں فرمایا کہ اب جب کوفہ کے لوگ پشیمان ہوئے ہیں اور انہوں نے وعدہ شکنی کی ہے تو میں بیعت کروں گا یا یزید کی خلافت کے بارے میں جو اعتراض کیا تھا' اس کو واپس لے لوں گا اور خاموش رہوں گا۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ کوفہ والوں کے خطوط نے فقط آپ کو کوفہ کی طرف متوجہ کیا تھا' ورنہ خطوط قیام کا سبب نہیں تھے۔

یہاں کچھ مسائل ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری ہے:

۱۔ معاویہ کے مرنے سے پہلے ہی اہل مدینہ' خصوصاً امام حسینؑ کے بیعت سے انکار

کامسئلہ موردِ بحث تھا۔ آپؑ نے بہت درشت لہجے میں معاویہ کے خط کا جواب دیا تھا اور اس میں یزید کی ولیعہدی کے موضوع پر اعتراض اور انتقاد فرمایا تھا۔ (اس سلسلہ میں کتاب "سرمایہ سخن" اور "ابو شہداءؑ" سے رجوع کریں)۔

۲۔ یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ اسلام میں ایک بہت بڑی بدعت تھی۔ یہ نقشہ بنو امیہ نے ۳۰ سال سے زیادہ عرصہ پہلے کھینچا تھا۔ ابو سفیان نے حضرت عثمانؓ کے گھر میں کہا تھا: "**تلقفوها تلقف الكُرة ولتصيرن ......اما والذى يحلف به ابو سفيان لا جنة ولا نار**". "جو کچھ بھی ہے وہ حکمرانی، سلطنت اور فرمانروائی ہے، حق و حقیقت اور جنت و جہنم کچھ بھی نہیں۔ اس گیند کو اپنے میدان سے خارج نہ ہونے دو، ایک دوسرے کو پاس دیتے رہو اور اس کو موروثی قرار دے دو"۔

چنانچہ اس لحاظ سے یہ ایک فوق العادہ مہم تھی۔ یہ نہ تو کسی شوریٰ یا عمومی رائے سے منطبق ہوئی تھی اور نہ ہی حکمِ الٰہی کا یہاں کوئی دخل تھا۔ پس یہاں منشاء فقط باپ کا بیٹے کو منصب پر نصب کرنا تھا۔

۳۔ کسی کا خلیفہ ہونے کو تسلیم کیا جانا اس وقت جواز رکھتا ہے کہ جب اختلاف دوسرے فرد کی اصلحیت کی بنیاد پر ہو لیکن جہاں غیر صالح فرد تمام امور مسلمین کو اسلامی مدار اور محور پر چلا رہا ہو، وہاں یہ موردِ جواز نہیں ہوتا، جیسا کہ امام علیؑ نے فرمایا: "**والله لاسلمن ما سلمت امور المسلمين ولم يكن فيها جور الا علىّ خاصة**".

"اور خدا گواہ ہے کہ میں اسوقت تک حالات کا ساتھ دیتا رہوں گا جب تک مسلمانوں کے مسائل ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۷۴)

۴۔ بیعت' عقد ہوتا ہے۔ یہ خرید و فروخت' کرایہ پر لینا یا دینا اور نکاح کے عقد کی طرح عہد آور ہوتا ہے۔ جب کسی کے ہاتھوں بیعت کی جاتی ہے تو اس پر ڈٹا رہنا بھی لازم ہوتا ہے اور پھر یہ توڑی نہیں جاسکتی۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: "کسی کافر کے ساتھ بھی کیا ہوا کوئی عہد توڑنا نہیں چاہئے' کیونکہ اگر ایسا کریں تو امان باقی نہیں رہتا"۔

۵۔ خلیفۂ وقت اگر منحرف ہو جائے تو اس پر اعتراض کرنے کا مسئلہ اگرچہ کہ یہ اس کے معزول ہونے کا سبب بھی ہو' اسلام میں خود ایک مسئلہ ہے' جو امر بہ معروف اور نہی از منکر کے نام سے معروف ہے۔ امام حسینؑ نے مکرر اپنے قیام اور نہضت میں اس اصول سے استناد فرمایا ہے۔ اس اصول کی شرط یہ نہیں ہے کہ کسی کا خون بہایا نہ جائے' اس کی شرط یہ ہے کہ اس کا انتہائی نتیجہ اسلام کے نفع میں ہو' جیسے کفار سے جہاد ہے۔

۶۔ کوفہ والوں کا امام حسینؑ کو دعوت دینا اور ان لوگوں کا اتمام حجت کرنا' خود ایک جداگانہ بحث ہے۔ امام عالی مقامؑ نے بھی اس پر بہت عاقلانہ اور مدبرانہ طور پر عمل کیا۔ سب سے پہلے تو ان کے خطوط کے جواب دیئے۔ چند دفعہ وفود کی آمد و رفت ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنا نمائندہ ان کی طرف بھیجا۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ بھی علوی سیاست بروئے کار لائے' یعنی لوگوں سے مکر و فریب کئے بغیر یا ان کو غفلت میں رکھے بغیر صراحت کے ساتھ پیش آئے۔ نہ لوگوں سے کوئی رقم لی اور نہ ہی رؤسا میں کوئی رقم تقسیم کی۔ جناب مسلمؑ کی پوری سیاست میں کہیں نہیں ملتا کہ ہدف کو وسیلہ پر قربان کیا ہو۔ امام عالی مقام کہ جن کا بیعت سے انکار قطعی تھا' اسی طرح اس پر تصمیم اعتراض بھی قطعی اور یقینی تھا۔ ان لوگوں کو آپؑ نے مثبت انداز میں جواب دیا۔

امام حسینؑ کے عین ایام حج میں مکہ سے حرکت کرنے کی ایک علت تو یہ تھی کہ آپ کے لئے فائدہ اٹھانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اور دوسری علت یہ تھی کہ آپکو ایک بہت بڑا خطرہ در پیش تھا۔ حرکت کے لئے یہ مفید موقع تھا' اس لئے کہ آٹھ ذی الحجہ کو سب لوگ عازم عرفات اور اعمال حج انجام دینے میں مشغول تھے۔ آپؑ کا یہ عمل مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا اہم مسئلہ پیش آیا کہ فرزند پیغمبرؐ اعمال حج کو انجام دینے سے منصرف ہو گئے اور دوسری جانب چلے گئے۔ آپؑ کا یہ عمل موقعیت کے لحاظ سے اصطلاح میں اعلیٰ تھا۔ جہاں تک دوسری علت کا تعلق ہے کہ آپؑ کو خطرہ تھا' اعمال حج کے دوران آپ کو مارے جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ کتاب ''سرمایۂ سخن'' سے نقل کے مطابق عمرو بن سعید بن العاص ایک فوجی دستے کے ساتھ اس کام پر مامور ہوا کہ امام حسینؑ کو مکہ ہی میں شہید کر دے۔ خود امامؑ نے فرزدق سے فرمایا: ''اگر میں مکہ سے باہر نہ آتا تو مجھے شہید کر دیا گیا ہوتا''۔ کتاب ''منتخب طریحی'' میں لکھا ہے کہ تیس (۳۰) افراد کو خفیہ طور پر مامور کیا گیا تھا کہ امام حسینؑ کو اعمال حج کے دوران قتل کر ڈالیں اور بعد میں یہ ظاہر کریں کہ ذاتی دشمنی اور تنازعہ کی وجہ سے آپؑ قتل کئے گئے یا یہ کہیں کہ سعد بن عبادہ کی طرح جنوں نے آپؑ کو مارا ہے۔ پس جو بھی ہو' اگر اہل کوفہ کی دعوت نہ ہوتی' تب بھی موسم حج میں جو ازدحام ہوتا ہے اس کی آڑ میں آپؑ کو شہید کئے جانے کا خطرہ یقینی تھا۔ اس وجہ سے آپؑ یہ مصمم ارادہ کر چکے تھے کہ ایام حج میں مکہ میں نہیں رہنا ہے۔ حالتِ احرام میں آپؑ اسلحہ تو ساتھ رکھ نہیں سکتے تھے اور اس کے علاوہ بیت اللہ کی بڑی توہین اور بے حرمتی بھی تھی کہ وفات پیغمبرؐ کے پچاس (۵۰) سال بعد فرزند پیغمبرؐ کو ''و

من دخله کان آمناً" کے احاطہ میں شہید کر دیا جائے۔

پس بنابر این امام حسینؑ کی نظر میں اس وقت مکہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ جانا ضروری تھا۔ اگر ہم اہل عراق کی دعوتوں سے صرف نظر بھی کریں، تب بھی امام حسینؑ کے لئے کوفہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔

۷۔ امام حسینؑ کو دوسرے عامل کے لحاظ سے، یعنی امت اسلامی کی اصلاح کے وظیفہ کو انجام دیتے ہوئے اپنی شہادت مفید نظر آرہی تھی۔ آپؑ احساس کر رہے تھے کہ یہ ایسا موقع ہے کہ اگر شہید ہو جائیں گے تو ضایع اور تلف نہیں ہونگے۔

☆☆☆☆☆☆

ہم اس مطلب کو زیادہ جامع اور کامل صورت میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔

کربلا کے حادثہ میں چند جہات ہیں :

۱۔ تنہا امام حسینؑ کی شخصیت خلافت کے لائق، منصوص من اللہ اور وارث تھی۔ یزید نالائق اور غاصب تھا۔ خلفائے وقت سے امام حسینؑ کی وضع اور آپؑ کے پدر اور فرزندان کی وضع یکساں تھی۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ فقط اس لحاظ سے امامؑ کے اوپر کیا وظائف مترتب ہوتے تھے۔

۲۔ وہ لوگ امامؑ سے بیعت لینا چاہتے تھے اور کسی بھی صورت میں اس سے صرف نظر کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ خود "بیعت" کیا ہے اور یہ کیا اثرات رکھتی ہے۔ اور جب انہوں نے بیعت لینا چاہی تو امامؑ کا کیا وظیفہ تھا؟

۳۔ اسوقت احکام اسلامی اور اجرائے حدود الٰہی کے لحاظ سے اوضاع واحوال مسلمین بہت خراب ہو چکے تھے، اسلام کے اصلی اصولوں کے ساتھ کھیل

کھیلا جارہا تھا۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ "امر بہ معروف" کا جو حکم ہے، جس سے خود امامؑ بارہا استناد کرتے رہتے تھے، اس کے مطابق امامؑ کے کیا وظائف تھے؟

۴۔ کوفہ کے لوگوں نے امامؑ کو دعوت دے دی اور ایک قسم کی اتمام حجت کرلی، اب ان کی یہ دعوت امامؑ پر کیا وظیفہ عائد کرتی تھی؟

۵۔ یزیدیوں نے آخر میں امامؑ کو دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا اختیار دیا تھا، یا تسلیم ہو جائیں یا پھر شہید ہو جائیں۔ اس لحاظ سے امامؑ پر کیا وظیفہ عائد ہوتا تھا؟

جہاں تک امامؑ کی خلافت کے لئے حقدار ہونے کی بات ہے تو اگر اس بات کے ساتھ کوئی دوسری شرط نہ ہو یعنی فقط ایک شخص نے اپنی جگہ بدل لی ہو اور غیر حقدار آکر بیٹھ گیا ہو، تو حق دار اور غیر حقدار میں جس قدر تفاوت ہے، اس لحاظ سے یزید خلافت کیلئے سزاوار ہونے کے حق سے کوسوں دور ہے (امام حسینؑ کے مقابل یزید کی خلافت حقدار اور غیر حقدار ہونے کے تناسب سے بھی باہر ہے)۔ اس بحث کا لازمہ یہ ہے کہ آیا خلیفہ اصلح ہونا چاہئے یا غیر اصلح بھی کافی ہے؟

ایسی صورت میں امامؑ کا وظیفہ فقط اپنے حق کا مطالبہ کرنا ہے۔ اگر اعوان وانصار کافی تعداد میں موجود ہوں تو قیام کریں، وگرنہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں جیسا کہ حضرت علیؑ نے ابوبکرؓ کی خلافت کے موقعہ پر فرمایا: "افلح من نهض بجناح او استسلم فاراح"۔ "کامیاب وہ ہے جو اگر اٹھے تو بال وپر کے ساتھ اٹھے، ورنہ کرسی کو دوسروں کے حوالے کر کے اپنے کو آزاد کرلے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵) اور عثمانؓ کی خلافت کے موقعہ پر فرمایا: "واللہ لاسلمن ماسلمت امور المسلمین ولم یکن فیها جور الا علی خاصة"۔

حضرت علیؑ اپنے زمانہ کے خلفاء کے عدالتی، سیاسی اور علمی مسائل میں انکی ہمکاری کرتے تھے۔ یعنی ان کو مشورہ دیتے، موقعہ کی مناسبت سے ان کی تائید کرتے اور انہیں تقویت پہنچاتے تھے۔ چنانچہ مولاؑ کے بتائے ہوئے فیصلے، مشورے اور علمی جوابات مشہور ہیں۔

یہاں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ معاشرہ کے تمام لوگوں کے افکار اجمالاً کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر لوگ جہالت اور عدم تشخیص (امام کو نہ پہچاننے) کی وجہ سے امامِ حق کو نہ چاہتے ہوں تو زور اور طاقت کے ذریعے ان لوگوں پر خدا کے احکام کو نہیں لادا جاسکتا۔ اسی وجہ سے بیعت کرنا لازمی ہے۔

دوسرا سوال کہ بیعت کیا ہے؟ ہم نے بیعت کی جو تعریف نکالی ہے وہ وہی ہے جو "نہایۃ" میں ابن اثیر نے مادّۂ "بیع" سے لی ہے۔ کہتے ہیں: "وفی الحدیث :الا تبایعونی علی الاسلام.هو عبارة عن المعاقدة علیه و المعاهدة، کانّ کل واحد منهما باع ماعنده من صاحبه واعطاه خالصة نفسه و طاعته ودخیلة امره" اسلام کے ساتھ معاہدہ اور عقد باندھنے کو بیعت کہتے ہیں۔ بیعت میں طرفین میں سے ایک اپنی تمام دارائی کو دوسرے کے لئے بیچ دیتا ہے اور خلوص نفس، اطاعت اور اپنے داخلی وباطنی امور کو بھی اس کے سپرد کردیتا ہے۔

بیعت فقط حاکم اور سلطان کے لئے ہوتی ہے، دو دوست آپس میں رفاقت کا جو عہد وپیمان کرتے ہیں، اسے بیعت نہیں کہتے۔ یعنی بیعت میں ایک طرف سے کلی طور پر دوسرے کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔ (تفصیل کیلئے "کشاف" اور "مجمع البیان" سے رجوع فرمائیں)۔

قرآن کریم میں بھی بیعت کا ذکر آیا ہے:

"لقد رضی الله عن المومنین اذیبایعونك تحت الشجرة".

"یقیناً خدا اصحابان ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے"۔ (سورۂ الفتح آیت ۱۸)

اور دوسری جگہ پر ارشاد ہوا:

"......اذا جائك المومنات یبایعنك علی ان لا یشرکن بالله و لایسرقن ولایذنین ولایقتلن اولادھن......".

"......اگر ایمان لانے والی عورتیں آپ کے پاس اس امر پر بیعت کرنے کے لئے آئیں کہ کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گی اور چوری نہیں کریں گی' زنا نہیں کریں گی۔ اولاد کو قتل نہیں کریں گی......"۔ (سورۂ ممتحنہ آیت ۱۲)

پیغمبر اکرمؐ نے غدیر خم میں حضرت علیؑ کے لئے بیعت لی۔ "لیلۃ العقبۃ" میں اہل مدینہ نے پیغمبر اکرمؐ کی بیعت کی' سقیفہ میں لوگوں سے بیعت لی گئی اور اسی بیعت نے کام تمام کر دیا۔ لوگوں نے متوجہ ہونے کے بعد بھی اپنی اس بیعت کو نہیں توڑا۔ حضرت علیؑ نے زمان خلافت میں لوگوں سے بیعت لی' زبیر بعد میں پشیمان ہوئے تو کہا: میری بیعت ظاہری تھی۔ نہج البلاغہ خطبہ ۸ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

یزعم انه قد بایع بیده ولم یبایع بقلبه فقد اقربالبیعة و ادعی الولیجة فلیات علیها بامر یعرف والا فلیدخل فیما خرج منه

"زبیر کا خیال ہے کہ اس نے صرف ہاتھ سے میری بیعت کی ہے لیکن اس کا دل اس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اپنی بیعت کا تو اقرار کرتا ہے اور بے دلیل دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا باطن موافقت نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے اس کی واضح دلیل فراہم کرنی پڑے گی' ورنہ جس بیعت سے وہ نکل

گیا ہے' اسمیں داخل ہو جائے گا"۔

امامؑ نے اس خطبہ میں بیعت توڑنے کے اصول کی رو سے زبیر کے خلاف استدلال کیا ہے۔ بہر حال امامؑ یہاں پر بیعت کو ایک لازمہ کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح آپؑ نے نہج البلاغہ خطبہ ۳۴ میں فرمایا:

"ان لی علیکم حقاً' ولکم علّی حقّ' فاما حقکم علّی فالنصیحة لکم' وتوفیر فیئکم علیکم' وتعلیمکم کیلا تجھلوا' وتادیبکم کیما تعلموا[۱۰] واما حقی علیکم فالوفاء بالبیعة والنصیحة فی المشھد والمغیب والاجابة حین ادعوکم والطاعة حین امرکم".

"میرا تم پر ایک حق ہے' نیز تمہارا مجھ پر ایک حق ہے۔ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی اور غمخواری کروں اور بیت المال میں جو کچھ ہے' بغیر کم و کاست تم تک پہنچادوں اور تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم نادان نہ رہ جاؤ اور تمہیں ادب سکھاؤں تاکہ جانو اور عمل کرو۔ اور میرا تم پر حق یہ ہے کہ تم اپنی بیعت سے وفادار رہو اور میری موجودگی اور غیر حاضری' ہر حال میں خیر خواہ رہو۔ جب پکاروں تو لبیک کہو اور جب حکم دوں تو اسے بجالاؤ"۔

اسی لئے اصحاب جمل "ناکثین" (یعنی بیعت توڑنے والے) کے نام سے معروف ہوئے۔ امام زمانؑ کے بارے میں ہے کہ وہ غیب میں اسلئے گئے تاکہ انؑ کی گردن پر کسی کی بیعت نہ رہے۔

امام زادگان اور وہ تمام لوگ جو خلفاء کے خلاف قیام کرنا چاہتے تھے' جیسے محمد

۱۰۔ ابن میثم نے "تعملوا" کی جو شرح کی ہے' وہ درست ہے۔

نفس زکیہ اور زید بن علی وغیرہ' انہوں نے اپنے تابعین سے بیعت لی تھی۔ جناب ابو حنیفہ نے فتویٰ دیا کہ اہل مدینہ کی عباسیوں کے لئے کی ہوئی بیعت درست نہیں کیونکہ اس سے پہلے وہ محمد نفس زکیہ کی بیعت کر چکے ہیں۔ امام صادقؑ نے فرمایا: "میں محمد نفس زکیہ کی بیعت کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ ان کا قیام امر بہ معروف کے لئے ہو نہ کہ مہدویت کے لئے"۔ خود امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے بیعت لی تھی۔ شب عاشورا آپؑ نے فرمایا: "میں نے تم سب کی گردنوں سے اپنی بیعت اٹھالی ہے"۔ "انتم فی حل من بیعتی" (تم میری بیعت سے باہر ہو)۔ جناب مسلم بن عقیل نے اہل کوفہ سے امامؑ کے لئے بیعت لی۔ معاویہ نے حضرت امیر المومنینؑ کو لکھا کہ: "و كنت تقاد كمايقاد الجمل المخشوش" "آپؑ کو بیعت کے لئے اونٹ کی مانند مہار کھینچتے ہوئے لے گئے"۔ امیر المومنینؑ نے جواب میں لکھا:

وقلت: " انی كنت اقاد كما يقاد الجمل المخشوش حتى ابايع ولعمر الله لقد اردت ان تذم فمدحت وان تفضح فافتضحت ! وما على المسلم من غضاضة فی ان یکون مظلوماً مالم يكن شاكا فی دينه ولا مرتابابيقينه 'وهذه حجتی الى غيرك قصدها ولكنی اطلقت لك منها بقدر ماسَنَحَ من ذكرها".

"اور تیرا یہ کہنا کہ میں اس طرح کھینچا جارہا تھا جس طرح نکیل ڈال کر اونٹ کو کھینچا جاتا ہے تاکہ میں بیعت کرلوں۔ خدا کی قسم تو نے میری مذمت کرنا چاہی مگر ستائش کر بیٹھا اور رسوا کرنا چاہا تھا مگر خود رسوا ہو گیا۔ البتہ مرد مسلمان کیلئے نہ کوئی عار ہے' نہ عیب کہ وہ مظلوم واقع ہو' جب تک کہ وہ دین میں شک میں مبتلا نہ ہو اور اپنے یقین سے شبہ میں نہ پڑ جائے۔ البتہ میری

دلیل کا رُخ دراصل دوسروں کے لئے ہے، لیکن جس قدر لازم تھا میں نے تم سے بھی بیان کر دیا"۔ (نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۲۸)

یہاں پر سوال پیش آتا ہے کہ بیعت میں کیا چیز لازم آتی ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ لوگوں سے بیعت لیتے تھے؟ اور شرعی لحاظ سے کیا بیعت کے ذریعہ ذمہ داری قبول کرنا اثر آور ہے؟ آیا اگر لوگ بیعت نہ کرتے تو ان پر پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت واجب نہیں تھی؟ بالآخر کس لئے امیر المومنینؑ بیعت کی استناد پیش کرتے ہیں؟

معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر بیعت صرف اعتراف اور اظہار آمادگی ہے، ایک وجدانی قول ہے۔ پیغمبر اکرمؐ لوگوں سے جو بیعت لیتے تھے، وہ اسی جہت سے تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اہلِ عرب کی خصلت یہ تھی کہ وہ اپنے قول اور بیعت کو توڑا نہیں کرتے تھے۔ ان کا بیعت کرنا، آجکل فوجیوں اور وکلاء کے قسم کھانے کی طرح ہے کہ کسی بھی حالت میں کوئی بھی اپنی مملکت سے خیانت نہیں کرے گا۔ لیکن یہ قسم جو کھاتے ہیں وہ اپنے وجدان کو کنٹرول میں رکھنے اور تاکید کے لئے ہوتی ہے۔ جب تک ایک شخص بیعت نہیں کرتا اس پر فقط وہی ایک اجتماعی وظیفہ ہے اور وہ تاویل اور تفسیر کرنے کے قابل رہتا ہے۔ لیکن بیعت کرنے سے ایک شخص خاص طور پر دوسرے کے لئے اعتراف کرتا ہے۔ پھر ابہام کا مقام نہیں رہ جاتا اور اسکے بعد وہ اپنے وجدان کو بھی دوسرے کے پاس رہن رکھ دیتا ہے۔ اور یہ بعید نہیں کہ جب بیعت کرے تو شرعاً عمومی وظیفہ سے زیادہ اسپر لازم ہو جاتا ہو۔

بیعت بعض مواقع پر فقط ایک عہد و پیمان ہوتا ہے جہاں بیعت کرنے سے پہلے اس شخص پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر خلافت شوریٰ کے ذریعے وجود میں آتی ہے، نہ کہ نص قرآنی کے تحت تو اس میں بیعت کرنے سے پہلے اس

شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی لیکن جب بیعت کرلیتا ہے تو خلیفہ کے حکم کو ماننااس پر لازم ہو جاتا ہے۔ امیر المومنینؑ جو زبیر اور غیر زبیر کی بیعت کے بارے میں استناد پیش کرتے ہیں، در حقیقت اس میں مسئلہٴ منصوصیت کو ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی خلافت نے بے اثر کر دیا تھا۔ یہاں پر آپ اس شرعی اصول سے صرف نظر کر کے ایک اور اصول سے استناد فرمارہے تھے اور وہ اصول بھی شرعی ہی تھا۔ جیسا کہ خود خلفاء بھی حضرت علیؑ کی خلافت کے لئے موجود نص کو چھوڑ کر اصول اسلام میں سے ایک اور اصل کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے اور وہ سند بھی محترم تھی۔ وہ سند سندِ شوریٰ تھی۔

”وشاورھم فی لامر“۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹)

”اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو“۔

”وامرھم شوری بینھم“ (سورۂ شوریٰ آیت ۳۸)

”ان کے کام باہمی مشورہ کے ذریعے انجام پاتے ہیں“۔

اس زمانے کی بیعت اور ہمارے زمانہ کے ووٹ دینے میں تھوڑا ہی فرق ہے۔ ووٹ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو فقط اپنے لئے نمائندہ کے طور پر چننا، لیکن ہر کام میں اس کی اطاعت نہیں ہوتی۔ بیعت یہ ہے کہ خود کو اس کے حکم کو تسلیم کرنے پر وقف کر دے۔ بیعت ووٹ سے زیادہ قوی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر امام حسینؑ بیعت کر لیتے تو آپؑ کی اِس بیعت کے کیا معنی ہوتے؟

اس مرحلہ میں یعنی بیعت سے انکار کے مرحلہ میں امام حسینؑ کا وظیفہ ایک منفی وظیفہ تھا (چوتھے اور پانچویں مرحلہ کی طرح)۔ بیعت نہ کرنا مرحلہ اول اور سوم کے بر خلاف ہے جبکہ ان دونوں میں مثبت وظیفہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے امام حسینؑ ”نہ“ کہتے ہیں۔ یہاں پر اپنے ہاتھ کو پیچھے کھینچنا ہوتا ہے، جگہ کو خالی

کر دینا ہوتا ہے۔ اس وظیفہ کی رو سے اگر امام ملک سے باہر چلے جاتے تو آپؑ کا وظیفہ انجام پاجاتا اگر پہاڑوں کے درمیان چلے جاتے جہاں پر آپؑ تک کسی کی رسائی نہ ہو سکتی (ابن عباس کے بقول شعاب الجبال میں چلے جاتے) تو آپ اپنا وظیفہ انجام دے چکتے، یا فرض کریں آپ کہیں کسی گھر میں چھپ گئے ہوتے، تب بھی آپ کا وظیفہ انجام پاجاتا۔ لیکن جب کوئی زور وزبردستی کے ذریعہ بیعت کا مطالبہ کرے تو آپؑ اس وقت معذور نہیں تھے۔ اسلام کی نظر میں جبر اور اکراہ کا جواز ان مسائل میں نہیں ہوتا: رفع مااستکرھوا علیہ ولا ضَرر ولاضِرار۔ یہ ان مواقع پر ہے کہ جہاں اسلام پر ضرر وارد نہ ہوتا ہو۔ مثلاً اگر کسی کو اسلام کے خلاف یا قرآن کے خلاف کتاب لکھنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اپنی مجبوری کو جواز بنا کر اسلام و قرآن کے خلاف کتاب نہیں لکھ سکتا۔

یہاں پر اس نکتہ کو بھی بتانا ضروری ہے کہ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے معاویہ کے زمانہ میں کیوں اقدام نہیں کیا؟ اور بعض دوسرے لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ اس زمانے میں چونکہ امام حسنؑ کے صلح کا موضوع درمیان میں تھا اور امام حسینؑ اپنے بھائی کے عہد و پیمان کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے تھے، اس وجہ سے قیام نہیں کیا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ معاویہ خود پیمان شکنی کر چکا تھا۔ قرآن کریم عہد و پیمان کا احترام کرنے کا حکم اس وقت تک دیتا ہے جبتک دوسرا احترام کرے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ اگر دوسرا فریق عہد کو توڑ دے تو تم پھر بھی وفادار رہو، بلکہ فرماتا ہے: "**فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم**"۔ "جب تک وہ لوگ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی قائم رہو" (سورۂ توبہ آیت ۷)۔ البتہ کافر سے بھی عہد و پیمان محترم ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش کے ساتھ ایک قرارداد منظور کی لیکن جب ان کی طرف سے اس

میں نقص شروع ہوا تو پیغمبر اکرمؐ نے بھی اس کو ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ سید الشہداءؑ کے اس وقت عدم قیام کی علت یہ تھی کہ آپ ایک بہتر اور اچھے موقع کے انتظار میں تھے۔ اسلام جنگی حُسنِ تدبیر اور بہتر موقع کے انتظار کو جائز بلکہ واجب قرار دیتا ہے۔ مسلماً امام حسینؑ کے لئے معاویہ کے مرنے کے بعد کا موقع خود اس کے زمانے سے بہت بہتر تھا۔ البتہ امامؑ معاویہ کے زمانے میں بھی ساکت نہیں رہے۔ ہمیشہ اس پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ معاویہ کے نام ایک خط ۱۰؎ کے ذریعہ آپؑ نے برابری سے اس سے احتجاج کیا۔ مسلمان اکابرین کو جمع کر کے ان سے اسکے بارے میں باتیں کیں۔ مسلح قیام کے لئے بہترین موقع یہ جانا کہ معاویہ کے مرنے تک صبر کریں' پھر قیام کریں۔ امامؑ قطعی طور پر جانتے تھے کہ معاویہ یزید کو اپنی جگہ منصوب کریگا اور لوگوں کو اپنے مرنے کے بعد یزید کی اطاعت کرنے کی دعوت ضرور دے گا۔ لہٰذا امامؑ کی نظر میں یزید کا خلافت پر آنا ایک نئی اور غیر متوقع چیز نہیں تھی۔

۱۰؎۔ اس بارے میں کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کا مقدمہ اور کتاب "سرمایہ سخن" کی طرف رجوع کریں۔

شب عاشورا امام حسینؑ کا اپنے اصحابؓ کو جمع کر کے اُنسے باتیں کرنا۔ توحید و ایمان و عظمت اور شکست قبول نہ کرنیکا درس

حادثۂ کربلا کے روشن مظاہر اور اس کی سب سے بڑی الٰہی تجلیات میں سے ایک 'شب عاشورا حسینؑ بن علیؑ کا اپنے اصحاب کو جمع کر کے اس نازک موقعہ پر' نامساعد حالات ہوتے ہوئے بھی ان سے سخنرانی کرنا ہے۔ ہمیں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ سخنرانی شب عاشور ہوئی تھی۔ جبکہ ہر طرف سے ناامیدی اور نامساعد حالات احاطہ کئے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں ہر وہ سردار اور لیڈر جو فقط مادی فکر رکھتا ہو' اس کی زبان پر بجز شکوہ و شکایت کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی منطق یہ ہوتی ہے کہ افسوس ہماری قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ تف ہے اس زندگی اور اس زمانے پر۔ جیسا کہ نپولین کہا کرتا تھا کہ حالات نے ہمارا ساتھ نہیں دیا' اس کی تمام باتیں زمانے سے شکایت اور یاس وناامیدی کا اظہار ہیں۔ امام حسینؑ کے لئے یہ سخت ترین اور انتہائی تکلیف دہ وقت تھا کہ آئندہ ۲۴ گھنٹے کے اندر آپکی بیویاں' بچے اور بہنیں دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو جائینگی۔ ایک غیور اور فداکار مرد کے لئے یہ بہت زیادہ ناگوار بات ہے۔

ایسے حالات میں دوسرے لوگوں نے کیا کیا ہے؟ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ جب ''المقنع'' نظر بند ہوا اور حالات ناموافق ہوئے اور ناامیدی چھاگئی تو اس نے سب سے پہلے اپنے تمام خاندان کو مار دیا اور اس کے بعد خودکشی کر لی۔ اسی طرح بنوامیہ کے ایک خلیفہ نے کیا تھا' جب وہ گرفتار ہوا تھا۔ تاریخ میں ایسے بہت سے نمونے ملیں گے۔ لیکن جب حسینؑ بن علیؑ نے سخنرانی کرنا شروع کی تو فرمایا:

"اثنی علی الله احسن الثناء واحمده علی السّراء والضّراء اللهم انی احمدك ......"

"خداوند عالم کی حمد وثنا کرتا ہوں، بہترین ثنا اور اس کی حمد بجالاتا ہوں۔ آسودہ حالت میں بھی اور مشکلات کے موقعہ پر بھی، بارالہا میں تیری حمد بجالاتا ہوں......"۔

امامؑ مادی لحاظ سے اتنے زیادہ نامساعد حالات میں بھی خدا کی رضایت اور عوامل کے سازگار ہونے کی باتیں کرتے ہیں! کیوں؟ اسلئے کہ معنوی لحاظ سے حالات موافق ہیں اور وہ اعتقادی طور پر موحّد اور عملی میدان میں خداپرست ہیں، نیز اپنے کام کے انتہائی نتیجہ سے بھی آگاہ ہیں۔ آپؑ کا ہدف سکندر اور نپولین کی طرح جہانگیری نہیں ہے کہ خود کو شکست خوردہ سمجھیں۔ آپؑ کا ہدف کلمۂ حق کو غالب کرنا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے آپ اس کام کو بہت زیادہ مؤثر اور سودمند دیکھ رہے ہیں۔

قیام حسینی کے بارے میں موضوعات

۱۔ یہ واقعہ رائے اور عقیدہ نہ بکنے کی وجہ سے وجود میں آیا۔

۲۔ کلمۂ "آثروا الموت" (انہوں نے موت کو ترجیح دی) حقیقتاً کربلا والوں کے بارے میں صادق آتا ہے (ان کے اور اہلِ بدر و صفین کے اور اصحاب طارق بن زیاد کے درمیان مقایسہ)۔

۳۔ واقعہ عاشورا کا سب سے زیادہ اہم درس یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ پائیں کہ آیا دین قوت ہے یا ضعف؟ دین قید ہے یا آزاد؟ دین نشہ آور ہے یا قوت بخش؟

معاویہ حضرت عثمانؓ کے خون کے بہانے خلافت کی جستجو میں تھا

(عقاد اپنی کتاب "ابو الشہداء" صفحہ ۱۲ پر کہتے ہیں) :ان الذین انخدعوا او تخادعوا...... والآجام .

یہاں پر چند نکات ہیں جن کو بیان کرنا چاہئے :

معاویہ کے اصحاب اور ابن زیاد کے اصحاب میں فرق :

الف۔ جو لوگ صفین میں معاویہ کے ساتھ تھے اور جو کربلا میں یزید کی حمایت کر رہے تھے ان میں آپس میں فرق پایا جاتا ہے۔ اسلئے کہ معاویہ نے ایک قسم کا تظاہر دِکھا کر ان لوگوں کو فریب دے رکھا تھا اور وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ فقط مظلوم خلیفہ کے انتقام کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں اور اسوقت تک معاویہ کے بُرے عزائم پر سے پردہ نہیں اٹھا تھا۔ لیکن یزید کا دور اس کے برعکس تھا۔ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی معاویہ سے جنگ میں معاویہ کا نفاق اس قدر آشکار نہیں ہوا تھا جس قدر امام حسینؑ کے مبارزہ میں یزید کا نفاق واضح تھا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ معاویہ کے دور میں اگر کربلا کی طرح کوئی حادثہ پیش آتا تو

لوگ بنو امیہ کا دفاع کرتے۔ لیکن کربلا میں لوگوں نے بنو امیہ کا دفاع کیا۔ اس کی علت یہ ہے کہ اس ۲۰ سال کی مدت میں بنو امیہ لوگوں کو بہت پیچھے لے گئے تھے۔

ب۔ معاویہ کے قضیہ میں عثمانؓ کے خون کا انتقام لینے کے لئے لوگ بغیر کسی شک وشبہ کے حرکت میں آگئے۔ تعصب 'جاہلیت 'خون خواہی اور خونخواری کی روح جو اہلِ عرب کی طبیعت میں پائی جاتی تھی اور دور جاہلیت میں جسکا دوسری صورت میں مظاہرہ کرتے تھے' معاویہ کے اس قضیہ میں موجود تھے لیکن ان کا تظاہر اسلامی رنگ میں ہوا۔

ج۔ معاویہ نے اپنی خلافت کے دور میں ایک ایسا کام انجام دیا کہ جو بنو امیہ کی حکومت کے زوال کا سبب ہوا اور وہ کام یزید کو اپنا ولی عہد قرار دینا تھا۔ اولاً یزید غیر صالح ترین افراد میں سے تھا اور ثانیاً یہ کام خلافت کے ساتھ کھیل کھیلنا اور بادشاہی کی طرح خلافت ایک دوسرے کے دست بدست کرنا تھا۔ خصوصاً معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی یزید کے لئے بیعت لی تھی۔ اساسی طور پر معاویہ نے سارے کاموں میں خلافت کی روش میں تبدیلی کر کے بادشاہی کی روش اختیار کی تھی۔ ہر چند عثمانؓ کے زمانے سے ہی بنو امیہ خلافت کو اپنی جاگیر بتاتے تھے۔

د۔ کربلا میں بنو امیہ کے حامیوں کا یہ عمل امت اسلامیہ میں اخلاقی پستی کی انتہائی نچلی سطح کا غماز تھا۔ حادثۂ کربلا کے بعد سے آزادی کا اور ظلم کے سامنے سر نہ جھکانے کا شعور بیدار ہوا۔ مدینہ کا قیام 'کوفہ کا قیام اور خصوصاً عبد اللہ بن عفیف ازدی کا قیام اسلام کے روحی تجلیات کے آغاز کے نمونے شمار ہوتے ہیں۔ بنو امیہ کے حامیوں نے واقعہ کربلا کے بعد بھی اپنی پستی اور کمینہ پن کو ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن بیداری کا آغاز حسینؑ ابن علیؑ سے ہوا۔

کربلا میں بنی امیہ کے اصحاب اپنے عقیدہ سے جنگ لڑ رہے تھے

عجیب بات یہ ہے کہ یزید کے حامیوں نے حادثۂ کربلا میں اور واقعۂ مدینہ میں ایک ہی نوعیت کی پست فطرتی اور کمینگی کا مظاہرہ کیا جو اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ان لوگوں نے اس طرح کے کام انجام دیئے درآنحالیکہ وہ کافر اور منکر مطلق نہیں تھے۔ وہ واقعاً نماز پڑھتے تھے اور زبان سے شہادتیں بھی ادا کرتے تھے۔ عقاد کہتا ہے :

"بل حسبكَ من خِسةِ ناصريه (يزيد)انهم كانوا يرعدون من مواجهة الحسين بالضرب فی كربلاء لاعتقادهم بكرامته وحقّه' ثم ينتزعون لباسه ولباس نسائه فيما انتزعوه من اسلاب' ولو انّهم كانوا يكفرون بدينه وبرسالة جدّه لكانوا فی شريعة المروءَ ة اقلّ خسّة من ذاك".

"یزید کے حامیوں کی پست فطرتی کے لئے یہی کافی ہے کہ کربلا میں امام حسینؑ کی کرامت اور حق کا اعتقاد رکھنے کی وجہ سے وہ آپؑ کے سامنے آنے سے ڈرتے تھے لیکن آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کا لباس تک اتار لیا اور آپؑ کے اہلِ حرم کو اموال کے لوٹ مار کے لئے باہر نکالا۔ یہ لوگ اگر دین میں اور آپ کے جد بزرگوار کی رسالت سے بھی کافر ہوتے' تب بھی ان کا یہ عمل مردانگی کے مذہب میں پست ترین کام تھا"۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد کے اصحاب کی جنگ عقیدہ کی جنگ نہیں تھی بلکہ عقیدہ سے جنگ تھی۔ وہ شکم کی خاطر' ریاست و مقام کی خاطر اور دنیا کے لئے اپنے عقیدہ سے جنگ لڑ رہے تھے اور اس ایک جہت سے یہ لوگ بدر

واحد کے کفار سے بھی گئے گزرے اور پست تر تھے کیونکہ ان کی جنگ عقیدہ کی راہ میں جنگ تھی۔

آل علیؑ کے وسیلۂ پیروزی کو کام میں لانے سے کراہت

آل علیؑ جس طرح ہدف اور مقصد کے لحاظ سے اپنے مخالفین سے مختلف تھے' اسی طرح وسائل کو کام میں لانے میں بھی فرق رکھتے تھے۔ یہ خاندان اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کے وسیلہ سے کام نہیں لیتا تھا۔ مثال کے طور پر زہر دینا جو دنیا کا نہایت بزدلانہ کام ہے' اسے انہوں نے کبھی نہیں اپنایا جبکہ معاویہ نے اپنی اوچھے مقاصد حاصل کرنے کیلئے اس سے بھرپور کام لیا۔ امام حسنؑ' اشتر نخعی' سعد وقاص' حتیٰ کہ اپنے بہترین دوست اور مددگار عبدالرحمٰن بن خالد کو جو اس کے بعد خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا' معاویہ نے مسموم کرادیا اور یہ کہتا تھا: اِنّ لِلّٰہ جُنوداً مِن عَسَلٍ "۔ (خدا کے لشکر میں شہد بھی ہے)

لیکن آل علیؑ اس طرح کے وسائل کو استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے' اسلئے کہ اس سے فضیلت کی اشاعت کی نفی ہوتی تھی۔ اسکے برخلاف معاویہ کا مقصد بجز مسند خلافت پر قابض ہونے کے کچھ نہ تھا۔ جناب مسلم بن عقیلؑ راضی نہ ہوئے کہ ابن زیاد کو ہانی کے گھر پر دھوکے کے ذریعہ اور غفلت کے عالم میں قتل کریں۔ انہوں نے یہ کہا: "اِنّا اَھلُ بَیت نَکرہُ الغدر" "بیشک ہم اہل بیت دھوکا دینا پسند نہیں کرتے" (کتاب ابو الشہداء ص ۱۸) یا آپ نے یہ کہا: "مجھے یاد ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: **الایمان قید الفتك**". "ایمان انسان کو دھوکے بازی سے روکتا ہے"۔ (سرمایۂ سخن' ج دوم)

سید الشہداء کے قاتلین کے نفسیات کا تحلیل و تجزیہ

ابن زیاد کے حامیوں کی نفسیات کا تجزیہ و تحلیل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ آیا واقعاً یہ لوگ اصول اسلام پر ایمان نہیں رکھتے تھے ؟ یا اسلام پر تو ایمان تھا لیکن یہ خیال کرتے تھے کہ (نعوذباللہ) امام حسینؑ طاغی اور سرکش ہو گئے ہیں اور انہوں نے اس نظریہ سے امام کے خلاف خروج کیا تھا کہ اسلام کے حکم کے مطابق ان سے جہاد کرنا چاہئے ؟ جیسا کہ عمر سعد نے کہا تھا :"یا خیل اللہ ارکبی وبالجنة ابشری". "اے اللہ کے سپاہیو! اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ، میں تمہیں جنت کی بشارت دے رہا ہوں)۔ یا یہ کہ ابن زیاد کے حامیوں کو صرف دنیا کی طمع اور لالچ تھی یا پھر فقط جہالت، نادانی اور عدم تشخیص کارفرما تھی ؟

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ان کے عام لوگ ایک نوع کے عامیانہ ایمان سے خالی نہیں تھے۔ یعنی ضمیر کے پردے میں نہ تو اسلام سے کافر و منکر تھے اور نہ امام حسینؑ کے بارے میں کافر و منکر تھے۔ جبکہ ان کے رؤسا رشوت اور مقام و منصب کے اندھے تھے۔ جیسا کہ ایک شخص نے راستہ میں امام حسینؑ سے عرض کیا تھا: "اما رؤساؤھم فقداعظمت رشوتھم وملئت غرائرھم". "مگر ان کے رؤسا نے بھاری رشوتیں لے لی ہیں اور انکے تھیلے بھرے ہوئے ہیں"۔ یہ بھی فرزند آدمؑ کی روح کا ایک عجیب و غریب معمہ ہے کہ وہ اپنے عقیدہ سے جنگ کرتا ہے یعنی حرص، طمع اور دنیا پرستی کے تابع ہو کر ایسا عمل کرتا ہے جو اس کے عقیدہ اور ایمان کے منافی ہے۔ مثلاً خود ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ہیں جو واقعاً نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور قرآن کریم سے ایک طرح کا تعلق بھی رکھتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود غیروں کے خادم بن بیٹھے ہیں اور ایسے حوادث کو وجود میں لاتے ہیں جیسے مدینہ پر حملہ اور مغلوں کا حملہ، جن سے کہ ان کے عمل اور

عقیدہ کے درمیان فاصلہ ہو گیا ہے یابالفاظ دیگر شخصیت میں تعدّ د پیدا ہو گیا ہے۔
لیکن عوام فقط رؤسا کی اندھی تقلید کے تابع تھے: "ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراء نا فاضلّونا السبیلا"، "اے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی پیروی کی تو انھوں نے ہمیں گمراہ کردیا"۔(سورۂ احزاب آیت ۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ: "قلوبهم معك وسيوفهم غداً مشهورة عليك"۔ "لوگوں کے دل آپکے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں کل آپ کے خلاف اٹھیں گی"۔ کا معما کربلا میں موجود تھا۔

عقاد کے عقیدہ کے مطابق دونوں طرف کے لوگ آخرت پر ایمان و عقیدہ رکھتے تھے لیکن عقیدہ وایمان ایک طرف کریم اور بزرگوار ارواح میں تھا اور دوسری طرف ایک ایسی ارواح میں تھا جو لئیم اور پست تھیں۔ایک گروہ طبیعتاً کمال حسن کا حامل اور صاحب ہدف تھا اور دوسرا گروہ طبیعتاً منفعت پرست تھا۔

آل علیؑ اور آل معاویہ میں اختلافات کے اسباب

تاریخ کی رو سے آل علیؑ اور آل معاویہ کے درمیان دشمنی کے اسباب کو دیکھنا چاہیں تو بہت زیادہ ہیں۔ البتہ اصلی سبب ان کی طینت اور سرشت میں اختلاف تھا۔ آل علیؑ ہر جہت میں ایمان' اخلاق اور فضیلت کے پابند تھے اور آل معاویہ منافع' جاہ و مقام' مال و ثروت کے اسیر تھے۔ مجموعی اسباب کو ہم یوں خلاصہ کر سکتے ہیں: نسلی اختلاف' خون خواہی' سیاست یا سیاسی رقابت' ذاتی کینہ' طرز فکر' ادراک اور احساسات کا اختلاف تھا۔ البتہ آل علیؑ بعض امور سے منزہ تھے جبکہ آل معاویہ میں یہ تمام امور اثرانداز تھے۔ اس کے علاوہ آلِ معاوہ کے دلوں میں حسد کی ایک آگ تھی اور ان کا یہ احساس حسد آل علیؑ کی کرامت اور لوگوں میں ان کے محترم ہونے سے تھا۔ "ام یحسدون الناس علی مااتینھم الله من فضله" "بلکہ (یہود) حسد کرتے ہیں لوگوں (مسلمانوں) سے اس کی نسبت جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے" (سورۂ نساء آیت ۵۴)۔ عقاد کہتا ہے:

"وکان ھذا التنافس بینھما یرجع الی کل سبب یوجب النفرة بین رجلین من العصبیة الی التراث الموروثة 'الی السیاسة 'الی العاطفة الشخصیة 'الی اختلاف الخلیقة ' والنشاة والتفکیر". "ان دونوں (امام حسینؑ اور یزید) کے درمیان کشمکش اور اختلاف کے کچھ اسباب ہیں جو ان کے درمیان نفرت اور جدائی کا سبب بنے۔ اور وہ اسباب ان کے گزشتہ لوگوں کے موروثی آثار کی حمایت' سیاست میں تعصب' ذاتی عواطف اور اخلاق' تربیت' رشد اور تفکر میں اختلاف پایا جانا تھا"۔

آل علیؑ دراصل فطرت' تربیت اور جن دامنوں میں پرورش پائی' ان کے لحاظ سے بنو امیہ سے مختلف تھے۔

امیہ اور ہاشم قدیم زمانے سے زعامت اور سرپرستی میں اختلاف رکھتے تھے۔ امیہ شکست کھاکر شام چلا گیا۔ ابوسفیان جو قریش میں سب سے زیادہ زیرک تھا' کینہ کی وجہ سے فتح مکہ تک پیغمبر اکرمؐ سے مبارزہ کرتا رہا' حالانکہ اس کی عقل یہ اقتضا کرتی تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی تسلیم ہو جاتا۔ ابولہب جو کہ ابوسفیان کا بھوئی تھا پیغمبر اکرمؐ کی کس قدر مخالفت کرتا تھا۔ (ابوسفیان' عباس اور فتح مکہ کا واقعہ)

کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد ایک دن ابوسفیان کی نظر پیغمبر اکرمؐ پر پڑی تو اُس نے اپنے آپ سے کہا: "لیت شعری بای شیٔ غلبنی". "اے کاش! میں یہ جانتا کہ وہ کس چیز کی وجہ سے مجھ پر غالب ہوا"۔ رسول اکرمؐ نے اس کی بات کو سن لیا یا اس کے ضمیر کو پڑھ لیا۔ نزدیک تشریف لائے' اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: "بالله غلبتك يا اباسفيان": "اے ابوسفیان! خدا کے سبب تجھ پر غالب ہوا ہوں"۔

ابو سفیان کی اسلام دشمنی

غزوۂ حنین میں ابو سفیان نے مسلمانوں کی پسپائی دیکھی تو خوشی سے بول اُٹھا: ماا ریھم یقفون دون البحر (میں گمان نہیں کرتا کہ دریا تک پہنچنے سے پہلے یہ لوگ توقف کریں)۔ اور جب جنگ شام میں رومی آگے جا رہے تھے تو اس نے کہا: ایه بنی الاصفر (اے رومیو اپنے اس کام کو ادامہ دے دو۔) جب وہ لوگ عقب نشینی کرتے تو کہتا تھا: (ویلٌ لبنی الاصفر (افسوس ہو بنی اصفر (رومیوں) پر)۔

رسول اکرمؐ نے اس کو اپنی طرف جذب کرنے کیلئے اس کی بیٹی اپنے عقد میں لی' اس کے گھر کو دوسروں کے لئے جائے امن قرار دیا' اس کو مؤلفۃ القلوب میں سب سے آگے قرار دیا (لیکن اسے اور اس کے فرزندوں کو حکومت نہیں دی' اسی قدر سلوک کیا کہ اسکے دل کو تسلی ہو جائے)۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان اس سے اجتناب کرتے تھے۔ ابو سفیان اُن سے تنگ آگیا اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آکر خواہش کی کہ معاویہ آنحضرتؐ کا کاتب (نہ کاتب وحی) ہو جائے۔ خلافت کے واقعہ میں ابو سفیان حضرت علیؑ اور عباس کے گھر پر آیا...... عقاد کہتا ہے کہ: حضرت علیؑ نے فرمایا:

لاوالله لا ارید ان تملاها علیه خیلاً ورجلاً ولولاانّنا راینا ابابکر لذلك اهلاً ماخلیناهُ وایاهُ.

"خدا کی قسم میں نہیں چاہتا کہ میں پیادہ اور سوار کو انکے خلاف (شہر میں) بھر دوں۔ اگر میں ابو بکرؓ کو اس کام کا اہل نہ سمجھتا تو میں ان کو اس کام میں آزاد نہ چھوڑتا۔"

یہ جملہ باقی تمام چیزوں سے قطع نظر' خود نہج البلاغہ کے اس جملہ کے منافی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: "شقوا امواج الفتن". "فتنوں کی موجوں کو نجات

کی کشتیوں سے چیر کر نکل جاؤ"(نہج البلاغہ خطبہ ۵)

ثم ابنهُ قائلاً یا ابا سفیان ! ان المومنین قوم نصحةٌ بعضهم لبعض وان المنافقین قومٌ غششةٌ بعضهم لبعض تتخاذلون وان قربت دیارهم وابدانهم".

اس کے بعد اس کے بیٹے معاویہ سے کہا: اے اباسفیان! مومنین ایسا گروہ ہیں جو ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور منافقین ایک ایسا گروہ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کی مدد ویاوری نہیں کرتے گرچہ ان کے شہر اور بدن نزدیک ہوں۔

خلافت عثمان کے پہلے دن اس نے کہا:"**یابنی امیه !تلقفوها تلقف الکرة**[۱]......"

۱۔ اس کا عربی متن اور ترجمہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہذا یہاں تکرار نہیں کرتے۔ مترجم

یزید کی ولیعہدی کے مقدمات

جناب عباس محمود عقاد اپنی کتاب "ابوالشہدا" کے صفحہ ۳۰'۳۱ پر لکھتے ہیں: معاویہ کا قصد تھا کہ خلافت کو بنوامیہ کی ملکیت میں تبدیل کردے۔ وہ یزید کے لئے زمینہ ہموار کرنے کی فکر میں تھا۔ جب دیکھا کہ خود بوڑھا ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ مر جائے اور یہ کام انجام نہ ہو پائے تو مروان بن حکم کو لکھا کہ لوگوں سے یزید کیلئے بیعت لے۔ چونکہ مروان خود خلافت کی ہوس میں تھا اس وجہ سے اُس نے نہ صرف یہ کہ اس کام کو انجام دینے سے انکار کر دیا بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی یزید کے خلاف بھڑکایا۔ معاویہ نے مروان کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ سعید بن العاص کو مامور کر کے بھیجا اور اس کو لوگوں سے بیعت لینے کے بارے میں لکھا لیکن کسی نے بھی اس کی بات کا موافقت میں جواب نہیں دیا۔ معاویہ نے امام حسینؑ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ زبیر اور عبداللہ جعفر کو خط لکھے اور ان سب پر سعید کو مامور کیا تاکہ ان سے جواب لے۔ (ظاہراً کسی نے بھی جواب نہیں لکھا)۔ سعید کو لکھا:

"ولتشدّ عزيمتك وتحسن نيتك ،وعليك بالرّفق ، وانظر حسيناً خاصة فلا يناله منك مكروه،فان له قرابة وحقا عظيما لاينكره مسلم ولامسلمة ......وهو ليث عرين، ولست آمنك ان ساورته الاّ تقوى عليه".

"تمہارا عزم محکم اور نیت اچھی ہونی چاہئے۔ دوستی اور نرمی کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ حسینؑ پر خاص نظر رکھنا، مبادا تمہاری طرف سے کوئی ناخوش کن بات سرزد ہو جائے کیونکہ ان کو (رسول خداؐ سے) قرابت اور نزدیکی ہے اور ان کے لئے ایک ایسا عظیم حق ہے جس کا کوئی مسلمان مرد و زن منکر

نہیں...... اور وہ شیر بیشۂ شجاعت ہیں۔ میں تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں گا اگر تم ان سے الجھو اور دست درازی کرو"۔

سعید نے بہت زیادہ کوششیں کیں کہ لوگوں کو خصوصاً ان چند افراد کو راضی کرلے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ معاویہ خود مکہ کے ارادے سے نکلا (ظاہراً اور باطناً یزید کے لئے بیعت لینے) تو مدینہ آیا اور انہی چند افراد کو بلا کر نرم لہجے میں بولا: " میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے یزید کی خلافت کے لئے بیعت کرلیں، البتہ تمام کام حتیٰ عزل کرنے یا نصب کرنے کے اختیارات آپ ہی لوگوں کے پاس ہوں گے۔ اسی طرح مال وخراج جمع کرنا اور ان کو تقسیم کرنا بھی آپ کے اختیار میں ہوگا۔ صرف مسندِ خلافت پر نام یزید کا ہوگا"۔ ابن زبیر نے کہا: "بہتر یہ ہے کہ تم یا تو پیغمبر اکرمؐ کی طرح کرو کہ کسی کو بھی معین نہ کرو، یا ابوبکر کی طرح کرو کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے علاوہ کسی اور کو انتخاب کیا، یا عمر کے مثل کرو کہ اس کام کو شوریٰ پر چھوڑ دو"۔ معاویہ کو مشورہ ناگوار ہوا اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس عالم میں عبداللہ زبیر سے کہا: "اس کے علاوہ کوئی اور بھی بات باقی ہے؟" اس نے کہا: "نہیں"۔ دوسروں سے پوچھا "تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟" سب نے کہا: "نہیں"۔ کہا: "تعجب ہے! تم لوگ میری نرمی سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ جس گھڑی میں منبر پر جا کر خطاب کرتا ہوں تو تم میں سے ایک کھڑے ہو کر میری تکذیب کرتا ہے۔ میں پھر بھی نرمی سے کام لیتا ہوں"۔ اس کے بعد کہا: لئن رد علی احدکم فی مقامی هذا الاترجع الیه کلمة غیرها حتیٰ یسبقها السیف الی راسه فلا یبقین رجل الا علی نفسه "اگر تم میں سے کوئی اس موضوع پر میری بات کو رد کرے گا تو اس سے قبل کہ مجھ سے کوئی اور بات سنے اس کے سر پر تلوار چل چکی ہوگی"۔ اس کے بعد اپنے پولیس افسر کو حکم دیا کہ ان

میں سے ہر ایک کے ساتھ دو دو مسلح افراد لگادے اور ان کو یہ حکم دے دے کہ جب میں خطبہ دینے لگوں، تب ان میں سے اگر کوئی بھی میری تصدیق یا تکذیب میں کوئی بات کہے تو اس کی گردن اڑا دے ؂۱۔

اس مقدمہ کے بعد معاویہ منبر پر گیا اور حمد و ثنائے پروردگار کے بعد کہا:

هولاء الرهط سادة المسلمين وخيارهم لايبرم امردونهم، و لايقضى الا على مشورتهم وانهم قد رضوا و بايعوا ليزيد، فبايعوه على اسم الله. فبايع الناس.

"یہ جماعت مسلمانوں کے سرداروں اور بزرگوں کی جماعت ہے۔ ان کی رائے اور نظر کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہوتا اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام انجام بھی نہیں دینا چاہئے۔ یہ لوگ یزید کی بیعت پر راضی ہیں اور خود انہوں نے بیعت کر لی ہے۔ پس آجاؤ بیعت کر لو۔ لوگو! تم بھی بیعت کر لو"۔

معاویہ حقیقت حال جانتا تھا کہ اس بیعت کی کوئی ارزش و قیمت نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے یزید کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد تم لوگوں سے بیعت لے

؂۱۔ انتخاب آزاد! ایسا نہیں کہ ہمارے زمانے کے انتخابات اُس زمانے کی بیعت سے شباہت نہ رکھتے ہوں ☆۔ وہ لوگ یزید کو ولیعہدی پر نصب بھی کرنا چاہتے تھے اور لوگوں سے بیعت بھی لینا چاہتے تھے (یعنی دونوں کام کو کسی بھی صورت میں کرنا تھا اگرچہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو) اس وقت کوئی ایسا قانون نہیں تھا کہ اگر خلیفہ اپنی حیات میں کسی کو ولیعہدی پر نصب کرے تو اُس کے مرنے کے بعد وہ خلیفہ ہو جائے (البتہ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ استثنائی عمل ہوا) چنانچہ مجبور تھے کہ لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے اور ان سے بیعت لے لیتے۔ ان ایام میں بیعت آج کے انتخابات کی طرح تھی، یعنی لوگوں کے انتخاب کے ذریعہ خلیفہ منتخب ہوتا تھا۔ معاویہ اپنی قوت کے ذریعہ رائے لینا چاہتا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی حکومت قانون مشروطہ کے مطابق ذمہ دار ہے کہ انتخاب کے ذریعہ بر سر اقتدار آئے، لیکن ووٹ دینے والوں کے سر پر ڈنڈے باز کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ تمدن ترقی کر گئی ہے اسلئے رائے دہندگی اور بیلٹ بکس درمیان میں آگئے ہیں۔ یعنی آلات اور ذرائع بدل گئے ہیں۔ (نہ کہ روح) کبھی بیلٹ بکس چوری کر لئے جاتے ہیں اور کبھی ان میں موجود ووٹ بدل دئے جاتے ہیں۔

☆ اس نکتہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ استاد شہیدؒ کی یہ یادداشت رژیم مقبور پہلوی کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔

لینا' جیسا کہ کتاب ''نفس المہموم'' میں بھی آیا ہے۔ یزید جوان اور نا تجربہ کار تھا اور اس کے باپ کے مشاور عمر و عاص' زیاد' اور مغیرہ وغیرہ کی طرح اس کو مشورہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے کام میں درشت رویہ اختیار کیا اور مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا :

''خذ حُسيناً وعبدالله بن عمر وعبدالله بن زبير بالبيعة اخذاً شديداً''.

''حسینؑ' عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر سے سختی سے بیعت لو''۔

ولید نے کسی کو مروان کے پیچھے بھیجا تا کہ اس سے مشورہ' لے سکے۔

بنی امیہ کا اسلام میں عصبیت سے استفادہ

عقاد کہتا ہے :انسان کی سرشت میں اپنی بقاء کی خاطر جو بڑا تعجب انگیز مکر وحیلہ کا عنصر داخل ہے' اسکی ایک مثال امویوں کے ہاشمیوں سے مبارزہ کا موضوع ہے۔ اسلام نے جس عصبیت کا خاتمہ کیا تھا' امویوں نے اسی عصبیت کے ذریعے غلبہ حاصل کیا۔

علویوں کے خلاف معاویہ کی تبلیغاتی جنگ

عقاد اپنی کتاب کے صفحہ ۷ ۳ پر لکھتا ہے : معاویہ یہ جانتا تھا کہ مال اور اسلحہ کی بنا پر وہ علیؑ اور آل علیؑ پر غالب ہے لیکن شہرت اور احساسات کے لحاظ سے مغلوب ہے۔ آل علیؑ کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے وہ لوگوں کے پاس بہت زیادہ ہدایا و تحائف بھیجا کرتا تھا اور مال تقسیم کرنے میں کبھی مضایقہ نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کے دلوں سے علیؑ کی نیکنامی اور ان کی طرف میلان کو دور کرنے کی غرض سے' نیز دلوں پر حضرت علیؑ کی حکومت کو زائل کرنے کے لئے معاویہ نے سرد

تبلیغاتی جنگ شروع کرر کھی تھی۔ اس نے منبروں سے اور نمازوں میں علیؑ پر لعن کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ علیؑ اور آلِ علیؑ کو نیچا اور خود کو برتر دکھلانے کیلئے اس نے احادیث جعل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن اس کے اس قسم کے کام خود اس کے خلاف لوگوں میں بہت زیاد تنفّر کا سبب بنے۔ حدیث جعل کرنا بھی تبلیغاتی جنگ کے وسائل میں سے ایک ہے۔

قصہ ارینب بنت اسحاق

عقاد اپنی کتاب میں لکھتا ہے: ارینب بنت اسحاق کا قصہ جس کو اکثر مؤرخین نے نقل کیا ہے' اگر صحیح ہے تو یہ قضیہ امام حسینؑ اور یزید کے درمیان اختلاف کے اسباب میں ایک اور علت کا اضافہ ہے۔

دور جاہلیت میں ہاشمی اور اموی تربیت

عقاد اپنے کتاب کے صفحہ نمبر ۴۹ پر لکھتے ہیں :

"کان بنوھاشم یعملون فی الرئاسة الدینیّة وبنو عبدشمس یعملون فی التجارة اوالرئاسة السیاسیة وھما ما ھما فی الجاھلیة من الربا والمماکسة والغبن والتطفیف والتزییف ' فلا عجب ان یختلفا ھذا الاختلاف بین اخلاق الصراحة و اخلاق المساومة' وبین وسائل الایمان ووسائل الحیلة علی النجاح".

"بنو ہاشم دین کی ریاست کے لئے کوششیں کرتے تھے اور بنو عبد شمش تجارت اور سیاسی ریاست کیلئے کام کرتے تھے۔ دور جاہلیت کی تجارت رِبا' چیزوں کی قیمتوں میں مول بھاؤ' دوسروں کو دھوکہ دینے' کم فروشی کرنے اور خراب وناقص اجناس کو دوسروں کے گلے لگانے پر مشتمل تھی۔ لہٰذا بنو ہاشم اور بنو عبد شمس کے درمیان یہ کھلا اختلاف پایا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ یہ اچھے اخلاق اور بُرے اخلاق کا فرق ہے۔ یہ سچے اخلاق اور بازاری اخلاق کے مابین کا فرق ہے۔ یہ وسائلِ ایمان اور وسائلِ حیلہ بازی کے مابین کا اختلاف ہے"۔

(اس عبارت کے نقل کرنے کا مقصد دو خاندانوں کی تربیت کے فرق کو بیان کرنا تھا)

بنو ہاشم کے نزدیک دینی ریاست مسیحی کاہنوں کے نزدیک کہانت کی ریاست کی طرح نہیں تھی کہ جو کام کر لیتے اس پر عقیدہ نہ رکھتے ہوں بلکہ بنو ہاشم خود سب سے زیادہ کعبہ کا احترام کرتے اور خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ عبد المطلب کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا قصد کرنے کا قصہ اس بات کی اول دلیل ہے۔

اس کے بعد عقاد کہتا ہے : "ہاشمیوں کا یہی اعلیٰ ترین اخلاق نبوت کے ظہور کے بعد کامل ترین صورت میں ان کی نسل میں ظاہر ہوا یہاں تک کہ صدیوں بعد بھی آل علیؑ اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ کی مثال اور نمونہ بن گئے۔ اگر آپ تاریخ میں آل علیؑ کی شخصیات کا مطالعہ کریں تو آپ کو اخلاق میں سب حضرت علیؑ کے مانند ہی نظر آئیں گے : "ذریۃً بعضھا من بعض"۔("یہ ایک نسل ہے جس میں ایک کا سلسلہ ایک سے ہے")۔

جب روزِ عاشورہ حضرت علی اکبرؑ جنگ کیلئے میدان کی طرف نکل رہے تھے تو ابا عبداللہؑ نے بھی حُجُور طابت وطہرت "یہ طیب وطاہر دامن کا پروردہ ہے" کہہ کر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد عقاد نے اپنی کتاب میں یحییٰ بن عمر علوی کا قصہ نمونہ کے طور بیان کیا ہے۔(کتاب ابو الشہداء ص ۵۲)

خُلقِ ہاشمی اور و خُلقِ اُموی

عقاد کہتا ہے :ولم یکن لبنی امیہ...... ومناعم الخیاۃ-۱۔

اس کے بعد کہتا ہے : حسینؑ اور یزید ان دو خاندانوں کے کامل نمونہ تھے۔ اس اختلاف کے ساتھ کہ حسینؑ میں تمام ہاشمی فضائل موجود تھے اور یزید میں

-۱۔ (ترجمہ :اس کے برعکس، بنو امیہ کے پاس کوئی نمونۂ اخلاق اور شمائل دینی کا کوئی قابل توجہ پہلو نہیں تھا۔ بنو ہاشم کے مقابل ان کے خاندان میں کسی کو نبوت کا مقام حاصل نہیں ہوا تھا کہ اسپر فخر و مباہات کریں۔ جبکہ فرزندان بنو ہاشم نبوت کے خاندان سے ہونے پر افتخار کرتے تھے۔ بنو امیہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس پر وہ افتخار کریں یا حداقل اس کے ہاتھ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اچھی صفات کو مشتہر کریں تاکہ انہیں بھی کچھ امتیازات حاصل ہوں اور بنو ہاشم میں جو امتیازات ہیں، ان کی جگہ لے سکیں...... درحالیکہ ظہور نبوت سے پہلے اور اس کے بعد بھی ان کے خُلق وخُو پر تجارتی فائدہ اور سیاسی طمع حاکم تھے۔ لہٰذا بنو ہاشم کے بڑے لوگ ان اخلاقیات شریفہ کیساتھ معروف ہوئے اور بنو امیہ کے بڑے لوگ اپنے سنگین خلق وخو کی وجہ سے رسوا ہوئے۔ اُن سے (بنو ہاشم) بردباری، صبر آزمودگی، تیز ہوشی اور خوش فکری کے صفات منتشر ہوئے۔ جبکہ یہ (بنو امیہ) حیلہ گر، مکار و فریب کار، لذیت گر، حریص وطامع، منفعت پرست، راحت طلب اور عیاش مشہور ہوئے۔

بنو امیہ کی جو اچھی صفات تھیں، وہ بھی موجود نہ تھیں۔

معاویہ کا اخلاق حاملِ فضیلت نہ تھا

ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آیا شرعی اور عقلی لحاظ سے وہ حلم اور صبر قابل فضیلت ہے جو زندگی کا وسیلہ نہ ہو بلکہ اس اخلاق کے ذریعہ انسان فضیلت اور کمال کا طالب ہو اور جو دکھلاوے کا شرافت نفس ہو۔ ایک تاجر اور ایک سیاسی رہنما جس صبر و حلم کا انتخاب کرتے ہیں وہ فقط اپنے مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں اور اس صبر و حلم کی ارزش و قیمت بھی فقط وہی وسیلہ ہے۔ ایسا صبر و حلم انسانی نفس کا کمال و بلندی، پاکیزگیٔ نفس اور مقام انسانی اور خلافت الٰہی کی ارزش شمار نہیں ہوتا۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہوں کہ بنو امیہ کے اچھے اخلاق کا مظاہرہ صرف مادّی خوبی تھی اور آج کل کے سیاستدانوں کے اخلاق بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ میکیاولی جس اخلاق کی بات کرتا ہے حتیٰ ڈیل کارنیگی کا اخلاق بھی اسی گروہ کے اخلاق جیسا ہے۔ یہ اخلاق انسانیت کے اعلیٰ اصول پیدا نہیں کرتے بلکہ یہ تجارت، سیاست اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

شہاب الدین ابو الفوارس سعد بن محمد بن سعد بن صیفی، معروف بہ ابن صیفی کہ جن کا شافعیہ فقہاء میں شمار ہوتا ہے، اپنی کتاب ''راہنمائے دانشوران'' کی جلد اول میں ''حیص بیص'' کے زیرِ عنوان ابن خلکّان سے نقل کرتے ہیں کہ: ''نصر اللہ محلی (یا مُجلی) نے کہا: میں نے خواب میں علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیکھا اور ان سے عرض کی: ''آپ نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد اعلان کیا کہ جو بھی ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسکے لئے امان ہے لیکن بعد میں اس نے آپ کے فرزند گرامی حسینؑ کے

ساتھ جو کچھ کرنا تھا' کیا"۔ اس پر علیؑ نے مجھ سے کہا: "کیا تم نے ابن صیفی کے اشعار نہیں سنے ہیں"۔ میں نے کہا: "نہیں"۔ کہا: "خود جا کر اس سے سنو"۔

جب میں خواب سے اٹھا تو "حیص بیص" کے گھر گیا اور اس سے اپنا خواب بیان کیا۔ اس کے رونے کی صدا بلند ہو گئی اور کہنے لگا کہ میں نے یہ اشعار کل رات ہی نظم کئے ہیں۔ پھر قسم کھائی کہ میں نے ابھی تک یہ اشعار کسی کو پڑھکر نہیں پڑھکر سنائے ہیں۔ اس کے بعد اس نے یہ اشعار پڑھے :

ملکنا فکان العفو منّا سجیّةً　　فلما ملکتم سال بالدّم ابطح

وحللتم قتل الاساریٰ فطالما　　غدونا علی الاسریٰ فنعفو ونصفح

فحسبکم هذا التفاوت بیننا　　وکل اناء بالذی فیه ینضح

"جب حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی تو عفو اور بزرگواری ہماری روش تھی لیکن جب حکومت تمہارے ہاتھ لگی تو سرزمین ابطح میں خون بہہ گیا۔ تم لوگوں نے اسیروں کے قتل کو روا رکھا لیکن ہم نے اسیروں سے درگزر کیا اور ان کو بخش دیا۔ یہی فرق ہمارے اور تمہارے درمیان کافی ہے کہ کوزے سے وہی چیز باہر نکل کے آتی ہے' جو اس میں ہو"۔

امام حسینؑ کا نسب شریف اور واقعہ عاشورا میں اس کا اثر

عقاد لکھتے ہیں : امام حسینؑ کا نسب اور پیغمبر اکرمؐ کی آپؑ سے حد سے زیادہ محبت' واقعہ کربلا کے تجزیہ و تحلیل کرنے میں فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس مقیاس کے ذریعہ ہم کلی طور پر سپاہ یزید کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کے بے مقصد اور کتنے منفعت پرست لوگ تھے' کہ دل میں توامام حسینؑ کے احترام کے قائل تھے مگر کس طرح برعکس عمل کر رہے تھے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو سو فیصد بے اصول اور منفعت پرست لوگوں کے ردیف میں قرار دیا جاتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی امام حسینؑ سے محبت کے بہت سے قصے بیان ہوئے ہیں اور اسی طرح پیغمبرؐ کی انسے محبت کی نسبت' امام حسینؑ کے استدلال کا ذکر بھی تاریخ میں ثبت ہے۔

ابوذرؓ سے امام حسینؑ کے فرمودات

عقاد اپنی کتاب کے صفحہ ۶۴ پر امام حسینؑ کی فصاحت بیان کرتے ہوئے آپؑ کا ابوذر غفاریؓ سے خطاب نقل کرتے ہیں :

"یا عماہ ان اللہ قادر ان یغیر ماقدتری' واللہ کل یوم فی شان' وقد منعك القوم دنیا ھم ومنعتھم دینك'وما اغناك عما منعوك!وما احوجھم الی مامنعتم. فاسئل اللہ الصبر والنصر' و استعذبه من الجشع والجزع 'فان الصبر من الدین والکرم وان الجشع لا یقدم رزقاً والجزع لایؤخر اجلا".

"چچا جان! خداوند اس چیز پر قادر ہے کہ وہ اس وضع کو دگرگون کردے' خدا کی ہر روز نئی شان ہے۔ اس قوم نے اپنی دنیا کو آپ سے دور رکھا ہے اور آپ نے اپنے دین کو ان سے بچا کر رکھا ہے۔ حقیقتاً انہوں نے جس چیز

سے آپ کو محروم رکھا ہے' آپ اس سے کتنے بے نیاز ہیں اور وہ لوگ کس قدر نیاز مند ہیں' اس چیز کے جس سے آپ نے ان کو محروم رکھا ہے۔ پس خدا سے صبر اور مدد طلب کریں اور حرص و بے تابی سے پناہ مانگیں کیونکہ صبر دین اور کرم سے ہے۔ حرص نہ تو روزی کو وقت سے پہلے لا سکتی ہے اور نہ ہی بے تابی موت میں تاخیر کر سکتی ہے"۔

عقاد آگے لکھتے ہیں :

"وكان يومئذ فى نحو الثلاثين من عمره فكانما اودع هذه الكلمات شعار حياته كاملة منذ ادرك الدنيا الى ان فارقها فى مصرع كربلا".

"اس وقت امام حسینؑ ۳۰ سال کے تھے۔ گویا اس دنیا میں پاؤں رکھنے کے دن سے لیکر کربلا کی قتلگاہ میں اس دنیا سے مفارقت پانے تک کی تمام زندگی کے شعار کو ان چند جملوں میں سمو دیا۔

ان اشعار کو آپؑ سے نسبت دی جاتی ہے :

اغن عن المخلوق بالخالق   تغن عن الكاذب بالصادق

واسترزق الرحمن من فضله   فليس غير الله من رازق

من ظن ان الناس يغنونه   فليس بالرحمن بالواثق

"خالق سے وابستہ ہو کر مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ تاکہ سچوں سے متمسک اور جھوٹوں سے بے نیاز ہو جاؤ اور خدائے رحمٰن کے فضل سے روزی طلب کرو کہ خدا کے علاوہ کوئی روزی دینے والا نہیں۔ اور جو کوئی بھی یہ سوچے کہ لوگ اسے بے نیاز کرینگے' بے شک وہ خدائے رحمٰن پر اطمینان اور وثوق نہیں رکھتا"

یہ اشعار بھی آپؑ سے منسوب ہیں :

لعمرك اننی لاحب داراً　　تکون لها سکینة والرُباب
احبهما وابذل کل مالی　　ولیس لعاتب عندی عتابٌ

"تیری قسم کہ مجھے اس گھر سے محبت ہے جس میں سکینہ اور رباب ہوں۔ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں اور اپنی ساری دولت ان کی راہ میں دیتا ہوں اور کسی کی سرزنش میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی"۔

یزید کی تربیت اوراس کے روحی اور اخلاقی صفات ~~۱~~

یزید کی ماں مجدل کلبیہ کی بیٹی تھی جو معاویہ کے ساتھ شہری زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔اس سلسلے میں اسکے کچھ معروف اشعار ہیں :

لَلُبس عبائة وتقرّعینی   احبّ الی من لبس الشفوف

وبیتٌ تخفّق الاریاح فیه   احبّ الی من قصر منیف......

وخرق من بنی عمی فقیر   احبّ الیّ من علج عنیف......

"خوشی کے ساتھ موٹاکھردرالباس پہننااور آنکھ کی روشنی میرے لئے نرم و نازک لباس سے بہتر ہیں۔اور وہ گھر جس میں تند و تیز ہوا آتی ہو مجھے پر شکوہ محل سے زیادہ پسند ہے۔اور میرے لیئے ایک دراز قداور خوش شکل مرد سے زیادہ بہتر میرے فقیراور بدخوچچاکے بیٹوں میں سے ایک ہے۔"

معاویہ نے اس عورت کو یزید کے ہمراہ دیہات بھیج دیااور یزید نے دیہات ہی میں پرورش پائی۔اسی لئے اس میں دیہاتی اور صحرا نشینی اخلاق پایا جاتا تھااس کی زبان فصیح تھی۔(یزید کاباقائدہ ایک دیوان ہے جو چھپ بھی چکاہے۔کہتے ہیں ابن خلکان یزید کی فصاحت گوئی کے مریدوں میں سے تھا)۔شکار یزید کا پسندیدہ مشغلہ تھا(اسلام میں تفریح اور عیش و نشاط کے لئے شکار کرنے کے حکم کو اور تفریح وعیش ونشاط کے سفر میں مسافر کی نماز کے حکم کو آپ جانتے ہی ہیں)۔اسکا تیسرا مشغلہ گھوڑ سواری اور گھوڑ دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لینا تھا۔اسکے علاوہ وہ حیوانات خصوصاً کتے پالنے کابہت شوقین تھا۔

یہ صفات اگر ایک قوی وقدرتمند اور اچھے اخلاق کے حامل شخص میں پائے

~~۱~~۔ امام حسینؑ نے فرمایا : وعلی الاسلام السلام اذقد بلیت الامة براع مثل یزید .
اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یزید کیسا آدمی تھاکہ امام حسینؑ نے اس کے بارے میں یہ جملہ فرمایا۔

جائیں تو اس کے کمال اور اس کے قویٰ کے تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن اگر یہ نازو نعم کے پروردوں یا آقازادوں اور شاہزادوں میں پائے جائیں تو ان کیلئے بطل اور عیش و عشرت میں غرق ہو جانے کا سبب بنتے ہیں۔

یزید اپنی فصاحت اور بادیہ نشینی کی خصلتوں کی وجہ سے شعراء کی ہم نشینی اور اہل باطل کی صحبت کو بہت پسند کرتا تھا۔ اشعار بھی ایسے کہتا تھا جو اسلام میں لغو اور بے ہودہ شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً لأن یملا بطن الرجل قیحاً خیر من ان یملا شعراً. (اگر کسی انسان کا پیٹ خون و پیپ سے بھر جائے تو بہتر ہے اس سے کہ اس کا پیٹ شعر سے بھر جائے)۔

شعر اور تخیل میں غرق ہونے کے بہت سے نقصانات ہیں۔ شعر گوئی مظاہرِ جمال ہے۔ اسکے اجتماعی طور پر مفید اثرات ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے کچھ داستانیں بھی ہیں مگر شعر گوئی کے بُرے اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی محافل فاسد ہوتی ہیں جو شعر اور ہوا و ہوس اور لغویات کا دربار ہوتی ہیں۔ یزید کے زمانے میں ایسی محافل کا انعقاد عام تھا بہت سے لوگ تھے جنہوں نے بنوامیہ کے دربار میں ایک شعر پڑھ کر بہت زیادہ دولت حاصل کی۔ (داستان ولید اموی اور ابن عائشہ مکتب تشیع ص ۷۵)

غرض شعراء اور مہمل گو افراد کی یزید کے دربار میں بہت قدر و قیمت تھی۔ خود یزید نے بھی شراب کے وصف اور دیگر چیزوں کی توصیف میں اشعار کہے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں :

شمسیة کرم برجها قعر دنها ومشرقها الساقی ومغربها فمی

فان حرمت یوما علی دین احمد فخذها علی دین المسیح بن مریم......

(ترجمہ ص ۳۴۷ پر ذکر ہے)

دع المساجد للعباد تسكنها   واجلس علی دکة الخمار واسقینا

ان الذی شربافی سکره طربا   وللمصلین لادنیا ولا دینا

ماقال ربك ویل للذی شربا   لکنه قال ویل للمصلینا......

"مساجد کو عابدوں کے لئے چھوڑ دو تاکہ وہ لوگ وہاں پر سکونت اختیار کرلیں۔ تم لوگ شراب کی دکان پر بیٹھ کر مجھے شراب دو۔ جو بھی شراب پی لے وہ عالم ہستی میں ناچنا شروع کردے۔ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں ان کے پاس نہ دین ہے اور نہ ہی دنیا۔ تمہارے پروردگار نے قرآن میں ویل للذی شربا (وائے ہو شراب پینے والوں پر) نہیں کہا بلکہ ویلل للمصلینا (وائے ہو نماز پڑھنے والوں پر) کہا ہے"۔

انہی اشعار میں سے ایک اور یہ بھی ہے:

لما بدت تلك الرؤوس واشرقت   تلك الشموس علی ربی جیرون

صاح الغراب فقلت صح اولا تصح   فلقد قضیت من النبی دیونی

"جب وہ سر نمودار ہوئے اور سورج قصر جیرون پر نکل آیا تو کوے نے آواز دینا شروع کی میں نے کہا تو آواز دے یا نہ دے' میں نے تو پیامبر سے اپنا قرض وصول کرلیا ہے"۔

اور جو اشعار ابن الزبعری کے اشعار سے ملحق ہوئے' وہ بھی اسی کے اشعار میں سے ہیں۔

یزید کا شکار اور تفریح کے شوق میں غرق ہونا مملکت کے امور اور سیاسی کاموں پر قابو رکھنے میں مانع ہوتا تھا۔ ناچار کام دوسروں کے ہاتھوں میں تھے۔

اس کا حیوانات سے کھیلنا اور اس میں سرگرم رہنا' اس کے تمام کاموں کو ایک مضحکہ خیز صورت دے دیتا تھا۔ وہ نہ فقط گھوڑ سواری اور گھوڑ دوڑ کا بہت زیادہ رسیا

تھا (یہ کام اسلام میں ممدوح ہے) بلکہ اس نے کچھ بندر اور تیندوا بھی لا کر رکھے ہوئے تھے اور ان سے کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ ایک بندر کو تربیت دے رکھی تھی۔ بندر دوسرے حیوانوں کے مقابل تعلیم قبول کرنے میں بہتر ہوتا ہے۔ (بندر اور وزارت کا قصہ) اس بندر کی کنیت ابو قیس تھی۔ (عربوں میں حیوانات کو لقب اور کنیت دینے کا رواج تھا)

من ذاك ام عريط للعقرب   وهكذا ثعالةٌ للثعلب

"انہی القاب میں سے ایک اُم عریط ہے جسکی کنیت عقرب ہے، اسی طرح لومڑی کو ثعالہ کہتے ہیں"۔

چمپنزی کو ابو جعرانہ پکارتے تھے اور ممکن ہے دوسرے حیوانوں کے بھی خاص نام رکھے ہوں جیسا کہ ذکر ہوا یزید نے اپنے بندر کو ایک شخصی کنیت، ابو قیس کا نام دیا تھا۔ وہ اس حیوان کو ابریشم، اطلس اور زربفت کے کپڑے پہناتا تھا۔ اس کو اپنے شراب کی محفل میں حاضر کرتا تھا۔ (افسوس ہے یزید کی اور حتماً اس کے دوستوں اور امراء و حکام کی غیرت پر جو اس محفل میں حاضر ہوتے تھے!)۔ اس کے پاس ایک چالاک گدھی بھی تھی۔ کبھی یہ ابا قیس اس گدھی پر سوار ہوتا تھا اور گھوڑوں کے مقابلہ میں شریک ہوتا تھا۔ خود یزید بہت چاہتا تھا کہ ابا قیس جیت جائے (شاید کبھی گھوڑ سوار بھی یزید کو خوش کرنے کی خاطر عمداً اس گدھی کو دوڑ میں جیتنے دیتے تھے)۔ اس بارے میں یزید[1] کے یہ اشعار ہیں:

تمسك اباقيس بفضل عنانها   فليس عليها ان سقطت ضمانٌ

الا من رائى القرد الذى سبقت به   جياد امير المؤمنين اتان

---

[1] کتاب تتمۃ المنتہی میں شاید اس رباعی کو کسی اور سے نسبت دی ہے۔ اس کتاب میں یزید کے شرح حال کے بارے میں رجوع فرمائیں۔

"اے ابا قیس (یزید کے بندر کا نام) اپنی سواری کے لگام کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اگر زین سے نیچے گر گئے تو تمہاری سواری ضامن نہیں۔ خبردار! کسی نے ایک ایسے بندر کو دیکھا ہے کہ اسکا جنگلی گدھا امیر المومنین (یزید) کے گھوڑوں سے مقابلہ میں آگے نکل جائے؟"۔

یہ تھی یزید کے اخلاق کی تھوڑی سی جھلک۔ معاویہ ایک ایسے شخص کو مسلمانوں کی گردن پر سوار کرنا چاہتا تھا۔

یزید کی حکومت کا طور طریقہ ایسا تھا کہ وہ صلح، معاہدہ اور عہد و پیمان کے قابل نہیں تھے۔ امام حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ صلح کی۔ معاویہ کے پاس پھر بھی عقل تھی اور کم از کم ایسا اخلاق تھا کہ کسی حد تک حفظ ظاہری کرتا تھا اور سوائے ان حالات کے جو اسکی حکومت اور سیاست کیلئے خطرہ تھے، ظاہری رعایت دکھاتا تھا۔ لیکن یزید کا طور طریقہ اعلانیہ فسق و فجور، ذلت و پستی اور کھلی عیاشی کرنا تھا۔ اگر امام حسینؑ کی طرف سے اسلام اور قرآن کے نام پر اب بھی کوئی قیام نہ ہوتا اور یزید کا دفتر تین سال کے اندر پلٹ نہ دیا جاتا اور چند سال مزید رہ جاتا تو ممکن تھا یزید کے خلاف کوئی دوسرا قیام ہوتا جس میں اسلامی عنصر بھی نہ ہوتا۔ اس وقت عالم اسلام کے لئے خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ایک قول کے مطابق یزید کی موت اس وقت واقع ہوئی جب اس نے کسی بندر سے مقابلہ رکھا ہوا تھا۔ اور شاید وہ وہی ابو قیس تھا۔

اہل مدینہ کے قیام کا سبب صرف امام حسینؑ کی شہادت ہی نہ تھی۔ اس کا دوسرا سبب یزید کے طور طریق میں تلوّن تھا۔ عبد اللہ بن حنظلہ جب کچھ لوگوں کے ساتھ اہل مدینہ کی طرف سے نمایندہ بن کر شام آئے تو وہاں پر پہنچ کر اس قدر ناگوار طور طریقہ دیکھا کہ وہ کہہ اٹھے۔

"واللہ ما خرجنا علی یزید حتی خفنا ان نرمی بالحجارۃ من

السماء.ان رجلا ینکح الامهات والبنات والاخوات ، و یشرب الخمر، ویدع الصلاۃ، واللّٰہ لولم یکن معی احدمن الناس لابلیت الله فیه بلاء حسناً"

"خدا کی قسم ہم نے یزید کے خلاف شورش نہیں کی مگر دل میں ڈرتا رہا کہ کہیں آسمان سے ہمارے اوپر پتھر نہ برسیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ نکاح کرتا ہے' شراب پیتا ہے اور نماز ترک کرتا ہے۔ خدا کی قسم اگر لوگوں میں سے کوئی ایک بھی میرے ساتھ نہ ہوتا' تب بھی میں خود کو خدا کی راہ میں سخت اور بہترین آزمائش میں ڈال دیتا"۔

بعض کہتے ہیں یزید "ذات الجنب" میں ۳۷ سال کی عمر میں مر گیا۔

(کتاب ابو الشہداء ص ۷۸)

احتمال ہے کہ شراب اور لذات کی زیادتی سے اس کا جگر ختم ہو گیا ہو۔ یزید بچپن میں دیہات میں چیچک کے مرض میں مبتلا ہوا تھا اور چیچک رو تھا۔ عقاد کہتے ہیں کہ وہ ایک خوش شکل اور بلند قامت جوان تھا۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ وہ مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا بہت شوقین تھا۔ اسکا زیادہ تر تفریح میں جی لگتا تھا۔ اس کا مزاج اپنے باپ دادا کی طرح بہادرانہ نہ تھا۔ جس طرح یزید کی ماں کے خاندان کے لوگوں' عتبہ اور اس کے چچا ولید اور شیبہ میں شجاعت اور عربی دلیری پائی جاتی تھی' یزید میں ذاتی طور پر یہ خصلت نہیں تھی۔ وہ سراپا ایک مہمل' عیاش اور احمق انسان تھا۔ لہٰذا معاویہ کے زمانہ میں معاویہ نے سفیان بن عوف کو جنگ قسطنطنیہ کے لئے یا قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجا تو یزید نے فوج کے حرکت میں آنے تک اپنے آپ کو بیمار ظاہر کیا اور بد دلی دکھائی۔ بعد میں یہ خبر ملی کہ فوج مرض اور قحط سے دوچار ہے۔ جب یہ خبر یزیدِ عیاش تک پہنچی تو اس نے یہ اشعار کہے :

مااِن ابالي بمالاقت جموعهم بالفرقدونة من حمي ومن موم
إذا اتكات على الانماط مرتفقاً بدير مرّان عندی ام کلثوم

''مجھے کیا فکر اگر تمام لشکر اسلام مرض چیچک سے مر جائے۔ میں تو ابھی دیرِ مران کی مسیحی عبادت گاہ میں بالین پر نرم تکیہ دئے راحت و آرام سے ہوں اور اُمّ کلثوم میری آغوش میں ہے''

معاویہ نے جب سنا تو اس نے قسم کھائی کہ میں یزید کو فوج میں شامل نہیں کروں گا تا کہ شماتت کے ننگ و عار کو دور کروں۔

یہاں پر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :

۱۔ یزید کا عہدہ سنبھالنا جو کسی قسم کی لیاقت نہیں رکھتا تھا (نہ خلافت کی لیاقت اور نہ ہی مملکت کو چلانے اور سیاست کی لیاقت رکھتا تھا)' فقط اس عہد کے مسلمانوں کے اخلاق کو بتدریج فاسد کرنے کا سبب بنا۔ معاویہ میں بھی اگرچہ خلافت کی لیاقت نہیں تھی لیکن وہ سیاست جانتا تھا اور ملک کا نظم و نسق چلانے کی لیاقت رکھتا تھا۔

۲۔ حضرت عمرؓ اور معاویہ کے درمیان ایک ظاہری فرق نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کو یہ پسند نہیں تھا کہ اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ کے لئے انتخاب کریں یا شوریٰ میں اس کو بھی شامل کریں۔ انہوں نے کہا تھا: ''عبداللہ اپنے گھر کے کاموں میں بھی سوچ بچار کرنے سے عاجز ہے''۔ لیکن معاویہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یزید میں خلافت کی لیاقت نہیں' تمام کاموں کو اس کے سپرد کر دیا۔

قلوبهم معك وسيوفهم عليك

فرزدق نے امامؑ سے کہا:

"قلوب الناس معك وسيوفهم مع بني اميه، والقضاء ينزل من السماء، والله يفعل مايشاء".

"لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور ان کی تلواریں بنوامیہ کے ساتھ ہیں، قضا آسمان سے آتی ہے، خدا جو کام چاہتا ہے، انجام دیتا ہے"۔
(نفس المہموم ص ۹۱)

مجمع بن عبید عامری ۱ نے کہا:

"اماأشراف الناس فقد اعظمت رشوتهم وملئت غرائرهم، فهم الب واحد عليك، واما سائر الناس بعدهم فان قلوبهم تهوى اليك وسيوفهم غدا مشهورة عليك".

"لیکن شرفاء کو بہت زیادہ رشوتیں دی گئی ہیں، ان کی جھولیاں بھر گئی ہیں۔ لہٰذا سب لوگ آپؑ کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ لوگوں کے دل اب بھی آپ کی طرف مائل ہیں لیکن ان کی تلواریں کل آپؑ کے خلاف اٹھیں گی"۔

بشر بن غالب نے بھی ذاتِ عرق کے مقام پر امامؑ سے ایسی ہی باتیں کی۔
(نفس المہموم ص ۹۳)

فرزدق نے عوام کے نظریہ کو بیان کیا ہے، وہ عوام کہ جو اپنے کبراء اور رؤساء کی روش کے محکوم ہوتے ہیں اور خود اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن مجمع بن عبید نے جو تجزیہ کیا وہ یہ کہ بے ایمان شرفاء کی پیروی عام لوگ اس طرح

۱۔ یا عامر بن مجمع عبیدی، مجمع بن عامر

کر رہے تھے جس طرح کہ کمزور عقیدہ کے مومن اپنے مسلک کے مقلد کے تابع ہوتے ہیں۔ قرآن کی منطق کے مطابق یہ دونوں گروہ جہنمی ہیں۔ حقیقت میں فرزدق کے اس جملہ کے معنی کہ لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں یہ ہیں کہ ان کے دل کسی کام کے نہیں' اور ایک معزول حاکم کی طرح سے ہیں' ان کے پیٹ آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ اپنے شکم کے غلام ہیں اور شکم کے حکم پر دل سے جنگ کرتے ہیں۔ آپؑ سے جنگ کرنے سے پہلے یہ لوگ شکم کی فوج کو لے کر اپنے دلوں سے جنگ کرنے کیلئے نکل چکے ہیں اور اپنے ضمیروں کو مجروح کئے ہوئے ہیں۔ فرزدق کے قول سے ہمیں اجمالاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کسی انسان کا دل حق کا خواہاں ہو اور حق کی آرزو کرتا ہو لیکن عین اُسی وقت اس کا عشق اور تعلق اس کے قدم کسی اور طرف اٹھا دیں اور اپنے محبوب کو خنجر گھونپ دیں۔ کہتے ہیں کہ مامون ایک امام کُش شیعہ تھا جبکہ عام لوگ حق پسند ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی جھوٹی دوستی یعنی ایسی دوستی ہے جس کی جڑ نہ ہو۔ یہ سچی آرزو اور جھوٹی آرزو کی نظیر اور صبح کاذب اور صبح صادق کی نظیر ہے۔

"تعصی الاله و انت تظهر حبهٗ......"

"خداوند عالم کی معصیت کرتے اور اس سے دوستی کا اظہار بھی کرتے ہو......"۔

معاویہ اور یزید کے انصار اور مشیروں میں فرق[۱]

عقاد اپنی کتاب میں معاویہ کے اعوان وانصار کو کہ جو عقلاء تھے 'انصار الدول[۲] اور بناۃ العروش[۳] کے نام سے یاد کرتے ہیں' لیکن یزید کے انصار کو جلادین کہتے ہیں۔ کتاب ''ابوالشہداء'' کے صفحہ ۸۸ پر لکھتے ہیں :

''فکان اعوان معاویه ساسة وذوی مشورة' وکان اعوان یزید جلّادین وکلاب طراد فی صید کبیر''.

''معاویہ کے تمام ساتھی سیاست مدار اور اہل مشورہ تھے اور یزید کے تمام ساتھی جلاد اور آوارہ کتے تھے جنہیں اس نے بڑے شکار کے لئے چھوڑ رکھا تھا''۔

یزید کی یہ عادت تھی کہ وہ کتوں کو بیگناہ شکار کے تعاقب میں چھوڑ دیتا تھا۔

عقاد یزید کے ساتھیوں کو دنیا پرستوں اور دنیا کے ہواداروں سے بڑھ کر بتاتے ہیں۔ معاویہ کے اردگرد عمروعاص اور اس دور کے اس جیسے تمام زیرک اور ہوشیار دنیا پرست تھے جبکہ یزید کے ساتھی ایسے لوگ تھے جنکی بشری فطرت کلی طور پر مسخ ہو چکی تھی۔

شمر' عبیداللہ اور مسلم بن عقبہ کے اخلاق و صفات

ان تینوں میں سے ہر ایک کے جسم یا نسب میں کوئی نہ کوئی نقص تھا۔ ماہر نفسیات (PSYCHOLOGISTS) کے مطابق جب کسی میں کوئی نقص و عیب ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس نقص و عیب کی وجہ سے پیدا شدہ خلا کو پُر

---

[۱] تُعرف الاشیاء باضدادها (اشیاء کی پہچان انکی ضد سے ہے) کے مطابق اس وقت کے حاکم کی ہیئت کو اسلئے جاننا چاہئے تاکہ امام حسینؑ اور آپ کے نہضت کے اسرار سے واقفیت ہو سکے۔

[۲] انصار الدول یعنی حکومت کے مددگار۔

[۳] بناۃ العروش: یعنی عرش کو اٹھانے والے۔ بطور کنایہ استعمال ہوا ہے کہ اس کی حکومت کے ستون تھے۔

کرے اور اس کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کرتا ہے[۱۰] کبھی دوسروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کبھی ان کو ذلیل کر کے اپنے اس عیب و نقص کی جبران کرنا چاہتے ہیں تاکہ توازن برقرار رہے۔

شمر کے بارے میں کہا گیا ہے:

"کان ابرص کریہُ المنظر 'قبیح الصورة وکان یصطنع المذهب الخارجی یحارب بها علیّاًوابناء ہ' ولکن لایتخذ حجةلیحارب بها معاویه وابناء ہ".

"شمر برص کی بیماری میں مبتلا تھا اور بد شکل اور مکروہ چہرہ کا حامل تھا۔ اس نے خوارج کا مذہب اختیار کیا ہوا تھا(کیونکہ اس مذہب کے زیرِ سایہ وہ اجتماع سے بہتر طور پر انتقام لے سکتا تھا) تاکہ اس بہانے علیؑ اور ان کے فرزندوں سے جنگ کر سکے۔ البتہ وہ اس مذہب کو دلیل اور حجت قرار نہیں دیتا تھا تاکہ معاویہ اور اس کی اولاد سے بھی جنگ کر سکے"۔

مسلم بن عقبہ کے بارے میں کہتے ہیں:"کان أعور امغر ' ثائرالراس ' کانما یقلع رجلیه من وحل اذا مشی"

"وہ یک چشم اور سفید بال تھا اور جب چلتا تھا تو لگتا تھا کہ کیچڑ سے ٹانگیں نکال رہا ہے"۔

عبیداللہ کے بارے میں کہا گیا ہے:

"کان متّهم النسب فی قریش لان اباه زیاداً کان مجهول النسب فکانوا یسمونه زیاد بن ابیه.ثم الحقه معاویة بابی سفیان ـالقصه......وکانت اُم عبیدالله جاریة مجوسیة تدعی مرجانة

۱۰۔ جدید علم نفسیات میں اس کو انتقامی طریہ (MECHANISM) کہتے ہیں۔

فکانوا یعیرونه بها وینسبونه الیها' کان الکن اللسان لایقیم نطق الحروف العربیة' فکان اذاعاب الحروری من الخوارج قال (هروری) فیضحك سامعوه 'وارادمرّة ان یقول: اشهروا سیوفکم فقال : افتحوا سیوفکم فهجاه یزید بن مفرغ" [۱۷]

"عبید اللہ 'قریش میں اپنے نسب کی وجہ سے متہم تھا (اہلِ عرب حلال زادہ ہونے کے علاوہ اپنے نسب پر بڑا افتخار کیا کرتے تھے اور اس کو بہت زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے)۔ چونکہ اس کا باپ 'زیاد نسبی لحاظ سے مجھول تھا' اسلئے اس کو زیاد بن ابیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بعد میں معاویہ نے اس کو ابو سفیان کا فرزند قرار دے دیا۔ (یہ داستان بہت معروف ہے) عبید اللہ کی ماں کسی مجوسی کی کنیز تھی' اس کا نام مرجانہ تھا (شاید ایرانی تھی اور ایران ہی میں اس کو جنا تھا)۔ لوگ عبید اللہ کی سرزنش کرتے ہوئے اس کو مرجانہ سے نسبت دیتے تھے۔ اس کی زبان میں لکنت تھی جسکی وجہ سے وہ عربی حروف کو صحیح طریقہ سے ادا نہیں کرپاتا تھا۔ جب کسی خارجی کی عیب جوئی کرنا چاہتا تو "حروری" کی جگہ پر "ہروری" کہتا جس پر سننے والے ہنس پڑتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنی تلواروں کو نیام میں کرلو تو اس کے بجائے اس نے کہہ دیا اپنی تلواروں کو کھول دو۔ یزید بن مفرغ نے اس شعر میں اس کے عیوب کو بیان کیا ہے":

---

۱۷ اس سلسلے میں قزوینی کی کتاب "۲۰ مقالہ" ص ۳۹ پر یزید بن مفرغ کی داستان اور عباد بن زیاد کے اس معروف شعر کی طرف رجوع کریں: الا لیت اللحی کانت حشیشا فنعلفها خیول المسلمینا. قزوینی نے اپنی کتاب میں آغانی جلد ۱۷ ص ۵۶ 'طبری سلسلہ ۲ ص ۱۹۲ اور ۱۹۳ اور طبقات الشعراء ابن قتیبہ ص ۱۲۰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا ہے۔ البتہ "۲۰ مقالہ" میں یہ بیان مختصر ہے۔ اس قصہ کی تفصیل کیلئے کتاب ابن خلکان ج ۵ ص ۳۸۴ کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔

ویوم فتحت سیفك من بعید　　اضعت و کل امرك للضیاع

"جس دن تو اپنی تلوار کو دور سے کھولے گا' اپنے آپ کو ضائع کر دیگا اور تیرے تمام کام ضائع اور بے ہودہ ہیں"۔

مسلم بن عقیل نے اس کے بارے میں کہا ہے:

"ویقتل النفس التی حرم اللہ قتلها علی الغضب والعداوة وسوء الظن وهو یلهو ویلعب کانه لم یصنع شیئاً".

"وہ بے گناہ انسانوں کو محض غصہ' دشمنی اور بدگمانی میں قتل کرتا تھا۔ اور اسی حال میں وہ لہو ولعب میں یوں سرگرم ہوتا تھا کہ جیسے کسی برے کام کا ارتکاب کیا ہی نہیں"۔ (یہ اس کے وجدان کے مرنے کی وجہ سے تھا)۔

عبید اللہ واقعۂ کربلا کے وقت فقط ۲۸ سال کا تھا۔

عبید اللہ کے باپ زیاد نے اہل بصرہ سے یزید کے لئے بیعت لینے سے انکار کیا تھا' اس وجہ سے یزید زیاد اور اس کے بیٹے دونوں کو پسند نہیں کرتا تھا[۱]۔ عبید اللہ کے یزید کی زیادہ خدمت کرنے اور خود کو زیادہ مخلص دکھانے کی ایک علت یہی تھی اسکے برخلاف عمر بن سعد صرف منصب' پیسہ اور لذات کی لالچ میں اندھا اور بہرا بن کر یزید کی اطاعت کرتا تھا۔

---

[۱] کتاب "ضحیٰ الاسلام" کے ج ا ص ۱۷۵ پر ہے: قال یزید بن معاویه یعدد فضل بیته علی زیاد بن ابیه: لقد نقلناك من ولاء ثقیف الی عزّ قریش ومن عبید الی ابی سفیان، ومن القلم الی المنابر"

"یزید بن معاویہ زیاد بن ابیہ سے اپنے خاندان کے فضائل بیان کرتے ہوئے بولا: ہم تمہیں ثقیف کی غلامی سے نکال کر قریش کی عزت میں لائے اور غلامی سے نکال کر ابوسفیان کے ہاں لائے اور قلم (کاتب) سے نکال کر منبروں پر لے آئے۔

امام حسینؑ کا غیر معروف راستہ سے سفر کرنے سے احتراز

کتاب ''نفس المہموم'' ص ۴۰ پر ہے :

''فقال له اهل بيته :لو تنكبت الطريق الاعظم كما فعل ابن الزبير كيلا يلحقك الطلب فقال : لا والله لا افارقه حتىٰ يقضى الله ماهو قاض''.

''امام حسینؑ کے خاندان کے لوگوں نے آپؑ سے کہا : ''بہتر ہے آپ معمول کے راستہ سے نہ جائیں جسطرح کہ ابن زبیر بھی نہیں گئے تاکہ لوگوں کی دسترس سے بچے رہیں''۔ آپؑ نے فرمایا : '' نہیں خدا کی قسم میں اس راستہ کو نہیں چھوڑوں گا' یہاں تک کہ خدا نے میرے لئے جو قضا مقرر کی ہے' وہ ہو کر رہے''۔

یہ بھی آپؑ کی روحی شجاعت' دلیری' اسداللہی اور مردانگی کا ایک نمونہ ہے۔

حضرت مسلم کے تنہا رہ جانے کے بعد ابن زیاد نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ نماز مسجد میں پڑھے گا۔ اس نے کہا :

''برئت الذمة من رجل من الشرطة والعرفاء و المناكب (رؤوس العرفاء) والمقاتله صلى العشاء الا فى المسجد''.

''میں نے اُن تمام پولیس افسروں' قبیلوں کے سرداروں اور فوجیوں سے اپنا امان واپس لے لیا ہے جو مسجد میں نماز عشاء ادا نہ کریں گے۔ یہاں ''مقاتل'' کے معنی سرباز کے ہیں ''شرطہ'' کی جمع شُرَط ہے۔ وهم الطائفة من خيار اعوان الولاة وفى زماننا هم رؤساء الضابطه (المنجد) : (شُرط زمام داروں کے سب سے بہتر مددگاروں کے گروہ کو کہتے ہیں اور اس سے ہمارے زمانے میں کی پولیس یا ملک کا امن محال

کرنے والے مراد ہیں)۔ ''عرفاء'' عریف کی جمع ہے۔القیم بامر القوم' کسی قوم کے امور کے سرپرستوں کو عرفاء کہتے ہیں اور یہ لفظ یہاں ''مناکب'' منکب کی جمع ہے عریف کے معنی میں ہے' پس یہاں پر مناکب سے ان لوگوں کے رؤساء مراد ہیں۔

اباعبداللہؑ کی جنگ میں پہل کرنے سے کراہت

امام حسینؑ اور حُر کے نینوا پہنچنے کے بعد عبید اللہ کا خط پہنچا کہ :

"اما بعد فجعجع بالحسينؑ حتىٰ يبلغك كتابى ويقدم عليك رسولى: فلا تنزله الا بالعراء فى غير حصن و على غير ماء".

"جیسے ہی میرا قاصد تم تک پہنچے اور میرا خط تمہیں ملے حسینؑ پر سختی کرو، ان سے جدا مت ہونا یہاں تک کہ ان کو کسی خشک اور بے آب زمین پر اتار لو"۔

زہیر نے اس وقت امامؑ کو ان سے جنگ کرنے کی تجویز دی تو اباعبداللہؑ نے فرمایا: "انى اكره ان ابدائهم بالقتال"۔ "مجھے پسند نہیں کہ میں ان لوگوں سے جنگ کرنے میں پہل کروں"۔ جنگ میں پہل نہ کرنا آپؑ کا اصول تھا۔ حضرت علیؑ کا قصہ اور آپؑ کا کریب بن الصباح کے قتل پر اس آیت کریمہ کا پڑھنا اسی اصول کا اعلان تھا:

"الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص......"۔

"شہر حرام کا جواب شہر حرام ہے اور حرمات کا بھی قصاص ہے، لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اسکے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں ہی کے ساتھ ہے"۔

(سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۹۴)

امامؑ نے فرمایا: "اگر تم لوگ ابتداء نہ کرو، تو ہم ابتدا نہ کریں گے"۔

عمر سعد کا مأمور ہونا

کتاب "نفس المہموم" میں ص ۱۱۴ پر لکھا ہے: وكان الديلم قدثاروا على يزيد بن معاويه واستولوا على دستبى بارض همذان، فجمع هم عبيدالله بن زياد جيشاً"۔

"دیلم نے یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور ہمدان کے دستبی نامی مقام پر وہ صاحب قوت تھا۔ عبیداللہ بن زیاد نے (اس کے خلاف جنگ کیلئے ایک فوج تیار کی"۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیلم سے جنگ کرنے کا حکم عبیداللہ نے کوفہ آنے سے پہلے، یعنی جب وہ فقط بصرہ کا حاکم تھا، عمر سعد کو دیا تھا۔

امام حسینؑ سے لوگوں کی جنگ کرنے سے باطنی کراہت

کتاب "نفس المہموم" ص ۱۱۶ پر لکھا ہے: وکان جنود الجیش یتسللون منه و یتخلفون بالکوفة، فندب عبیدالله رجلاً من اعوانه (هو سعد بن عبدالرحمن المنقری) لیطوف بها ویاتیه بمن تخلف عن المسیر لقتال الحسینؑ وضرب عنق رجل جیٔ به. وقیل انه من المتخلفین فاسرع بقیتهم الی المسیر".

"اور لشکر کے لوگ مخفی طور پر فرار کر جاتے تھے اور کوفہ میں جا بیٹھتے تھے۔ عبیداللہ نے ایک دوست کو بلا کر حکم دیا کہ کوفہ میں گشت کرے اور جس کسی کو بھی حسینؑ کی طرف حرکت کرنے سے ہچکچاتا دیکھے، اس کے پاس لے آئے۔ چنانچہ ایک ایسے شخص کو اس کے پاس لایا گیا تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد باقی لشکر تیزی سے حرکت کر گیا"۔

اہل کوفہ نے ابن زیاد کی موافقت اور تبعیت میں جتنی جانیں دیں، اتنی ہی تعداد بلکہ اس تعداد کی ایک دہائی (دسواں حصہ) بھی اگر اس کی مخالفت میں دے دیتے تو وہ اپنی دلی آرزو (یعنی بنوامیہ کا سقوط) حاصل کر لیتے۔ لیکن یہ لوگ درندہ خُو ہو چکے تھے، خودباختہ تھے، اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتے تھے اور اپنے کاموں کو منظّم شکل نہیں دے سکتے تھے۔ جنابِ ہانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے

ساتھ چند ہزار مسلح افراد ہوتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابن زیاد نے اپنی درندگی اور غضب دکھا کر ان سب کو مرعوب کر لیا۔ ابن زیاد اپنے ساتھ شام یا بصرہ سے تو کوئی فوج بہر حال لے کر آیا نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆

فلسفۂ قیام حسینی

عقاد کہتے ہیں "......انما الحکم فی صواب الحسین وخطئه لامرین لا یختلفان باختلاف الزمان واصحاب السلطان، والبواعث النفسیه التی تدور علی طبیعة الانسان الباقیة والنتائج المقررة التی مثلت للعیان باتفاق الاقوال......"

"قیام امام حسینؑ صحیح تھا یا غلط' یہ دو الگ موضوعات ہیں۔ زمانہ اور حکمرانوں کے فرق سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اس قیام کے جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتائج بر آمد ہوئے' وہ واضح طور پر عیاں ہیں اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے۔"

یزید کی خلافت کے نفسانی علل اور اسباب کو عقاد اس طرح بیان کرتے ہیں :

اول تو یزید کی حکومت پائیدار' مضبوط اور مستحکم نہیں تھی (جیسا کہ معاویہ کی حکومت تھی)۔ تنہا مغیرۃ بن شعبہ نے کہ جو اس وقت کوفہ کا معزول شدہ حاکم تھا۔ یزید کی ولیعہدی کی تجویز پیش کی تھی۔ خود معاویہ نے اس تجویز کو اسوقت باور نہ کیا اور اس سلسلے میں زیاد سے مشورہ کیا مگر اس نے بھی اس کو مصلحت نہیں جانا (کم از کم اس وقت)۔ مروان بن حکم تو اس تجویز کا سخت مخالف تھا ہی کیونکہ وہ خود خلافت کی لالچ میں تھا' حتی کہ اس نے اس بابت شورش بر پا کرنے کے بارے میں

بھی سوچا لیکن بعد میں اپنے لئے ماہانہ ہزار دینار اور اپنے دوستوں کے لئے سو (۱۰۰) دینار پر قانع ہو گیا۔ عثمانؓ کے بیٹے سعید نے معاویہ سے گلہ کیا کہ میرے ماں' باپ اور خود میں یزید اور اس کے ماں باپ سے بہتر ہیں۔ بعد میں وہ بھی خراسان کی حکومت ملنے پر راضی ہو کر چلا گیا۔ غرض یہ کہ یزید کی حکومت کو خود استقرار نہیں تھا۔

دوم یہ کہ یزید کی حکومت کی بناء ابتدا ہی سے علیؑ اور آل علیؑ پر سب وشتم پر تھی۔ اگر امام حسینؑ بیعت کر لیتے تو ناچار ایفا کرتے اور یہ اس بری سنت کا امضاء (مہر ثبت کرنا) ہوتا اور نسلاً بعد نسل لوگوں کے لئے یہ قابل قبول واقع ہو جاتا۔ یزید کی حکومت معاویہ کی حکومت سے سو درجہ بدتر تھی' چونکہ رسوا زدہ تھی۔

اب ذرا اس حرکت کے نتائج کی طرف رجوع کرتے ہیں :

اولاً خود یزید معرکۂ کربلا میں کامیابی کی خوشی کا گھونٹ حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ کربلا کے حادثہ کے بعد مدینہ کا حادثہ تھا۔ عبداللہ بن زبیر کو واقعۂ کربلا کے طفیل تبلیغات کے اچھے وسائل مہیا ہوئے اور مکہ کا واقعہ پیش آیا۔ بعد میں "یالثاراتِ الحسینؑ" ایک ایسا ستارہ بن کر روشن ہوا جس نے امویوں کو بعد کے ساٹھ سالہ دورِ حکومت میں ہمیشہ لرزہ بر اندام رکھا۔ لہٰذا بعض مؤرخین جیسے مارٹن جرمن سمجھتے ہیں کہ حسینیؑ سیاست اول روز سے ہی اِن اہداف کی طرف متوجہ تھی۔

امام حسینؑ کے بچوں اور خواتین کو ساتھ لے جانے کے بارے میں عقاد کہتے ہیں :

"انما يبدو الخطاء فی هذه الحركة حين تنظراليها من زاوية واحدة ضيّقة المجال قريبة المرمی' وهی زاوية العمل الفردی الذی يراض باساليب المعيشة اليومية ويدور علی النفع

العاجل للقائمین به والداعین الیه......"[۱۰]

"حضرت مسلمؓ ابن زیاد کے گروہ کے لوگوں کی طرح بہت سے ایسے کام انجام دینے کی قدرت رکھتے تھے، مثلاً دوسروں کا مال غصب کر لینا، بخششیں دینا اور کچھ لوگوں کو قتل کر دینا لیکن یہ سب اس اصول کے خلاف تھا جسکی وہ پیروی کر رہے تھے۔ حضرت مسلمؓ جب شہید ہونے کے لئے آمادہ ہوئے تو اس وقت وصیت کی کہ مجھ پر سات سو (۷۰۰) درہم کا قرض ہے، میری زرہ اور تلوار کو بیچ کر اسے ادا کر دینا۔"

(حضرت امام حسینؑ کا فرمان سہم امام کا اجازہ دینے کے مترادف تھا مگر پھر بھی حضرت مسلم اپنے کوفہ میں چند روزہ قیام کے دوران لوگوں کے مال و متاع کو صاف کرنے کی فکر میں نہیں پڑے)۔

---

[۱۰] "اس حرکت و قیام کے بارے میں خطا و اشتباہ یہاں سے شروع ہوا ہے کہ ہم فقط ایک تنگ اور محدود زاویہ سے اس کی طرف نگاہ کرتے ہیں اور وہ زاویہ انفرادی عمل کا زاویہ ہے۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو روزمرہ زندگی کے گوناگوں اسباب میں پھنسے رہتے ہیں اور جو فقط جلدی ملنے والی دنیوی منفعت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں"۔

ہم ایک مرتبہ امام حسینؑ پر بطور ایک محدود شخصیت کے نظر کرتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرح اچھا کھانا کھائیں، اچھے لباس پہنیں، بہتر آقائی کریں، راحت اور آسایش سے رہیں، عیش اور خوشی کے تمام اسباب اور لوازمات انکے لئے مہیا ہوں۔ اُس وقت ہم کہیں گے کہ اس آدمی کے لئے اور اس کی مصلحت کیلئے دوسروں (جیسے ابن زیاد) کے مقابل میں چنین اور چنان ہونا چاہئے۔ اور ایک مرتبہ ہم امام حسینؑ کو ایک وسیع تر اور عظیم تر شخصیت کا حامل دیکھتے ہیں، ان کو دنیا کے دوسرے تمام لوگوں سے مختلف پاتے ہیں۔ پس آپؑ اپنے عصر میں بھی اور دوسرے زمانوں میں بھی ایک عظیم اور نادر شخصیت تھے۔ آپ کا وجود ایک سلسلۂ اصول کا وجود بن گیا۔ عدل ہوا، حق ہوا، توحید ہوا، راستی اور صراحت ہوا، نماز اور بندگی ہوا، آپؑ سب کا مجسمہ بن گئے تھے۔ **قل ان کان آبائکم وابناء کم وازواجکم ......**

"کہہ دو اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی، اور مال جو تم کماتے ہو، اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جس کو پسند کرتے ہو، خدا اور اسکے رسول سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو۔ یہانتک خدا اپنا امر (عذاب) بھیجے"۔ (سورۂ توبہ آیت نمبر ۲۴)

کلمۂ کربلا

کہتے ہیں کہ کربلا اصل میں "کور بابل" تھا۔

روحیۂ اصحاب امام حسینؑ، ان کا عشق صادق اور ان کا انتخاب مرگ وایثار

آثرو الموت یعنی اختیاری طور پر موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دینے کی خصوصیت تمام شہدائے کربلا میں تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس بچ کر نکل جانے کا موقع میسر نہ رہا ہو۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ناگہانی طور پر کچھ مرد یا عورتیں یا کچھ مرد اور بچے کسی جگہ پر گرفتار ہو جاتے ہیں، بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور بہت زیادہ دردناک حالت میں مارے جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کے دیگر فجیع حوادث کے درمیان حادثہ کربلا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سب لوگ اس حادثہ سے نجات پانے کا راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ بس اسکے لئے ذلت اور بے ایمانی کو قبول کرنا پڑتا لیکن یہاں سب ہی نے ایمان، فداکاری، ایثار اور تعظیم حق کو ترجیح دی۔ وہ جمالِ اخلاق، شہادت کی زیبائی اور کمال عبودیت کو درک کر چکے تھے۔ حضرت عباس بن علیؑ کے امان نامہ کا قضیہ، محمد بن بشر الحضرمی کا قصہ اور سید شہداء کا اصحاب سے بیعت کا واپس لینا عمومی طور پر، اور جناب قاسم کا قضیہ اور سیاہ غلام جون کا قضیہ، یہ سب اختیاری موت کو ترجیح دینے کے گواہ ہیں۔

اباعبداللہ کے اصحاب کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے حضرت امام حسینؑ اور بنو ہاشم کی شہادت سے پہلے اپنے آپ کو منزلِ شہادت تک پہنچایا اور یہ ان کا اپنے قائد پر کمال ایمان ہونے کی دلیل تھی۔

اباعبداللہؑ کے اصحاب نے نہ تو اُجرت و مزد کے لئے جنگ کی اور نہ ہی کسی ڈر

اور خوف کی وجہ سے 'بلکہ فقط ایمان' عقیدہ اور آزادی کے لئے جنگ کی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے کسی بھی مقام پر تسلیم ہونے اور سلامتی سے باہر نکل آنے کے لئے کوئی عذر یا توجیہ پیش نہیں کی۔ عقاد اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۷ پر لکھتے ہیں:

"ولم يخطر لأحد منهم ان يزيّن له العدول عن رأيه ايثاراً لنجاتهم ونجاته' ولو خادعوا انفسهم قليلاً لزيّنوا له التسليم وسمّوه نصيحة مخلصين يريدون له الحياة 'ولكنهم لم يخادعوا انفسهم ولم يخادعوه وراء اصدق النصيحة له ان يجنبوه التسليم ولا يجنبوه الموت' وهم جميعاً على ذلك".

"کسی کے بھی ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اپنی نجات کی خاطر یا امام عالی مقامؑ کی نجات کے لئے اس سفر سے واپس جانے کی کوئی بات امامؑ سے کی جائے۔ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو فریب دینا چاہتے تو امامؑ کی خدمت میں دشمن کے سامنے تسلیم ہونے کی بات کرتے اور اس کو خیر خواہی اور نصیحت کا نام دے دیتے اور ایسا ظاہر کرتے کہ وہ پر خلوص ہیں اور امامؑ کی زندگی کو باقی رکھنے کے آرزومند ہیں (جیسا کہ ابن عباس اور دیگر لوگوں نے کیا تھا)۔ لیکن انہوں نے نہ اپنے آپ کو فریب دیا اور نہ امامؑ کو' اور سچّی خیر خواہی اسمیں دیکھی کہ خود کو دور رکھا تو تسلیم ہونے سے 'نہ کہ مرگ اور موت سے۔ اور وہ سب کے سب ہی ایسے تھے"۔ اسکے باوجود کہ یہ لوگ اپنے اہل وعیال اور اطفال کو دیکھتے تھے اور ان کی عاقبت سے بھی باخبر تھے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مکتب حسینی' عشق کا مکتب تھا۔ مناخُ رُکابٍ ومنازلُ عُشّاقٍ۔

"سواروں کے گرنے کی جگہ اور عاشقوں کا محلِ نزول ہے"۔

شود آسان بہ عشق کاری چند　　کہ بود نزد عقل بس دشوار

"جو کام عقل کے مطابق بہت زیادہ دشوار ہو' وہ عشق کے ذریعہ چند اں آسان ہو جاتا ہے"۔

منطق ابن عباس اور منطق امام حسینؑ

ابن عباس کی منطق' سیاست کی منطق اور سیاست بازی تھی۔ انہوں نے عقلی منطق کے مطابق صحیح کہا تھا:

"انی اتخوف علیك فی هذاالوجه الهلاك 'ان اهل العراق قوم غدر' اقم بهذا البلد فانك سید اهل الحجاز'فان كان اهل العراق یریدونك كما زعموا فلینفوا عدوهم' ثم اقدم علیهم ' فان ابیت الا ان تخرج. فسرالی الیمن فان لها حصوناً و شعاباًولأبیك بهاشیعة".

"مجھے خوف ہے کہ اس سفر میں آپؑ قتل ہو جائیں گے کیونکہ اہل عراق ایک غدار قوم ہیں۔ (آپؑ بھی ان سے سیاست بازی کریں اور ان سے غدر کریں)۔ اسی شہر میں رُک جائیں کیونکہ آپ اہل حجاز کے سرورو سردار ہیں۔ اگر اہل عراق آپ کے خواہاں ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ پہلے وہ آپ کے دشمنوں کو وہاں سے دور کریں اور انہیں اپنے شہر سے نکال دیں (دانہ کو بھوسہ سے جدا کرنے کیلئے وہ خود نکلیں اگر مر بھی گئے تو کوئی بات نہیں' اگر غالب ہو گئے اور آپ کے لئے موقع مہیا ہو جائے تو پھر آپؑ چلے جایئے گا۔ یہ درست سیاست بازوں کی منطق ہے۔ اس میں دنیاوی نفع کی منطق ہے' نہ کہ شہیدوں کی منطق)۔ اس

کے بعد آپ وہاں چلے جایئے گا۔ اگر قطعی طور پر باہر نکلنے کا مصمم ارادہ ہے تو یمن کی طرف چلے جایئے 'اسلئے کہ وہاں بہت سے قلعے اور درّے ہیں اور وہاں آپ کے والد گرامی کے شیعیان بھی ہیں"۔

ابن عباس کی باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل عراق اپنے حاکم کو باہر نہیں نکالتے اور اہل جہاد نہیں بنتے تو آپ بھی ان کو چھوڑ دیں۔ یہ منطق معاملہ کی منطق ہے۔ امامؑ کی منطق نہ غدر اور دھوکہ کی منطق تھی اور نہ ہی معاملہ اور نفع کے ہمکاری کی منطق۔ آپ کی منطق صرف ایثار' عقیدہ اور راہ عقیدہ میں شہادت کی منطق تھی۔ انسان یا مطقِ مکر و فریب رکھتا ہے جیسا کہ دنیا کے اغلب سیاست دان' یا مطقِ معاملہ رکھتا ہے جیسا کہ آجکل کی سیاسی پارٹیوں کی منطق۔ یا پھر فداکاری اور عقیدہ کی منطق جیسے کہ نوادرِ خلقت 'امام حسینؑ کی منطق۔

ابن عباس کے جواب میں امام حسینؑ نے فرمایا:

"یاابن عم انی اعلمُ انك ناصح مشفق ولكنی قدازمعت واجمعت علی المسیر"۔

"اے میرے چچا کے بیٹے! میں جانتا ہوں کہ آپ میرے شفیق ناصح ہیں (خود میری ذات کے لئے اور میری ذات کے مصالح کے لئے) لیکن میں حرکت کرنے کے لئے قطعی طور پر مصمم ارادہ رکھتا ہوں"۔

امامؑ کے اِس جواب کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کی بات میں حسن نیت تو ہے لیکن میں ان مقدمات اور نتائج کو قبول نہیں کرتا۔ بلکہ آپؑ کا مدعا یہ تھا کہ یہ مقدمات اور نتائج اُس کے لئے تو درست ہیں جو اس راہ پر چل کر اہل معاملہ اور معاوضہ ہونا چاہے لیکن میری راہ یہ نہیں ہے' میری منطق عقیدہ کا درد رکھنے 'اور خیر خواہی کی منطق ہے 'اس طبیب کا درد ہے جسکو مریضوں کے غم کا رنج ہوتا

ہے۔ عزیزٌ علیه ماعنتم حریص علیکم۔ میری راہ شہادت کی راہ ہے۔ شہید کی منطق مختلف ہوتی ہے، عقل کی منطق سے اور عملی نفع حاصل کرنے کی منطق سے بالکل مختلف۔ ان الله شاء ان یرایك قتیلاً کا مطلب یہ ہے کہ خدا تم سے شہادت کی روح کا طالب ہے۔ ان لك درجة لن تنالها الابالشهادة (بیشک آپ کے لئے ایک ایسا درجہ اور مقام ہے جس پر شہادت کے بغیر فائز نہیں ہوا جاسکتا)۔

حضرت ابا عبد اللہ کے وہ صفات جو کربلا میں ظاہر ہوئے

روز عاشور اباعبد اللہ کے جن صفات نے ظہور کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ شجاعت بدنی۔

۲۔ قوت قلب اور روحی شجاعت۔

۳۔ خدا، پیغمبر اور اسلام پر کامل ایمان

۴۔ عجیب صبر و تحمل

۵۔ رضاو تسلیم

۶۔ تعادل، بے جا ھیجان انگیز نہ ہونا اور سبک قسم کی کوئی بات نہ کرنا۔ (یہ صفت نہ صرف امامؑ میں بلکہ آپؑ کے اصحاب میں بھی تھی)۔

۷۔ کرم و بزرگواری۔

۸۔ فداکاری اور قربانی۔

بشر کے درمیان نور و ظلمت کے جنگ کا فلسفہ

کتاب ''ابوالشہداء'' کے صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ہے :فجيرة كربلا كانت قديما من معاهد الايمان بحرب النور والظلام، وكان حولها اناس يؤمنون بالنضال الدائم بين اور مزد واهرمان ولكنه كان فى الحقيقة ضرباً من اعجاز وفناً من الخيال .وتشاء مصادفات التاريخ ان لاترىٰ هذه البقاع التى آمنت باورمزدواهرمان حرباً هى اولى ان تسمّى حرب النور والظلام من حرب الحسينؑ ومقاتليه وهى عندنا اولىٰ بهذا الاسم من حرب الاسلام والمجوسية فى تلك البقاع وماوراء هامن الارض الفارسية، لان المجوسى كان يدافع شيئاً ينكره، ففى دفاعه شئٌ من الايمان بالواجب

کماتخیله ورآه ولکن الجیش الذی ارسله عبیدالله بن زیاد لحرب الحسینؑ کان جیشاً یحارب قلبه لأجل بطنه، اویحارب ربه لاجل والیه".

"کربلا کے اطراف کی سر زمین بہت زمانے سے نور و ظلمت کے درمیان مبارزہ کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے اطراف کچھ ایسے لوگ رہتے تھے جو ہرمزد اور اہرمن (نور و ظلمت، خدا و شیطان) کے درمیان دائمی جھگڑے پر ایمان رکھتے تھے۔ (گویا علم گڑے ہوں ایک سفید، ایک سیاہ) لیکن در حقیقت یہ ایک قسم کی مجاز گوئی اور مہمل تصور تھا اور تاریخی حوادث کے وقوع کے اتفاق سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں تھی۔ اسلئے اس سر زمین کو سر زمینِ ہرمزد و اہرمن کا نام دینے کے بجائے اور کربلا کی جنگ کو نور و ظلمت کی جنگ کہنے کے بجائے حسینؑ اور ان کے قاتلوں کی جنگ کہنا مناسب ہوگا۔ (امام حسینؑ کے ایران کے نزدیک دفن ہونے کا فلسفہ) یہ جنگ ہمارے نزدیک اس نام سے پکارے جانے کی زیادہ سزاوار ہے بہ نسبت مسلمانوں اور مجوسیوں کے درمیان جنگ کے، جو اس سر زمین اور اس کے اطراف میں فارس کی زمینوں میں ہوئی تھی۔ اسلئے کہ مجوسی اُس چیز سے مبارزہ کرتے ہیں جو اُن کے عقیدہ کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس چیز کے دفاع کو وہ ایمان سے نسبت دیتے ہیں اور اس بات کے معتقد ہوتے ہیں کہ اس چیز کا وجود ہے۔ بر خلاف اس کے عبیداللہ کے وہ سپاہی جن کو اس نے امام حسینؑ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بھیجا تھا، وہ سپاہی تھے جو اپنے قلب سے شکم کی خاطر اور اپنے پروردگار سے اپنے زمامدار کی خاطر جنگ لڑ رہے تھے۔ (حتی بدر و اُحد میں بھی رؤسا کے علاوہ باقی مشرکین، عقیدہ کی بنیاد پر جنگ کر رہے تھے)۔

اصحاب ابن زیاد کے روحیہ

ورکب اناساً منھم الفزع الدائم بقیة حیاتھم (ان میں سے کچھ لوگوں پر انکی باقی ماندہ عمر میں ایک دائمی وحشت چھاچکی تھی)۔چونکہ ان کا عقیدہ اور وجدان خود ان کے عمل کی ضد تھا'اسلئے ان کا وجدان ان کو دائمی طور پر ہلاکت کی خبر دیتا تھا۔ مثلاً ان میں سے بہت سے افراد وجدان کے عذاب میں مبتلا ہوہوئے تھے اور یہ فریاد کرتے تھے :"مجھے ماردو! میرے اس ننگ وعار کے وجود کو درمیان سے ہٹادو"۔بسر بن ارطاۃ کی عمر کے آخری حصہ میں دیوانگی شاید اسی وجہ سے تھی۔ ان جیسے افراد کو عذاب دینے والا فرشتہ خود ان کا وجدان تھا۔ لانھم عرفوا الاثم فیما اقترفوہ عرفاناً لاتسعھم المغالطۃ فیہ(کیونکہ وہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے بہت بڑا گناہ سرزد ہواہے اور انہیں اس گناہ کا اس حد تک یقین ہو گیا تھا کہ مغالطہ نہیں کہہ سکتے تھے اور اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے)۔

اصحابِ عمر سعد کی باطنی خباثت

کربلا کے جنایت آمیز وقایع کی توجیہ بزدلی اور طمع نہیں ہو سکتی۔اسی طرح ذاتی کینہ و حسد بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں پر ذاتی کینہ کاربند نہ تھی۔امام حسینؑ نے روز عاشورا فرمایا :"آیامیں نے کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کیا ہے کہ ازروئے عقیدہ مجھ سے جنگ کر رہے ہو ؟ آیا میں نے کسی کا مال لے لیا ہے یا کسی کا خون بہایاہے کہ شخصی عداوت اور دشمنی کے تحت مجھ سے جنگ کر رہے ہو ؟"

بزدلی اور طمع'طفل صغیر کو شہید کرنے'مُثلہ اور تنکیل کرنے'پانی بند کرنے اور لاشوں پر گھوڑے دوڑانے کی توجیہہ نہیں بن سکتے۔بلکہ یہاں پر کہنا چاہئے کہ شمر جیسے لوگوں کی سرشت اور طینت میں ہی ایک قسم کی ذاتی خباثت اور حق سے

کینہ تھا اور وہ ہر جوانمردانہ عمل کے مخالف تھے۔

اصحاب سید شہداءؑ میں نظم

عقاد کے نقل کے مطابق (صفحہ ۱۸۴) اصحاب سید شہداءؑ کے کام میں ایک ایسا نظم تھا کہ بعض نے اپنے آپ کو امام حسینؑ کا محافظ اور سپر قرار دیا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ گرتے، فوراً ہی اس جگہ اور اس خلاء کو دوسرے پُر کر دیتے تھے۔

شعراء حضرات اکثر اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ میری آرزو یہ ہے کہ ایک لحظہ کے لئے اپنے محبوب کو دیکھ لوں اور مر جاؤں یا میری آرزو یہ ہے کہ میرا فلاں مقصد حاصل ہو اور میں مر جاؤں۔ ان کے لئے ایک موضوع اس قدر جالب اور مہم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آمادہ ہوتے ہیں کہ اپنی تمام زندگی کو اور تمام مدت زمان کو ایک لحظہ میں جمع کر لیں، اس کیفیت کے ساتھ کہ جس کے وہ خواہاں ہیں۔ وہ حیات سے حیات کی کسی کیفیت کے خواہاں ہوتے ہیں، نہ اس کی کمیت کے۔ (این جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست......)۔ ابا عبداللہؑ کے اصحاب بھی اپنی حیات کی کمیت کو خیرباد کہہ چکے تھے اور اپنی تمام حیات اور زندگی کی سب خوشیوں کو (وہ خوشیاں جن کو فقط گنتی کے عظیم روحیہ کے حامل لوگ ہی درک کرتے ہیں) فقط ایک شب اور نصف روز میں اپنے لئے جمع کر لیا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ وہ فداکاریاں اور وہ خاک میں غلطگیاں، کسقدر عظمت، جلال و جمال اور زیبائی کی حامل تھیں۔ انسان ایک نصف دن زندہ رہے لیکن اُس معنوی حالت میں غرق ہو جائے، برتری ہے ہزار سال کی اُس حیوانی زندگی سے جس میں کھانے پینے اور سونے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ ہم عرضِ عمر کے طالب ہیں، طول عمر کے طلبگار نہیں۔ عرضِ عمر، عمر کی کیفیت ہے جو مختلف لوگوں کی نظروں میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض کے نزدیک پیٹ بھرنا، مستی، قماربازی اور بادہ گساری کرنا عرضِ عمر ہے اور

بعض کے نزدیک حریت' استقلال' کسی کے زیر تسلط نہ ہونا اور معنوی اور الٰہی عشق عرضِ عمر ہے۔ موسولینی کہتا تھا: "انسان ایک سال شیر کی طرح زندگی گزارے' بہتر ہے اس سے کہ گوسفند کی طرح سو(۱۰۰) سال کی زندگی گزارے"۔ لیکن اس نے کہا کہ میرے قول کو چھپا کر رکھو۔ موسولینی کی نظر میں عرضِ عمر شیر کی طرح کی درندگی تھا جبکہ حضرت علیؑ کی نظر میں مثلاً عبادت اور حقیقت کی خدمت تھا۔

اباعبداللہؑ کے اصحاب کی شجاعت اور لشکر عمر سعد کی عقب نشینی کی حکایت

عمر سعد کے سپاہیوں نے کربلا میں کچھ ایسے کام کئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعاً یہ لوگ اس قلیل فوج کے سامنے عاجز رہ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ ایک ایک کر کے جنگ لڑنے سے گریز کرنا اور تیر اندازی کرنا۔

۲۔ پشت خیمہ سے حملہ کرنا تاکہ خیموں کو جلادیں یا پیچھے سے خنجر گھونپیں۔

۳۔ عمر سعد کا خود سید شہداءؑ کی ذات سے جنگ کے بارے میں یہ حکم دینا کہ: "ھذَا ابنُ قتال العرب" ("یہ عرب کے قاتل کا بیٹا ہے") اور اس کا یہ حکم کہ "حسینؑ کو بات نہ کرنے دو"۔

لشکر عمر سعد کے دِیایت ما بانہ اعمال

وہ پست اعمال جو لشکرِ عمر سعد کے ہاتھوں ظاہر ہوئے' وہ جنگ اور گھوڑ سواری کے قانون سے کلی طور پر دور تھے:

۱۔ پانی کا بند کرنا (فقط اپنے مقابلین پر ہی نہیں بلکہ اطفال اور چھوٹے بچوں پر بھی)

۲۔ بچوں کا قتل خصوصاً ان کی ماؤں' بہنوں' پھوپھیوں کی نظروں کے سامنے'

جیسے اس طفل کا قضیہ کہ لہٗ قُرطان (جس کے دو گوشوارے تھے)

۳۔ جسم امام حسینؑ کو لباس لوٹنے کی لالچ میں برہنہ کرنا۔

۴۔ عورتوں کے سروں پر جھپٹ پڑنا اور ان کے بدن سے زیورات نوچنا۔

۵۔ اس قلیل تعداد پر سنگباری کرنا اور تیر برسانا۔

۶۔ دل خون کرنے والی شماتت کرنا۔

۷۔ شہید کے سر کو گھوڑے کی گردن میں لٹکانا۔

۸۔ سب و شتم کرنا اور گالیاں دینا۔

۹۔ حضرت امام حسینؑ کے بدن پاک پر گھوڑے دوڑانا۔

۱۰۔ اسیروں کو اذیت دینا' ان کو مارنا اور ان کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کرنا۔

۱۱۔ بیمار (امام سجادؑ) کو طوق و زنجیر میں جکڑنا۔

۱۲۔ شہداء کے سروں کو اسیروں کے سامنے لانا۔

۱۳۔ اسیروں کو گندی جگہ پر ٹھہرانا۔

۱۴۔ غمزدہ اور داغ اُٹھائے ہوئے اسیروں کی شماتت کرنا۔

۱۵۔ سر مقدس اور دندان مقدس سے جسارت کرنا۔

۱۶۔ عورت کو قتل کرنا (وہب کی ماں)

۱۷۔ اسیروں کو قتلگاہ سے گزارنا (جب خود اسیروں کا اپنے ورثاء کو وداع کرنے کا تقاضا بھی نہ ہو)۔

۱۸۔ خیموں کو رات میں آگ لگانا' جبکہ اس رات اسیروں کو وہیں ٹھہرنا تھا۔

۱۹۔ بچوں کو روٹی اور غذا نہ دینا' جیسا کہ معصوم بچوں نے لوگوں کے ہاتھوں سے روٹی اور خرما لے لیا تھا اور حضرت ام کلثوم مانع ہوئی تھیں۔

یزید کے وہ تین اقدام جو اُمویوں کے زوال کا سبب بنے
(خصوصاً حادثہ کربلا کا عظیم اثر)

عقاد اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱۶ پر لکھتے ہیں: "ولقد كانت ضربة كربلا و ضربة مدينه وضربة البيت الحرام اقوىٰ ضربات اميّة لتمكين سلطانهم وتثبيت بنيانهم وتغليب ملكهم على المنكرين والمنازعين ' فلم ينتصر عليهم المنكرون والمنازعون بشئ كما انتصروا عليهم بضربات ايديهم' ولم يذهبوا بهاضاربين حقيقة حتى ذهبوا بها مضروبين الى آخر الزمان ' وتلك جريرة يوم واحد هو يوم كربلا فاذا بالدولة العريضة تذهب فى عمر رجل واحد مديد الايام".

"حقیقتاً بنو امیہ نے کربلا' مدینہ اور بیت الحرام پر جو ضربیں لگائیں' وہ طاقتور ترین اضراب تھیں جو انہوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے' اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور خود اپنے مخالفین پر مسلط کرنے کے لئے لگائی تھیں۔ ان کے مخالفین بھی اِن حملوں کا اُن سے کبھی بھی انتقام نہیں لے سکے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو بنو امیہ نے ضربت لگائی نہیں تھی بلکہ خود ضربت کھائی تھی جو دائمی تھی۔ یہی کربلا کا ایک دن کی جنایت کا واقعہ اس کا سبب بنا کہ ایک عریض وطویل مملکت اس قدر تنہا ہو گئی کہ فقط ایک آدمی کی عمر کے برابر اسکی عمر رہی۔ (اگر حادثہ کربلا نہ ہوتا تو شاید بنو عباس کی حکومت کی طرح یہ بھی دوام پیدا کرتے)"۔

دنیا میں سید الشہداءؑ کی پاداش اور فلسفۂ تعظیمِ عاشورا

عقاد صفحہ ۲۲۴ پر لکھتے ہیں: وتسديد العطف الانسانى منافرض من

اقدس الفروض علی الناظرین فی سیرالغابرین لان العطف الانسانی هو کل مایملك التاریخ من جزاءٍ وهوالثروۃ الوحیدۃ التی یحتفظ بھا الخلود".

"ہماری نظر میں اقامہ اور عواطف انسانی کی تحریک مقدس ترین واجبات میں سے ایک ہے جو گزشتہ لوگوں کی سیرت میں بھی واجب ہوئی ہے۔ (عزاداریٔ سید الشہداءؑ کا فلسفہ اور وہ پاداش جو تاریخ کو دینا چاہئے)۔ کیونکہ انسانی عواطف ہی وہ تمام پاداش ہیں جو تاریخ کسی کو دے سکتی ہے اور یہی تنہا وہ ثروت ہے جو تاریخ کے ساتھ ہمیشہ محفوظ رہتی ہے"۔ (تذکرۂ سید شہداء کا فلسفہ ایک جانب تو ہم سے مربوط ہے کہ ہم ایک فیض آور سرچشمہ سے استفادہ کرتے ہیں' دوسری جانب یہ شہداء اور شہادت کی قدردانی وتشکر ہے اور تیسری طرف یہ ایک تاریخی فریضہ اور اجتماعی وظیفہ ہے جو اجتماع پر فرض ہے)۔

کسی اجتماع میں تنازع' تضارب' تسلط اور استحصال و استمسار کا محرک فردی منفعت ہوتی ہے جبکہ آپس میں اعانت و تعاون' اعلیٰ اخلاق اور انسانیت کے اصولِ عالی کو رواج دینے کا تعلق منفعتِ عمومی سے ہے۔

پس عام لوگوں کے ساتھ اچھائی کرنے والے' واقعاً اجتماع کے اصول اور ناموس کے خدام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماع ان کی بہت قدر تشکر کرتا ہے۔

دوسرا باب

ماہیّت قیام حسینیؑ کی یادداشت

ماہیّت قیام حسینیؑ کی یادداشت

ہماری یہ بحث اس بارے میں ہے کہ حادثۂ عاشورا کس نوع کا حادثہ ہے اور کیسا مقولہ ہے؟ کیا اجتماعی نظر سے یہ ایک بے ہدف و بے مقصد انفجار تھا اور بہت سے انفجاروں کی طرح جو ظلم و تشدد اور سختگیری کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں اور کبھی موجود حالات کیلئے کمک کا باعث بنتے ہیں، آیا یہ اس نوعیت کا حادثہ تھا؟ یا یہ حادثہ اس وقت کے اوضاع واحوال کی مناسبت سے اور اپنے آثار و نتائج کی مناسبت سے ایک آگاہانہ اور ہوشمندانہ اقدام تھا؟ اور دوسری صورت میں آیا یہ ایک مقدس قیام، نہضت اور انقلاب تھا یا ایک مقدس اور شرافتمندانہ دفاع تھا؟ آیا یہ ایک ایسا اقدام تھا جو امام حسینؑ کی طرف سے شروع ہوا جسکو حکومت وقت کچل دینا چاہتی تھی؟ یا خود امامؑ حکومت وقت کی طرف سے مورد ظلم و عتاب واقع ہوئے تھے اور آپؑ نے سکوت اور تسلیم کے بجائے شرافتمندانہ طور پر اپنا دفاع کیا؟ دوسرے لفظوں میں آیا یہ حادثہ جامعہ میں تقویٰ کے سنخ سے متعلق کوئی چیز تھی اور تقویٰ کا ایک بڑا مظہر تھا جو جان دیدینے کی حد تک تھا۔ یا ایک احسان عصیان اور مقدس قیام کا مظہر تھا؟ آیا حادثۂ کربلا اثبات کی نوعیت کا حادثہ تھا یا مخالف فریق کا انکار اور اسکی نفی کرنے کی نوعیت کا حادثہ تھا؟ ۱۰

پہلے مفروضہ (بیعت سے انکار) کی رو سے آپ مجبوراً کچھ اجتماعی اور اصولی اہداف رکھتے تھے۔ دوسرے مفروضہ کے مطابق (اہل کوفہ کی دعوت) آپکے قیام

---

۱۰ بلکہ ہم یہاں تین قسم کی ماہیت کو فرض کر سکتے ہیں :۔ تقوائی ماہیت، ہجومی ماہیت اور قیامی ماہیت، ایک مقدس ندا کی آواز پر لبیک کہنے کی ماہیت تعاونی ماہیت ہوتی ہے۔ عامل بیعت کے لحاظ سے امام کا عمل مخالف سمت میں تھا، دوسرے لفظوں میں منفی عکس العمل تھا۔ عاملِ دعوت کے لحاظ سے آپؑ کا عمل اثبات کی سمت میں تھا یعنی مثبت عکس العمل تھا اور امر بہ معروف کے عامل کے لحاظ سے آپؑ عمل کا آغاز کرنیوالے اور ہجوم کرنیوالے تھے۔

کا ہدف اپنی شرافت اور انسانی حیثیت کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اس مفروضہ کی بناء پر کہ آپ کا یہ عمل ایک قسم کا انقلاب اور ایسا قیام تھا جسکی ابتداء خود آپؑ نے کی تھی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس انقلاب کی بنیاد فقط اہل کوفہ کی دعوت تھی کہ اگر اہل کوفہ دعوت نہ دیتے تو آپؑ قیام نہ کرتے (اور طبیعی طور پر اہلِ کوفہ کی عقب نشینی کی خبر ملنے کے بعد کنارہ کشی اور سکوت اختیار کر لیتے) یا اس قیام و انقلاب کی بناء اہل کوفہ کی دعوت کے علاوہ کچھ اور بھی تھی۔ اگر بالفرض اہل کوفہ نے دعوت نہ دی ہوتی، آیا تب بھی آپؑ اعتراض اور مخالفت کرتے یہاں تک کہ اس راہ میں جان دے دیتے؟

کربلا کے اس حادثہ میں گوناگوں عوامل دخل رکھتے ہیں۔[۱۰] یعنی امامؑ کے

---

[۱۰] جیسا کہ تہران کی دانشکدۂ ادبیات میں اور اہواز کی دانشگاہ میں محرم ۱۳۹۲ میں "قیام عاشورا کی تحلیل" کے موضوع پر تقاریر میں کہا تھا کہ طبیعی اور مادی حوادث کی طرح اجتماعی حوادث کی شناخت کیلئے بھی اُن اولین عناصر کا تجزیہ و تحلیل ضروری ہے جو اس حادثہ کی صورتگری کرتے ہوں اور اس کو وجود میں لانے کا سبب بنتے ہوں۔ ایک مادّی چیز کا لیبارٹری میں ایک مرتبہ تجزیہ و تحلیل کیا جاتا ہے اور دوسری دفعہ اس کا مرکب معلوم کیا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی وقائع کا فقط منطق کی قدرت سے اور منطق کی لیبارٹری ہی میں تجزیہ و تحلیل کیا جاسکتا ہے۔ عاشورا جیسے حادثہ کی تحلیل اس طرح سے ہے کہ اس میں تین قسم کے عناصر کی شناخت ہوتی ہے: پہلا وہ اجتماعی محرکات ہیں جو اس نہضت و قیام کا سبب بنے۔ اس عنصر کے لحاظ سے ہمیں اسوقت کے معاشرہ و ماحول کے اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی پہلو کو سمجھنا چاہئے اور اس ماحول میں انسان کی زندگی پر گزرنے والے واقعات کو جاننا چاہئے۔ دوسرا عنصر وہ عکس العمل ہے جو اس نہضت کے قہرمان یعنی حضرت امام حسینؑ نے حادثۂ عاشورا میں ان تمام عوامل کے مقابلہ میں انجام دیا۔ البتہ یہ جہت خود شخصیت امامؑ سے زیادہ وابستہ ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص امام کی جگہ پر ہوتا تو ممکن تھا کوئی اور کام کر بیٹھتا۔ اس مرحلہ پر ہمیں چاہئے کہ اس حادثہ میں امام کے اہداف کو سمجھیں جن کا تعلق آپ کی معنوی شخصیت سے ہے۔ تیسرا عنصر اس عکس العمل میں امام کی روش اور دستور ہے اس واقعہ میں امامؑ کے مشخص اہداف کو سمجھنے کے بعد ہمیں روشِ امام کو سمجھنا چاہئے۔ روشِ امامؑ کے معنی یہ ہیں کہ مثلاً بیعت سے انکار کرنے میں امامؑ کی روش کیا تھی اور کس حد تک آپؑ مقاومت کرنا چاہتے تھے؟ فرض کریں اگر امامؑ تسلیم ہو جاتے تو کس حد تک تسلیم ہوتے؟ یا اصلاً تسلیم ہی نہ ہوتے، جیسا کہ خود امامؑ کے فرمودات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اہل کوفہ کی دعوت کو قبول کرنے اور حکومت ہاتھ میں لینے کے بارے میں آپکی کیا روش تھی اور یہ کس حد تک تھی؟ آیا بیعت سے انکار کی طرح اس مسئلہ میں بھی آپ اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے تک حاضر تھے یا کوفہ کے حالات دگرگون ہونے کے بعد اس ہدف سے ہاتھ اٹھا لیتے؟ البتہ یہاں دوسری بات صحیح ہے۔ تیسرے عامل میں جو کہ حتیٰ پہلے

قیام کے متعدد محرکات تھے۔ اس قیام کی ماہیت کی توضیح و تشریح کرنے میں دشواری پیدا ہونے کا ایک سبب یہی ہے کہ جو چیز امامؑ سے ظاہر ہوئی ہے وہ کبھی ایک خاص عامل سے مربوط ہوتی تھی اور کبھی دوسرے عامل سے مربوط ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اظہار نظر کرنے والے حیران و پریشان اور گنگ ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف ضد و نقیض میں اظہار خیال کرتے ہیں تو دوسری طرف اس قیام کے مختلف قسم کے زاویئے بناتے ہیں۔ در حقیقت اِس قیام کا ہر زاویہ ایک خاص ماہیت کا حامل ہے (اجتماعی امور میں اس بات میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی کہ ایک چیز چند ماہتیں رکھتی ہو جیسا کہ خصوصاً فلسفہ تاریخ کے دروس میں ہم نے ثابت کیا تھا)۔

وہ عوامل جو اس قیام میں در پیش رہے ہیں اور وہ جن کے عمل دخل کا امکان ہے یا دخالت رکھتے تھے مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ امامؑ ہی تنہا وہ شخصیت تھے جو منصوص من اللہ بھی تھے، لائق خلافت بھی اور وارث خلافت بھی، نیز امامت کے لئے معنوی مقام رکھتے تھے، اس جہت سے امام حسینؑ اور آپ کے والد بزرگوار اور برادر گرامی میں کوئی فرق نہیں تھا، جیسا کہ یزید و معاویہ اور خلفائے ثلاثہ کی حکومتوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فقط خلافت کے لائق و وارث ہونا اور امامت کا معنوی مقام رکھنا امامؑ کو اس سلسلے میں اقدام کرنے کا ذمہ دار نہیں بنا دیتا۔ اگر لوگ یہ تشخیص کر لیں کہ

عامل (بیعت سے انکار) سے بھی شدید تر ہے، آپؑ کی روش شہید ہونے سے بھی آگے تھی اور انقلاب کو وسعت دینے اور خونریزی کی حد تک تھی۔ یہاں پر آپؑ کی منطق شہید کی منطق تھی اور ایک انقلابی انسان کی منطق تھی۔ بیعت سے انکار میں آپ کی منطق ایک صاحب شرف انسان کی منطق تھی، اس سے زیادہ نہیں۔ عاملِ دعوتِ اہلِ کوفہ کے مقابل آپؑ کی منطق ایک صالح اور منجھے ہوئے سیاستمدار کی منطق تھی اور تیسرے عامل کے مقابل میں آپؑ کی منطق ایک شہید کی منطق تھی۔

امام ہی سب سے زیادہ صالح ہیں اوراس کے بعد اُن کی بیعت کرلیں تو درحقیقت اِس بیعت کے ذریعہ وہ امام کی زمام داری کو قبول کرتے اور اپنی صلاحیّت اور آمادگی کا اعلان کرتے ہیں' اور پھر امام بھی اسے قبول کرلیتے ہیں۔ لیکن جب صورتحال یہ ہو کہ ایک طرف لوگ آمادہ نہ ہوں اور دوسری طرف احوال واوضاع مسلمین مصلحت کے مطابق ہوں تو ان دو عاملوں کی موجودگی میں امامؑ کا وظیفہ مخالفت کرنا نہیں ہے بلکہ ہمکاری کرنا اور ساتھ دینا ہے۔ چنانچہ امیر المومنینؑ نے ایسا ہی کیا۔ آپؑ خلفاء کے ساتھ سیاسی اور قضاوتی مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور نماز جماعت میں حاضر ہوتے تھے۔ خود آپؑ نے فرمایا:

''لقد علِمتم انی احق الناس بها من غیری و والله لأُسلمن ماسلمت امور المسلمین ولم یکن فیها جور الا علیّ خاصة''

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خلافت کے لائق ہوں اور خدا کی قسم میں اس وقت تک باہم صلح وآشتی کی راہ پر چلوں گا جب تک مسلمانوں کے امور ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے''۔ (نہج البلاغہ' خطبہ ۷۴)

واقعہ کربلا میں صرف اس ایک عامل کا دخل نہیں تھا۔ اس عامل کو تیسرے عامل' یعنی اہل کوفہ کی دعوت کے ساتھ ملا کر دیکھنا چاہئے کیونکہ اہلِ کوفہ کی دعوت کی غرض صرف حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہ تھی۔ پس یہ عامل کوئی الگ اور جداگانہ عامل نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا اسی عامل سوّم کے ضمن میں ذکر ہونا چاہئے۔

(ب) یزید امامؑ سے بیعت لینا چاہتا تھا اور اس کام میں ذراسی بھی چھوٹ نہیں تھی۔

یزید نے لکھا: "خُذالحسین بالبیعة اخذاً شدیداً لیس فیه رخصة". "حسینؑ سے سختی کے ساتھ بیعت لو اور اس کام میں کسی قسم کی چھوٹ نہیں ہو گی"۔

بیعت سے مراد دستخط کرنا، قبول کرنا اور تائید کرنا تھا۔ ۱۰

(ج) امامؑ کے بیعت سے امتناع کے بعد اہل کوفہ نے آپ کو دعوت اور دی خلافت اور زعامت کے حصول میں آپ کی کمک کے لئے اپنی تیاری اور آمادگی کا اعلان کیا۔ مسلسل خطوط آئے۔ امامؑ کے قاصد نے بھی لوگوں کی آمادگی کی تائید کی۔

(د) اسلام میں ایک اصول امر بہ معروف و نہی از منکر کے نام سے ہے۔ خصوصاً ان مواقع پر کہ جہاں عمل جزئی مسائل کے حدود سے تجاوز کر گیا ہو، جہاں حرام حلال ہو جائے اور حلال حرام، بدعتیں پیدا ہو جائیں، عام لوگوں کے حقوق پامال ہو جائیں، ظلم زیادہ ہو، وہاں اس اصول پر عمل ہر فردِ مسلمان پر واجب ہے۔ امامؑ نے بار بار اس اصول کی طرف استناد کیا ہے۔ ایک جگہ پر فرمایا:

"انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً وانمّا خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدّی، ارید ان آمر بالمعروف و انهی عن المنکر واسیر بسیرة جدی وابی".

"میں شر پیدا کرنے، دہشت پھیلانے، فساد پھیلانے اور ظلم کرنے کے لئے نہیں نکل رہا ہوں بلکہ میں صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے نکل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو نیک کام کرنے کا حکم دوں اور برائیوں

۱۰۔ امام حسینؑ کو جس بیعت کے کرنے کا مکلف بنایا جاتا تھا وہ ولایت عہد کو صائب گردانتا تھا۔ یہ بیعت امام علیؑ اور دیگر ائمہ کی اُس بیعت سے کہ جو مخلوط اکثریت کی وجہ سے اکثریت کے احترام کی خاطر ہوتی تھی، فرق رکھتی تھی۔

سے منع کروں ۱۵ اور اپنے نانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے پدر بزرگوار حضرت علیؑ کی سیرت پر چلوں"۔

دوسری جگہ پر فرماتے ہیں : "سمعت جدّی رسول الله:من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحُرم الله ......" "میں نے اپنے جد بزرگوار رسولؐ اللہ سے سنا ہے :جو بھی کسی ایسے حاکم کو دیکھے کہ وہ حرام خدا کو حلال کر رہا ہو......"۔

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں :"الا ترون ان الحق لا یعمل به وان الباطل لا یتناهیٰ عنه لیرغب المومن فی لقاء الله محقاً ' انی لا اری الموت الاّ سعادة والحیاة مع الظالمین الا برماً"۔ "کیا تم لوگ نہیں دیکھتے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے 'اس

---

۱۵ ہم بعد میں وہ منکرات جو نہی از منکر اور قیام کا سبب بنے 'ان کی شرح بیان کریں گے لیکن یہاں اس جملہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں : واسیرُ بسیرة جدّی وابی ۔اس بات کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ ان ایام میں سیرتِ شیخین کے نام سے کچھ چیزیں مطروح تھیں اور وہ حضرت علیؑ اور آپؑ کے خاندان کو قبول نہ تھیں۔اس کے علاوہ کچھ انحرافات بھی تھے جو شیخین کے زمانہ سے شروع ہوئے تھے جیسا کہ بیت المال کو غیر عادلانہ طریقہ پر تقسیم کرنا 'نماز کی بہ عنوان خیر العمل تحقیر کرنا اور مطلق اجتہادیں (اصطلاحاً)۔ حضرت عمرؓ کی روشنفکری سے دو انحرافی واقعات وجود میں آئے تھے ایک عمری 'دوسرا عبداللہ عمری۔

عمری انحراف 'عبادت کو منہا کر کے جہاد کو اقبال و عزت دینا تھا یعنی عمل کے ظاہری اور آنکھوں سے نظر آنے والے پلڑے کو اہمیت دینا اور معنوی پلڑے کو سبک کرنا۔ عبداللہ عمر کا انحراف اس کے برعکس تھا 'یعنی عبادات کو بہت سنگین اور روزنی دکھانا اور دنیا کے سخت کاموں اور جہادی کاموں کو حقیر جاننا تھا۔ان دونوں کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ جہاد 'جہاد رہ گیا تھا اور نہ نماز 'نماز رہ گئی تھی۔اسی لئے امام حسینؑ نے شب عاشور افرمایا تھا : "لهم دویُّ کدویّ النحل......"۔"ان سے ایک ایسی صدا بلند ہوتی ہے جیسے کہ شہد کی مکھیوں کا زمزمہ......"

اور روز عاشور افرمایا :"ذکرتَ الصلاة جعلك الله من المصلین"۔"تم نے مجھے نماز کی یاد دلائی 'خدا تمہیں نمازیوں میں قرار دے"۔

صورتحال میں مومنین کے لئے سزاوار ہے کہ وہ مرنے کی تمنا کریں۔ میں موت کو سعادت کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا ہوں اور ظالمین کے ساتھ زندہ رہنے کو خواری گردانتا ہوں"۔

عاملِ بیعت

امام عالی مقامؑ شہید ہونے کے لئے آمادہ تھے لیکن کسی بھی قیمت پر بیعت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لحاظ سے امامؑ کا وظیفہ فقط امتناع تھا' انکار تھا۔ امامؑ یہ وظیفہ ملک سے باہر خروج کر کے' یا پہاڑوں میں پناہ لیکر (جیسا کہ ابن عباس نے مشورہ دیا تھا)' یا مخفی رہ کر بھی انجام دے سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر اس زاویہ سے امامؑ کی روش فقط یزید کے آگے نہ جھکنا ہونا چاہئے تھی' خواہ وہ زمین میں چھپ کر اور سرحد سے خروج کر کے ہو یا شہید ہو کر ہو۔

امامؑ کی عاملِ بیعت کے مقابل میں روش نہ تو حکومت کو ہاتھ میں لینے کے امکان تک محدود ہے اور نہ اسے شہادت تک محدود ہونا چاہئے (یعنی اس کیلئے کوئی حدّ و مرز متعین نہیں)۔ اس عامل کے مقابل امامؑ کیلئے کوئی بھی مثبت وظیفہ مثلاً انقلاب کو وسعت دینا یا دعوت وغیرہ کیلئے چادر بچھانا واجب نہیں بلکہ اس موقعہ پر تو مسلمانوں کو خونریزی کرنے سے روکنا لازم تھا۔ اس لحاظ سے امامؑ کو فقط کہنا چاہئے تھا: "نہیں"۔

امام حسینؑ اگر بیعت کر لیتے تو اس بیعت کو قطعی طور پر جدّی اور از روئے قبولیت تصور کیا جاتا اور واقعی طور پر یزید کی خلافت کو صحیح ماننا تصور ہوتا۔ ہمارے پاس ایسے قرائن و شواہد موجود ہیں کہ امامؑ کسی بھی صورت میں بیعت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

آقائے صالحی کتاب "مقتل خوارزمی" سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے محمد ابن

حنفیہ سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا: "**لولم یکن فی الدنیا ملجا ولا مأوی لما بایعتُ یزید بن معاویه**". "اگر دنیا میں میرے لئے کوئی بھی پناہگاہ نہ ہو تب بھی میں یزید بن معاویہ کی بیعت نہیں کروں گا"۔

امر بہ معروف و نہی از منکر کا موضوع

یہاں پر ہمیں معاویہ کے زمانہ کی سیاست اور یزید کی خلافت کے اثر سے جو خاص حالات پیدا ہوئے تھے، ان کو نظر میں رکھنا چاہئے:

(الف) خلافت کو موروثی بنانے کا موضوع ابو سفیان کی دیرینہ آرزوں کو جامۂ عمل پہنانا تھا۔ ابو سفیان نے کہا تھا: "**تلقفوها تلقف الکرة ولتصیرن الی اولادکم وراثةً اما والذی یحلف به ابو سفیان لاجنه و لانار ......**".
"خلافت کو گیند کی طرح ایک دوسرے کو پاس دیتے رہو اور اس کو اپنی اولاد کے لئے اِرث میں چھوڑ دو۔ ہاں قسم اس کی جس کی ابو سفیان قسم کھا رہا ہے نہ کوئی جنت ہے اور نہ ہی کوئی دوزخ......"۔

خود معاویہ کے دور میں بھی امامؑ امر خلافت اور معاویہ کے دوسرے کاموں پر معترض تھے۔ حتیٰ کہ ایک خط کے ذریعہ معاویہ کو لکھا: "میں خدا سے ڈرتا ہوں اس بات پر کہ میں تمہارے خلاف قیام نہیں کر رہا ہوں اور میں اس سلسلے میں خدا کے حضور جوابدہ ہوؤں"۔ امامؑ نے معاویہ کے دور میں کچھ ایسے اقدامات کئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ شورش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ [۱۰]

یہاں پر ایک مطلب ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے

۱۰۔ ہم نے نہضت حسینی کی یادداشت کے نمبر ۶ میں آقای صالحی کی کتاب اور "رجال کشی" اور ابن قتیبہ کی کتاب "الامامة والسیاسة" سے نقل کیا تھا کہ امامؑ نے معاویہ کو لکھا: "لاارید لك حرباً ولا علیك خلافاً"۔ "میں تم سے جنگ کرنا یا تمہاری مخالفت کرنا نہیں چاہتا"۔ امامؑ کا یہ فرمان اسی وقت کے لئے تھا اور قطعی امامؑ طور پر معاویہ کے دور میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

قیام بلکہ تمام امر بہ معروف اور نہی از منکر کوئی تعبدی وظیفہ نہیں کہ ہم جہاں کہیں بھی کوئی منکر کو دیکھ لیں، اس کو نہی کریں اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہم اس کام کے نتیجہ اور اثر کو نظر انداز کر بیٹھیں، بلکہ یہاں اثر ہونے کا احتمال یا نتیجہ پر اطمینان ہونا لازم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام ایسی نوعیت کے کاموں میں سے ہے کہ مکلّف کو نتیجہ کی طرف توجہ رکھنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں کیا تو بے جہت طاقت صرف کی اور اپنے کام کو رائیگان کر دیا۔ (امامؑ کا اپنے اس کام کے نتیجہ کے بارے میں اعتقاد کا جو مسئلہ ہے، یہ تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عاملِ امر بہ معروف اور نہی از منکر کی رو سے امامؑ کی منطق انقلابی منطق اور شہید کی منطق تھی اور اس مسئلہ میں آپؑ خونریزی کو وسعت دینے اور انقلاب کو پھیلانے کے طرفدار تھے۔ آپؑ ایک مراد اور پیام رکھتے تھے اور اس پیام کو آپؑ فقط خون سے رقم کر دینا چاہتے تھے تاکہ وہ کبھی بھی مٹ نہ سکے)۔ آیا امامؑ اپنے کام کے نتیجہ کے بارے میں اور اس کے رائیگان نہ جانے کے معتقد تھے یا نہیں؟ جی ہاں! معتقد تھے۔ اس کے چند دلائل ہیں :

(۱) ایک شخص کے جواب میں (جیسا کہ ریاشی نقل کرتے ہیں) آپؑ نے فرمایا :

"ان هٰولاءِ اخافونی و هٰذهِ کتب اهل الکوفة وهم قاتلی ' فاذافعلوا ذلك و لم یدعوا لله محرّماً الا انتهکوه بعث الله الیهم من یقتلهم حتی یکونوا اذل من فرام المراة". "ان لوگوں نے مجھے وحشت زدہ کیا ہے اور یہ کوفہ والوں کے دعوت نامے ہیں جواب میرے قتل پر کمربستہ ہیں۔ جب یہ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرلیں گے تو پھر کسی بھی حرمت کی ہتک سے باز نہ آئیں گے اور اس وقت خدا ایسے کو ان پر مسلط کر دے گا جو

ان سب کو قتل کردے گا' یہاں تک کہ یہ لوگ عورتوں کے حیض کے اس کپڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہونگے"۔ (کامل ابن اثیر جلد ۳)

(۲) روز عاشورا لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ثم ایم الله لا تلبثون بعدها الا کریثما یرکب الفرس حتی تدروبکم دور الرحی وتقلق بکم فلق المحور". "خدا کی قسم! پھر اس کے بعد تم اتنی ہی دیر رہ سکو گے جتنی دیر گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتی ہے' یہاں تک کہ چکی اپنے محور میں گردش دے کر تمہیں پیس ڈالے گی"۔ (لہوف ص ۴۲)

(۳) روز عاشورا اپنے اہل بیتؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "استعدّوا للبلاء و اعلموا ان الله حافظکم ومنجیکم من شرّالاعداءِ ویعذب اعادیکم بانواع البلاء". "آزمائش کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور جان لو کہ خدا ہی تمہاری حفاظت کرے گا اور تم کو دشمنوں کے شر سے رہائی بخشے گا اور تمہارے دشمنوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔"

(۴) عمر سعد سے فرمایا: "خدا کی قسم رے کی حکومت تجھے نصیب نہیں ہوگی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کوفہ کے بچے تیرے سر پر اس طرح سے پتھر برسائیں گے جس طرح پھلوں کے درخت پر پتھر مارتے ہیں"۔

اہل کوفہ کی دعوت کا موضوع

یہ دعوت کس لئے تھی؟ قطعی طور پر زمام حکومت پر قبضہ کرنے' صاحب قدرت ہونے اور کوفہ کو مرکز بنانے کی خاطر تھی۔ کوفہ دنیائے اسلام کی فوجی چھاؤنی تھا۔ کوفہ کے اشراف اور بڑے بڑے لوگوں نے جو خطوط لکھے تھے' وہ بہت زیادہ محکم اور اصولی تھے۔ ان خطوط کو ہم نے نہضت حسینی کی یادداشت کے نمبر ۱۶ میں نقل کیا ہے: "امابعد فالحمدلله الذی قصم عدوك الجبار العنید

الذی انتزی علی هذه الامة فابتزّها امرها' وغصبها فیئَها 'وتامّرعلیها بغیر رضاًمنها'ثم قتل خیارها' واستبقیٰ شرارها' وجعل مال الله دولة بین جبابرتهاو اغنیائها' فبعداً له کما بعدت ثمود. انه لیس علینا امام فاقبل لعل الله یجمعنا بك علی الحق" . "امابعد! حمدوستائش اس خدا کے لئے جس نے آپ کے جبار اور سرکش دشمن کی کمر توڑ دی۔ وہی دشمن جس نے امت کے معاملات کو درہم برہم کر دیا اور امت کی حکومت کی مہار بزور اُچک لی اور امت کی دارائی کو غصب کر لیا اور ان کی رضامندی کے بغیر ان پر فرمانروائی کی۔ اس کے بعد امت کے نیک لوگوں کو قتل کر دیا اور بُروں کو باقی رکھا اور خدا کے خزانے کو مال داروں اور طاغی افرد کے ہاتھوں میں دے دیا۔ قوم ثمود کی طرح خدا ان کو بھی اپنی رحمت سے دور رکھے۔ سچ ہے کہ اب ہمارا کوئی رہبر نہیں' ہماری طرف جلد تشریف لائیں۔ امید ہے کہ خدا ہم کو آپؑ کے ذریعے حق کے گرد جمع ہونے کی توفیق عنایت کرے گا"۔

حضرت امام حسینؑ نے بھی حضرت مسلمؓ کو ان کے لئے اپنا سفیر متعین کرنے کے ضمن میں لکھا: "انی بعثتُ الیکم اخی وابن عمّی وثقتی فی اهل بیتی ......ولعمری ماالامام الا العامل بالکتاب ' القائم بالقسط الدائن بدین الله". "میں اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے اور اپنے خاندان میں سے اپنے مورد اطمینان شخص کو تمہاری طرف بھیج رہا ہوں...... میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رہبری اور امامت کے لئے کوئی سزاوار نہیں مگر وہ شخص جو خدا کی کتاب پر عمل کرتا ہو' قسط وعدل قائم کرتا ہو اور دین خدا کا حاکم اور عامل ہو"۔

(ارشاد مفید۔ ص ۲۱۴' تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ)

امامؑ کے اس خط سے حاکم اور حکومت کے بارے میں آپؑ کی رائے اور فکر

معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ امام رہبری اور قیادت کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہ بھی کہ یزید کو سب سے بڑا منکر سمجھتے ہیں اور جس مقام و منصب پر وہ بیٹھا ہے اسے بھی منکرات میں سے گردانتے ہیں۔

اس لحاظ سے امام حسینؑ کی وضع عین آپ کے پدر بزرگوار حضرت علیؑ جیسی تھی۔ امام علیؑ حضرت عثمانؓ کے قتل ہونے کے بعد آپؑ کی بیعت کے لئے آئے ہوئے لوگوں کے اجتماع کو اپنے اوپر اتمام حجت سمجھتے تھے' اس کے باوجود کہ آپؑ ان سے بیعت لینے کے حق میں نہیں تھے' کیونکہ آئندہ وقت کو مبہم سمجھتے تھے۔ اسلئے فرمایا: "فانا مستقبلون امراً له وجوهٌ و الوان......"۔ "ہمارے سامنے وہ معاملہ ہے جس کے بہت سے رنگ وروپ ہیں......"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۹۰)

اور یہ بھی فرمایا: "لولا حضور الحاضروقیام الحجة بوجود الناصر لاَلقیت حبلها علی غاربها ولسقیت آخرها بکأس اولها"۔ "اگر حاضرین کی موجودگی اور انصار کے وجود سے حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی تو میں آج بھی اس خلافت کی رسی کو اُس اونٹ کے کوہان پر ڈال کر ہنکا دیتا اور خلافت کے آخر کو اول ہی کے کاسہ سے سیراب کرتا"۔ (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳)

اتمام حجت کے یہ معنیٰ نہیں کہ عالمِ سِرّ و خفیات کی حجت لوگوں پر تمام ہو جائے۔ "لیهلك من هلك عن بینة ویحیی من حیّ عن بینة"۔ "جسے ہلاک (گمراہ) ہونا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ (ہدایت) رہنا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے" (سورۂ انفال آیت ۴۲)۔ بلکہ اتمام حجت سے مراد حاضر اور آئندہ آنے والے لوگوں پر امامؑ کا حجت تمام کرنا ہوتا ہے۔ اگر امامؑ قطعی طور پر اس دعوت کو قبول نہ کرتے تو اس زمانہ اور آئندہ زمانوں کے لوگ امامؑ کے اس عمل کو ایک بہت زیادہ مناسب موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھنا گردانتے۔

حادثۂ حسینی میں کوفہ کا قیام امامؑ کے خلاف ایک تاریخی حجت شمار ہوتا ہے اور امامؑ پر لازم تھا کہ لوگوں پر تاریخ کے مقابل میں اپنی حجت تمام کردیتے۔

یہاں پر چند قابل ذکر مطالب ہیں :

(الف) امامؑ کی مکہ سے کوفہ کی طرف حرکت صرف دعوت اہل کوفہ کی وجہ سے نہیں تھی' امامؑ کسی بھی صورت میں مکہ میں نہیں رہ سکتے تھے اور اس کے لئے ہمارے پاس چند قرائن موجود ہیں :

اول : امامؑ نے اعمال حج کو ناتمام چھوڑا۔ ہم جانتے ہیں کہ حج تمتع میں اعمال شروع کرنے کے بعد اتمام واجب ہوتا ہے۔ اور فقط بہت زیادہ ضروری اور اہم کام مثلاً قتل ہو جانے کا خوف وغیرہ ہو' تب ہی تسلسل نہ دینے کا جواز بنتا ہے۔ ہم یہاں یہ فرض کرتے ہیں کہ امامؑ کا ابتداء سے ہی عمرۂ تمتع بجا لانے کا قصد نہیں تھا اور اول ہی سے عمرۂ مفردہ کا قصد رکھتے تھے' اسلئے کہ امامؑ ان ایام میں قطعی طور پر مُحرِم تھے اور احرام سے مُحل ہوئے تھے۔

دوم : امام حسینؑ نے مکہ سے نکلتے وقت اپنے اس عمل کو حضرت موسیٰؑ بن عمران کے مصر سے نکل کر مشرق کی طرف صحرائے سینا کو طے کر کے فلسطین کی طرف آنے کے عمل سے تشبیہ دی۔ امامؑ اسوقت اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے : "**فخرج منها خائفاً يترقب قال رب نجني من القوم الظالمين . ولما توجه تلقاء مدين قال عسى ربي ان يهديني سواء السبيل**"۔ "پس موسیٰؑ شہر سے باہر نکلے' خوفزدہ اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اور کہا کہ پروردگار مجھے ظالم قوم سے محفوظ رکھنا اور جب موسیٰؑ نے مدین کا رخ کیا تو کہا کہ عنقریب پروردگار مجھے سیدھے راستہ کی ہدایت کردے گا"۔ (سورۂ قصص آیت ۲۱'۲۲)

حضرت موسیٰؑ کی یہ روانگی آپ کو یہ اطلاع ملنے کے بعد تھی کہ "ان الملأ یاتمرون بك لیقتلوك فاخرج انی لك من الناصحین"۔ "موسیٰؑ، شہر کے بڑے لوگوں نے باہمی مشورہ کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں قتل کر دیں، لہٰذا تم شہر سے باہر نکل جاؤ میں تمہارے لئے نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں"۔ (سورۂ قصص آیت ۲۰)

سوم : خود امامؑ نے ابوہرۃ ازدی کے جواب میں فرمایا :

"ان بنی امیه قداخذوا مالی فصبرتُ، وشتموا عرضی فصبرت، وطلبوا دمی فهربتُ"۔

"بنو امیہ نے میرا مال غصب کیا میں نے صبر کیا، میری عزت و آبرو پر حملہ کیا، میں نے صبر کیا۔ اب وہ میرا خون بہانا چاہتے ہیں اس لئے میں نکل پڑا ہوں"۔ (لہوف ص ۲۹)

فرزدق کے جواب میں آپؑ نے فرمایا: "لولم اعجل لَأخذتُ"۔ "اگر میں جلدی نہ کرتا تو پکڑ لیا جاتا"۔

شیخ مفیدؒ کہتے ہیں : "ولم یتمکّن من تمام الحج مخافة ان یقبض علیه بمکة فینفذ به الی یزید بن معاویه"۔ "وہ اپنے حج کو تمام نہیں کر سکے کہ کہیں مکہ میں آپ کو گرفتار کر کے یزید بن معاویہ کے پاس نہ بھیج دیا جائے"۔

(ارشاد مفیدؒ ص ۲۱۸)

کتاب "سرمایۂ سخن" میں ہے : "عمر بن سعید بن العاص کچھ اور لوگوں کے ساتھ اس کام پر مأمور ہو چکا تھا کہ امامؑ کو شہید کرے"۔ طریحی نے لکھا ہے کہ بنو امیہ کے ۳۰ شیاطین اس کام پر مأمور ہوئے تھے۔ "نہضت حسینی کی یادداشت" کے نمبر ۱۰ میں ہم نے مقتل خوارزمی سے نقل کیا ہے کہ امامؑ

ایک درد بھرے خط میں ابن عباس کو لکھتے ہیں :

"مجھے مکہ میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے اور حرمِ الٰہی کے جوار سے خروج پر مجبور کرتے ہیں"۔

ابن عباس نے بھی یزید کو ایک خط میں سخت ملامت اور مذمت کی۔ اس میں لکھا: "تم نے حسینؑ کو مجبور کر کے حرم الٰہی سے خارج کیا"۔

(ب) ان عوامل کی ارزش کس قدر تھی؟ ان میں کونسا عامل امامؑ کی نظر میں اصل ہدف و مقصد تھا؟ پہلے دو عواملِ قطعی طور پر ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں۔ یعنی اگر بالفرض امامؑ سے بیعت کا تقاضا نہ ہوتا، تب بھی آپ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے عنوان سے معترض ہوتے اور بالفرض اگر اس عنوان سے اعتراض نہ بھی کرتے، تب بھی بیعت تو نہ کرتے۔ اسی لئے ہمارا موضوعِ بحث و گفتگو تیسرا سبب اور علت ہے کہ اس کی کیا ارزش ہے اور ہمیں اس کے اصل ہونے یا فرع ہونے سے بحث ہے۔

یہاں پر ممکن ہے کوئی یہ گمان کرے کہ اس واقعہ میں اصل سبب یہ تھا کہ امامؑ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور دوسرے دو اسباب یعنی بیعت کرنے سے انکار اور امر بہ معروف اور نہی از منکر کے عنوان سے معترض ہونا اس کام کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ظاہری بات ہے کہ جو شخص اوضاع واحوال کو اپنے فائدہ میں دیکھتا ہے اور حکومت کرنے کا قصد رکھتا ہے، اسے بھی بیعت نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اگر بیعت کرلے تو اپنے مقصد ہی کو خراب کرلے گا۔ لیکن حکومت کے خلاف تبلیغ کیلئے ایک جمیعت کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ یہ ان پر انتقاد واعتراض کرے اور ایک دستور کے تحت اسلامی اصول امر بہ معروف و نہی از منکر کو اپنا منشور قرار دے۔ اگر بیعت کرنے سے انکار اور امر بہ معروف کے

عنوان سے اعتراض کو کوفہ جانے کے لئے مقدمہ سمجھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جیسے ہی متوجہ ہوں کہ اوضاع واحوال اپنے حق میں نہیں ہیں تو اپنے وضع کو ان دو اسباب کے لحاظ سے بدل دیں یعنی بیعت کرنے کے لئے بھی حاضر ہو جائیں اور اعتراض وانتقاد کرنے سے بھی دست بردار ہو جائیں۔

آقائے صالحی کی کتاب سے بہر حال یہی مطالب نکلتے ہیں کہ امامؑ کا اصلی ہدف کوفہ کی حکومت تھی، لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ آقائے صالحی کا سب سے بڑا اشتباہ یہی ہے۔ امامؑ بیعت کرنے اور تسلیم ہونے کے لئے قطعاً راضی نہیں ہوئے۔ خود امام حسینؑ فرما چکے تھے کہ میں کسی بھی صورت میں بیعت نہیں کروں گا: "ولو لم یکن ملجا ولا مأوی"۔ "اگرچہ میرے لئے کوئی بھی پناہ گاہ نہ ہو" یعنی چاہے کوفہ والے مجھے قبول کریں یا نہ کریں، میں بیعت نہیں کروں گا۔ چنانچہ ہمیں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوفہ والوں کیطرف سے یاوری میں مایوسی کے باوجود آپؑ نے ان پر انتقاد کرنے سے گریز نہیں کیا بلکہ حُر سے آمنا سامنا ہونے اور کوفہ کے احوال سے باخبر ہونے کے بعد تو آپ نے اور بھی سخت لہجے میں ایراد فرمایا۔ حضرت مسلم یا قیس بن مسھّر یا عبداللہ یقطر کی شہادت کی خبر ملنے کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"من المومنین رجال صدقوا ماعاھدو اللہ علیہ".

"مومنین میں سے ایسے بھی مرد میدان ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر کے دکھایا ہے"۔ (سورۂ احزاب آیت ۲۳)

کوفہ کے حالات کے متغیر ہونے کے بعد امامؑ کا مقاومت اور پائداری سے پیش آنا شاید اس لئے تھا کہ سمجھا دیں کہ آپکا بیعت سے انکار کرنا اور اسی طرح اُن پر اعتراض اور انتقاد کرنا کوفہ پر حکومت کرنے کے لئے نہیں تھا۔ امامؑ کا انصراف

(واپس لوٹنے) کا اعلان کرنا فقط کوفہ جانے سے انصراف کا اعلان ہے، نہ کہ بیعت سے انکار کا انصراف اور نہ ہی اعتراض وانتقاد اور امر بہ معروف و نہی از منکر سے انصراف۔ آقائے صالحی کے عقیدہ کے برخلاف آپؑ کا بیعت نہ کرنا اور حکومت پر تنقید کرنا کوفہ کے حالات سے وابستہ نہیں تھا کہ یہ حالات اگر فراہم نہ ہوں تو بیعت کرنے کیلئے بھی حاضر ہو جائیں اور اعتراض کو بھی ترک کر دیں۔ جی ہاں! حسینؑ تنقید کے خطرے سے آگاہ تھے اور اس کے خونی اثر سے بھی واقف تھے۔ لیکن آپؑ چاہتے تھے آپکے اس جرم کے اعلان کو خون سے لکھا جائے تا کہ کبھی بھی مٹ نہ پائے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آپؑ نے کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کیا کہ کم از کم آپؑ کے فرزندان اور اصحاب قتل ہونے سے بچ جاتے۔ فرض کریں کہ امامؑ خود اپنے لئے خطرہ دیکھ رہے تھے تو اپنے اصحاب اور خاندان کو تو قطعی طور پر خطرے میں نہیں دیکھ رہے تھے، پھر کیوں آپؑ آمادہ ہوئے کہ وہ لوگ بھی قتل ہوں؟ اس کے علاوہ کیوں عبید اللہ حر جعفی کو، ضحاک بن عبد اللہ مشرقی کو، حتیٰ حر بن یزید کو ملاقات ہونے کے بعد اپنا ساتھ دینے کی دعوت دی؟ (تاریخ کی کتب میں رجوع کریں کہ یہ کام حُرؔ سے سامنا ہونے کے بعد میں ہوا ہے یا نہیں)۔ اور خصوصاً بنی اسد کو کیوں شب عاشورا ساتھ دینے اور نصرت کرنے کی دعوت دی؟

(ج) آیا امامؑ واقعی کوفہ والوں پر اعتماد کر چکے تھے اور آپ کو ان کی نیت پر حُسنِ ظن حاصل تھا یا یوں کہوں کہ آیا امامؑ نے کوفہ کے لوگوں کو اپنے اس قیام میں حساب کیا تھا یا نہیں؟

بعض لوگ مثلاً ''ابن خلدون''، ''قاضی ابن العربی'' اور کچھ دوسرے بشمول آقائے صالحی، اس نہضت کا اصلی عامل، کوفہ کی ظاہری حالت اور کوفہ والوں کی دعوت سمجھتے ہیں اور غالباً یہ فرض کرتے ہیں کہ امامؑ نے کوفہ والوں پر اعتماد کر لیا

تھااور پھراس کے بعد اس کو امامؑ کی خامی سمجھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ امامؑ کا کوفہ والوں پر حسنِ ظن صحیح موقع پر نہیں تھا۔یا جیسا کہ آقائے صالحی نے کہا ہے کہ :
امامؑ کاان پر اعتماد کرنااور ان کو اپنے اس قیام میں جگہ دینا صحیح تھالیکن حالات کابدل جانا پیش بینی کے قابل نہیں تھااور عادی حالت میں ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایسی پیش بینی کرے ،جسطرح کہ اُحد میں بھی حالات کابدل جانا پیش بینی کے قابل نہ تھااور تیر اندازوں کی خطا کی وجہ سے جبل الرماۃ کاواقعہ رونما ہوا۔

ظاہری بات ہے کہ اگر نہضت وقیام امام حسینؑ کا اصلی سبب اور علت کوفہ والوں کی دعوت ہوتی تو امامؑ کو کچھ زیادہ ہی احتیاط کی ضرورت تھی اور پھر آپ ابن عباس کی نصیحت پر عمل کرتے اور کوفہ والوں پر اعتماد نہ کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپؑ نے کوفہ والوں پر کسی قسم کا بھی اعتماد نہیں کیا۔ بہت سی جگہوں پر بہت سے افراد نے آپؑ سے عرض کیا ہے **"قلوبهم معك وسيوفهم عليك"**. "ان کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں لیکن ان کے تلواریں آپؑ کے خلاف"۔ خود امامؑ نے بھی فرمایا: "لایخفیٰ علیّ الامرُ"۔"جو کام ہونا ہے مجھ سے مخفی نہیں"۔ فرزدق کے جواب میں فرمایا:"اگر کام میری مرضی کے مطابق ہوا تو میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں"،**"وان حال القضاءُ دون الرجاء فلن يتعدد (يعتد) من كان الحق نيتهُ و التقوىٰ سريرته"**۔"اور اگر قضاوقدر الٰہی ہماری آرزوں میں حائل ہوا،البتہ جس کی نیت حق ہواور باطن تقویٰ سے آراستہ ہو،وہ حساب میں متجاوز نہیں ہوگا"۔

اس کے علاوہ راستے میں امامؑ سے کچھ ایسے جملے سنے گئے ہیں،جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اپنے اس سفر کو کوئی سلامتی والا سفر نہیں جانتے تھے۔اگر ہم آپؑ کے "خُطّ الموت علی ولد آدم......"۔"موت فرزند آدم کیلئے حتمی

ہے......"والے خطبہ کی طرف نظر کریں یا آپؑ کے اس جملہ کی طرف کہ "وانّ من هوان الدنیا ان رأس یحیی بن زکریا اهدی الی بغیّ من بغایا بنی اسرائیل"۔ "دنیا کی پستی یہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا کے مبارک سر کو بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کیلئے ہدیہ بھیجا گیا" اسی طرح آپؑ کا معروف خواب "ان الله شاء ان یراك قتیلا"، "خدا آپ کو شہید دیکھنا چاہتا ہے"۔یا: "ان لك درجةً عندالله لن تنالها الا بالشهادة"، "خداوند عالم کے نزدیک آپ کیلئے ایک درجہ ہے لیکن اس کا حصول شہادت کے بغیر ممکن نہیں"، اگر ان کلمات کی اصل قابل اعتماد ہو، تو مطلب بہت زیادہ واضح وروشن ہے۔

(د) آیا امامؑ نے ابتداء سے ہی کربلا کے قصد سے حرکت کی یا نہیں؟ اگر بالفرض کربلا کے قصد سے حرکت نہ کی، تو آیا شہید ہونے کے قصد سے اور شہید ہونے کا علم ہوتے ہوئے حرکت کی یا نہیں؟

تاریخی اعتبار سے ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ امامؑ نے کربلا کے قصد سے یا شہید ہونے کا علم رکھتے ہوئے حرکت کی بلکہ تاریخ جن واقعات کے ظواہر کو نقل کرتی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ نے کوفہ کی طرف کوفہ کے قصد سے حرکت کی اور حُر بن یزید ریاحی کا سامنا ہونے اور اس کے عراق کی سرزمین سے نکلنے کی اجازت نہ دینے اور امامؑ کے بھی حُر کی نگرانی میں کوفہ جانے کیلئے تیار نہ ہونے کے بعد آپؑ نے مغرب اور بائیں طرف کا راستہ اختیار کیا۔یوں آپؑ کربلا پہنچے اور اسکے بعد ابن زیاد کا حُر کے نام خط آنے کے بعد، اسکے تحت پر متوقف ہوئے۔ شہید ہونے کا علم رکھنے کے بارے میں تاریخ سے بجز اس سفر کے غیر قابل اطمینان ہونے کے، کچھ اور ثابت نہیں ہوتا۔

لیکن بہر حال یہ صورت دوسری صورت سے کوئی منافات نہیں رکھتی اور وہ

دوسری صورت یہ ہے کہ امامؑ ایک اور لحاظ سے یعنی معنویت اور امامت کے لحاظ سے یہ جانتے تھے کہ آخر کار کربلا میں نزول ہوگا اور وہیں شہید ہونگے۔

(ھ) امامؑ نے حر بن یزید سے سامنا ہونے کے بعد اور اسی طرح کربلا میں چند جگہوں پر واپس لوٹنے کا اعادہ فرمایا یہ واپس جانے کا اعلان کیا معنی و مفہوم رکھتا ہے ؟

ہم یہ بات پہلے بتا چکے ہیں کہ امامؑ کا واپس جانے کا اعلان کوفہ سے واپس جانے اور کوفہ میں حکومت تشکیل دینے سے انصراف کا اعلان تھا' نہ کہ بیعت سے انکار سے انصراف کا اعلان اور نہ ہی امر بہ معروف اور نہی از منکر کے اعتراضی قیام سے انصراف کا اعلان۔ لیکن آقائے صالحی کا عقیدہ اس کے بر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امامؑ نے کوفہ کے سقوط کے بعد اپنے دیگر دو اہداف سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپؑ بیعت سے انکار اور اسی طرح حکومت پر تنقید فقط اپنی حکومت کے قیام کیلئے اچھا سمجھ کر نہیں کر رہے تھے۔ آپؑ ان دونوں کے خطرات سے بھی کلی طور پر واقف تھے۔ آپؑ نے ایسا اسلئے کیا کہ آپؑ چاہتے تھے کہ اپنے پیام کو اور بیعت سے "انکار" کے جواب کو اپنے لہو سے رقم کر دیں تاکہ پھر یہ ہرگز مٹ نہ سکے۔

(و) یہ بات واضح ہے کہ کوفہ والوں کی دعوت کے سبب امامؑ کا قیام ایک ابتدائی قیام ہے' بلکہ اس لحاظ سے تو یہ قیام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے ایک اقدام ہے۔ اس انقلاب کا رخ محض حکومت کو کمزور کرنے کے لئے یا اس کی اصلاح کیلئے نہیں تھا۔ جہاں مقصد نہی از منکر ہو' وہاں ہدف اصلاح ہونا چاہئے' خواہ وہ اصلاح حکومت کو کمزور کرنے سے حاصل ہو یا اس کے سقوط کی صورت میں ہو اور خود اصلاح ہی کی صورت میں ہو۔

(ز) معلوم ہوا کہ ان تمام عوامل میں سے ہر ایک عامل امامؑ پر ایک خاص ذمہ داری عائد کرتا ہے اور یہ بھی واضح ہوا کہ ان تمام اسباب میں سے ہر سبب امامؑ کی اس نہضت کو ایک خاص قدر و قیمت بخشتا ہے۔ اگر اس قیام کو ہم فقط دعوتِ اہل کوفہ پر محمول کریں اور اسکی موفقیت کا احتمال زیادہ سے زیادہ پچاس فی صد شمار کریں تو آپؑ کی نہضت کی قدر و قیمت اسی قدر ہے کہ آپؑ نے ایک احتمال والا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور بیٹھے نہ رہے۔ ضمناً حکومت کے بارے میں امامؑ کا نظریہ اور رائے حضرت مسلم کے ذریعہ اہل کوفہ کو بھیجے گئے خط سے اور بیضہ کے مقام پر آپ نے جو خطبہ دیا' اس سے روشن ہوتا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ بیعت کے سبب سے یہ قیام وجود میں آیا' تو اس وقت تک تو کوفہ والوں نے نصرت کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔ اگر امامؑ کے اس قیام کی قدر و قیمت یہ ہے کہ ایک خونخوار اور طاقتور حکومت کی بیعت کے تقاضے کو آپؑ قبول نہیں کرتے' اس کیلئے حاضر ہیں کہ آپ کا خون بہادیا جائے لیکن آپ بیعت نہیں کریں گے' اس سبب کی بنیاد پر اگر حکومت آپؑ سے کوئی سروکار نہ رکھتی اور آپؑ سے کوئی چیز طلب نہ کرتی' تو آپؑ کو بھی ان کے کاموں سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ اور پہلے عامل کی بنیاد پر اگر کوفہ والے اپنی آمادگی کا اعلان نہ کرتے تو کیا امامؑ تمرّد نہ کرتے اور آیا ممکن تھا کہ بیعت بھی کرلیتے؟ لیکن بہر حال بیعت سے انکار کا عامل اہلِ کوفہ کی دعوت کے قبول کرنے کے عامل سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے' اسلئے کہ دعوت کے قبول کرنے کے عامل میں جان کی سلامتی کا کچھ احتمال ہے' اس کے علاوہ حکومت کے ہاتھ آنے اور دشمن کو شکست دینے کا احتمال بھی موجود ہے۔ لیکن بیعت سے انکار کے عامل میں' خاص طور پر جن ایام میں یہ شروع ہوا تھا' شہید کئے

جانے کا احتمال یقین کی حد تک قوی تھا۔ ان دونوں عوامل کے بر عکس امر بہ معروف اور نہی از منکر کا عامل وہ ہے کہ خود امامؑ بھی اس کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے اور ان موقعوں پر آپؑ نے بیعت سے انکار اور اہل کوفہ کی دعوت کے قبول کرنے کا کوئی نام ہی نہیں لیا ہے۔ ان دونوں عوامل کی بہ نسبت یہ تیسرا عامل اسلئے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے کہ اسی عامل کی بنیاد پر بہر حال امامؑ نے حکومت وقت سے ٹکر لی تھی۔ جھگڑا ایک قسم کا ہجوم ہے اور اس کا آغاز آپؑ کی طرف سے ہوا ہے' نہ لوگوں کی طرف سے اور نہ ہی حکومت کی طرف سے۔ اس عامل کے لحاظ سے امامؑ مہاجم اور معترض ہیں نہ کہ مدافع اور اس عامل کی رو سے آپؑ کا کام ابتدائی عمل ہے' نہ فقط ایک منفی عکس العمل کہ جو بیعت کے طلب کرنے پر کیا ہو اور نہ ہی فقط ایک مثبت عکس العمل جو اہلِ کوفہ کے مدد اور یاوری کرنے کے جواب میں حکومت تشکیل دینے کیلئے کیا ہو۔ اس عامل کی بنیاد پر خواہ حکومت بیعت کا تقاضا کرے یا نہ کرے' آپؑ معترض ہیں اور حکومت کی موجودہ وضع میں تغیّر کے خواہاں ہیں۔ کوفہ والے آپ کو قبول کریں اور آپؑ کی مدد کریں یا قبول نہ کریں اور مدد بھی نہ کریں' پھر بھی آپؑ معترض ہیں اور موجودہ حکومت کے تغیّر و تبدل کے خواہاں ہیں۔ چنانچہ اسی لحاظ سے یہ قیام حد سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے اور ہمارے لئے سبق ہے۔

پس یہ تینوں عوامل امامؑ کی ذمہ داری اور عکس العمل کے لحاظ سے اور اہمیت' قدر و قیمت اور قابلیت کے لحاظ سے' نیز درس اور سبق آموز ہونے کے لحاظ سے بھی آپس میں متفاوت اور مختلف ہیں۔ اور جیسا کہ اس سے قبل بھی بتا چکے ہیں کہ اس منطق کے تحت یہ انقلاب ہے اور امامؑ انقلاب کے توسعہ کے حق میں ہیں۔

نہضت حسینیؑ سے متعلق سوالات

۱۔ آیا قیام حسینی ایک انفجار تھا یا ایک جانا بوجھا اور مصمم ارادہ کے تحت اٹھایا گیا اقدام؟ دوسری صورت میں آیا یہ حکومت کے خلاف ایک ابتدائی شورش اور انقلاب تھا یا حکومت کے مقابل ایک قسم کا دفاع اور مقاومت؟ اور یہاں دوسری صورت میں آیا یہ مقاومت اس لئے تھی کہ وہ لوگ آپؑ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر یہ مقاومت ان کے بیعت کے تقاضے کے مقابل میں تھی؟ اگر یہ انقلاب ابتدائی تھا تو آیا انقلاب کی بنیاد کوفہ کے لوگوں کی دعوت تھی یا یہ کہ اگر کوفہ کے لوگ دعوت نہ بھی دیتے، تب بھی آپؑ قیام کرتے؟

۲۔ آیا امام حسینؑ جانتے تھے کہ آپؑ شہید کر دیئے جائیں گے (علم امام کے ذریعے یا قطعی قرائن کے ذریعے) یا نہیں جانتے تھے اور یقین نہیں تھا کہ شہید ہو جائیں گے؟ دوسری صورت میں اگر جان لیتے تو کسی اور طریقہ سے پیش آتے یا اسی طرح پیش آتے کہ جس طرح آپؑ پیش آئے؟ اور نتیجتاً آیا یہ جاننے کے بعد کہ شہید کر دیئے جائیں گے جو کچھ انجام دیا اس پر پشیمان ہوئے یا نہیں؟

۳۔ آیا امام حسینؑ نے کربلا کے قصد سے (اور قہراً اپنی مخصوص قربانگاہ کی قصد سے) حرکت کی یا بالفرض شہید ہونے کے قصد سے حرکت تو کی، لیکن آپؑ کا مقصد خصوصی طور پر کربلا نہیں تھا؟ اگر آپؑ کا قصد کربلا کا نہیں تھا تو پھر کہاں کا قصد رکھتے تھے؟ آیا آپؑ کا قصد عراق کا تھا کہ جو مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی اور شیعوں کا مرکز تھا کہ اس جگہ کو مرکز قرار دیں یا پھر آپؑ کسی معین جگہ کا قصد نہیں رکھتے تھے، بس فقط حجاز میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ یا شاید شام جانے کی فکر میں تھے؟ پس اگر آپؑ کا قصد کربلا کا نہ تھا تو آیا آپؑ جانتے تھے کہ

کسی بھی صورت میں اس سفر میں شہید ہونا ہے یا نہیں جانتے تھے ؟

۴۔ آیا امام حسینؑ نے صلح کی پیشنہاد کی یا نہیں ؟ دوسری صورت میں آیا مقابل کی طرف سے صلح کی پیشنہاد آئی اور آپؑ نے اس کو رد فرمایا یا پیشنہاد آئی ہی نہیں ؟ اگر ہم فرض کریں کہ آپؑ نے صلح کی پیشنہاد کی تو اس صورت میں آپؑ کے اور امام حسنؑ کے درمیان کوئی بھی فرق نہیں، فرق آپؑ کے مقابل والوں میں ہے کہ معاویہ نے صلح کو قبول کیا لیکن یزید نے قبول نہ کیا۔ اور اگر حسینؑ نے صلح کی پیشنہاد کی تو ابتداء ہی سے کیوں بیعت نہ کی ؟ آقائے (صالحی) نجف آبادی اس بات کے معتقد ہیں کہ امامؑ نے پانچ مرتبہ صلح کی پیشنہاد کی۔

۵۔ اگر امام حسینؑ نے صلح کی پیشنہاد نہیں کی اور نہ ہی دوسری طرف سے صلح کی پیشنہاد کو قبول کیا تو اس کی علت کیا تھی اور اگر ایسا تھا تو پھر امام حسنؑ نے کیوں صلح کو قبول کیا ؟

۶۔ آیا جملۂ :''ان اللہ شاء ان یراك قتیلاً''۔ ''خدا آپؑ کو شہید دیکھنا چاہتا ہے'' صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

۷۔ آخر کیوں امام حسینؑ نے تقاضائے بیعت کے مقابل اس حد تک مقاومت کی امیر المومنینؑ اور دیگر آئمہ طاہرینؑ نے تو اس تقاضے کے مقابل اس قدر مقاومت نہیں کی تھی۔ آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی بیعت اکثریت کے تسلیم ہو جانے کی بناء پر تھی، اگرچہ مخلوط اکثریت ہی سہی۔ لیکن امام حسینؑ سے جس بیعت کا تقاضا کیا جا رہا تھا، وہ ولیعہدی کی رسم کو تسلیم کرنا تھی ؟

۸۔ آیا بیعت اور صلح کے درمیان فرق ہے یا نہیں ؟ آیا یہ کہنا صحیح ہے کہ بیعت خاص شرائط کی موجودگی میں جائز نہیں ہوا کرتی کیونکہ بیعت تائید کرنے اور

دستخط کرنے کے مترادف ہے ؟ لیکن صلح اسلئے جائز ہے کہ یہ عام طور پر دو متخاصم کے درمیان واقع ہوتی ہے اور یہ کسی قسم کی تائید کا مفہوم نہیں رکھتی۔ بلکہ صلح ہوتی ہی وہیں ہے، جہاں دو اشخاص کے درمیان جھگڑا ہو پس آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام حسینؑ بیعت کیلئے راضی نہیں تھے لیکن ایک فرد متخاصم کی صورت صلح کے لئے حاضر تھے ؟

۹۔ آیا ہمارے پاس کوئی ایسے قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ امام حسینؑ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہاں تھے ؟ یا فقط بیعت سے انکار کر رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے داعی تھے ؟ ہمارے عقیدہ کے مطابق اہل کوفہ کے خطوط پر آپؑ کا عکس العمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ حکومت اور زعامت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہاں تھے۔ "حضرت مسلم" بھی اسی قسم کے کام کیلئے کوفہ آئے تھے۔
اس سوال کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا آپؑ کا مکہ جانا صرف بیعت سے انکار کی وجہ سے تھا یا اس لئے تھا کہ وہاں پر جاکر حکومت بنانے کے لیئے زیادہ فوج جمع کر سکیں اور زیادہ فعالیت پیدا کر سکیں ؟

۱۰۔ آیا امام سجادؑ نے واقعۂ "حرّہ" میں مسلم بن عقبہ کے ذریعے یزید کی بیعت کی تھی ؟

۱۱۔ ایک سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوا کہ حر اور عمر سعد کی فوج کے مدمقابل ہونے کے بعد ہمیشہ امامؑ اپنی پیشنہادوں کے ضمن میں، حجاز واپس جانے کا دلی ارادہ ظاہر کرتے ہیں ؟

۱۲۔ آیا حرؒ اور عمر سعد کے مدمقابل ہونے کے بعد امامؑ کی مدینہ واپس جانے کی پیشنہاد اپنے انقلاب کے دامن کو توسیع دینے اور پھیلانے کیلئے تھی ؟

۱۳۔ اگر امامؑ حکومت کے خلاف انقلاب اور شورش کا قصد نہیں رکھتے تھے تو پھر

بصرہ کے لوگوں کو کیوں دعوت دی اور کیوں انہیں خط لکھے؟

آیا امامؑ نے یمن، خراسان، مصر اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی خط لکھے یا نہیں؟ ممکن ہے خط لکھے ہوں لیکن مخفی رہ گئے ہوں، بصرہ والوں کے نام امامؑ کا خط "منذر بن جارود" کے ذریعہ کشف ہوا۔

۱۴۔ آقائے غفاری کتاب "بررسیٔ تاریخ عاشورا" کے مقدمہ میں یہ مسائل ذکر کرتے ہیں:

آیا حسینؑ بن علیؑ کا اقدام بیعت سے فرار کی بناء پر تھا یا اہل کوفہ کی دعوت کے جواب میں تھا یا پھر یہ قیام اور نہضت آج کل کے بقول "انقلاب تھا"؟ آیا آپؑ جانتے تھے کہ شہید ہو جائیں گے، یا نہیں جانتے تھے؟ آیا کسی منصوبہ کے تحت کام کر رہے تھے یا جب مسائل کا سامنا ہوتا، تب ان کے لئے جداگانہ عزم کرتے تھے؟ کیوں آپ کبھی اپنے ساتھیوں کو چلے جانے کو کہتے اور کبھی ساتھیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی مدد و یاوری کے لئے طلب کرتے؟ حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سننے کے بعد آپؑ نے اپنے ساتھیوں سے چلے جانے کی بات کی اور خود کو تنہا چھوڑ دینے کے بارے میں کہا جبکہ عبیداللہ بن حر جعفی، زہیر بن القین اور ضحاک بن عبداللہ مشرقی کو اپنی یاوری اور مدد کیلئے طلب کیا حتی کہ ضحاک بن عبداللہ کی پیش کش قبول کی کہ آخری وقت تک آپؑ کی یاری کریں اور بعد میں چلے جائیں۔

شب عاشورا ایک طرف آپؑ نے اپنے تمام خاندان اور ساتھیوں کو رخصت دے دی اور ان پر سے بیعت اٹھانے کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف اسی رات اپنی مدد کیلئے قبیلۂ بنو اسد کو بلانے کے لئے حبیب ابن مظاہر کو بھیجا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ فوق العادت خطرہ والا کام کر بیٹھا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے گا، پھر کیوں وہ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر جاتا ہے؟ بعض لوگ اس

اقدام کو بلا منصوبہ اور تدریجی گمان کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق امامؑ کے اقدام کا آغاز انکارِ بیعت سے ہوا اور مکہ جو امن وامان کی جگہ ہے امامؑ اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں پناہ گزین ہوئے۔ بعد میں دو باتیں مکہ سے خروج کا سبب بنیں۔ ایک کعبہ کی حرمت ختم ہونے کا خوف اور دوسرے اہل کوفہ کی دعوت۔ حضرت مسلمؓ کی شکست کی خبر جب امامؑ کو عراق کی سرحد پر پہنچتے ہی ملی تو امامؑ وہاں سے واپس جانا چاہتے تھے لیکن واپس نہیں جا سکے، کربلا میں گرفتار ہوئے اور شہید ہو گئے۔

بعض نے کہا ہے کہ امام نہیں جانتے تھے کہ شہید ہو جائیں گے، وگرنہ آپؑ ایسا اقدام نہ کرتے۔ امامؑ کو یقین نہ تھا کہ رسولؐ خدا سے اسقدر نزدیک کی قرابت ہونے کے باوجود شہید کر دیئے جائینگے۔ اس کے برعکس بعض نے کہا ہے کہ امامؑ کو یقین تھا کہ کسی بھی صورت میں آپؑ شہید کر دئے جائیں گے، للذا عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ آقائے غفاری خود کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا یہ اقدام ایک قیام ونہضت اور ایک انقلاب تھا۔ معاویہ کے دور میں کچھ ایسے عوامل وقوع پذیر ہوئے تھے جن کے سبب امامؑ پر قیام اور نہضت واجب ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ہمارے پاس بہت سے قرائن اور شواہد ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ امامؑ اسی زمانے سے اپنے قیام کے مقدمات کو فراہم کر رہے تھے۔

ہم ان مقدمات کو نہضت حسینی کی یادداشت کے نمبر ۳۸ میں بیان کریں گے۔

قیام حسینؑ سے متعلق یادداشت

۱۔ آقائے صالحی نجف آبادی اپنی کتاب ''شہید جاوید'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''حادثۂ کربلا کے موضوع میں دو قسم کے اظہارِ نظر ہوئے ہیں' ایک میں افراط کا پہلو نمایاں ہے جبکہ دوسرا تفریط کا شکار ہوا ہے۔ ایک گروہ اس خیال کا حامل ہے کہ قیام حسینی ایک خام انقلاب 'ایک بے سمجھی بوجھی شورش اور ایک ایسا اچانک انقلاب ہے جس کی عقوبت پر غور نہیں کیا گیا تھا اور جس نے تمام جامعہ کے نظم و نسق کو درہم برہم کر دیا تھا۔ حکومت عمومی نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے اس قیام کو کچلنے پر مجبور تھی اور اس نے پیغمبر اکرمؐ کے دستور کے مطابق کہ جو بھی امت اسلام کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہے اس کی سرکوبی تلوار سے کرنا چاہئے' ان کو کچل دیا۔

دوسرے گروہ کا تجزیہ افراط کا شکار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ نے کسی خاص حکم کے تحت جو خود ان کے لئے مخصوص تھا' اپنے آپؑ کو شہادت کیلئے پیش کیا اور اس قضیہ کے راز کو کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

اگر ہم بالفرض پہلے گروہ کے قول کے مطابق انقلاب حسینی کو خام اور بے سمجھی بوجھی شورش قرار دیں' تب بھی کوئی دلیل نہیں بنتی کہ ہم اس کو عمومی نظم و نسق برباد کرنے والی شورش وہنگامہ قرار دیں اور ان کے مخالفین کے اعمال کو صحیح مان لیں۔ کیونکہ جب حکومت فاسد ہو اور اہلِ حق فقط امکانات کے نہ ہونے کی وجہ سے قیام نہ کرتے ہوں' تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ قیام کرنے کی صورت میں ان کو شہید کرنا حاکم کی نظر سے جائز سمجھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ امام حسینؑ نے اسلام کے کلی دساتیر کے مطابق قیام کیا تھا۔ اس طرح کے قیام کیلئے یہ

شرط نہیں ہوتی کہ خاص ماحول فراہم ہو اور اقدام قطعی بار آور ہو تو ہی قیام کیا جائے بلکہ ایسے مواقع پر بار آور ہونے کا احتمال ہی کافی ہے۔ علاوہ بر این اگر بار آور نہ بھی ہو تو اس سے اسلام پر کوئی ضرر بھی نہیں پڑنا تھی بلکہ اس قیام نے تو جامعہ کو ثمر اور نتیجہ کی طرف ایک قدم نزدیک تر کیا ہے۔ خود امامؑ کے کلمات سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ مکہ سے خروج کے وقت فرزدق شاعر کی بات کے جواب میں امامؑ نے جو فرمایا اس سے یہ بات آشکار ہے۔ آپؑ نے فرمایا: "وان حال القضاء دون الرجاء فلن یتعد من کان الحق نیتهُ والتقویٰ سریرته"۔ "اگر قضا و قدر الٰہی ہماری آرزؤں تک پہنچنے میں حائل ہے' البتہ جس کی نیت حق ہو اور جس کا باطن تقویٰ سے آراستہ ہو' وہ متجاوز شمار نہیں ہوتا"۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ امامؑ نے شہید ہونے کا علم رکھنے کے باوجود قیام کیا۔ البتہ شہادت کے علم ہونے کا قیام کے بے ثمر اور بلا نتیجہ رہ جانے کے علم رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر قیام کا مقصد فقط حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہو تو شہید ہونے کے بعد نہضت بے ثمر رہ جاتی ہے لیکن اگر ہدف و مقصد بنو امیہ کی حکومت کو متزلزل کرنا ہو' ان کو اسلام سے جدا کرنا ہو اور امر بہ معروف اور نہی از منکر کو زندہ کرنا ہو تو اس وقت شہادت بے فائدہ اور بلا نتیجہ نہیں ہوا کرتی۔ [۱۰]

اگر اس قیام کے نتیجہ میں بعد میں جو دوسرے بہت سے قیام وقوع پذیر ہوئے' یہ نہ ہوتے تو اسلام اور بنو امیہ آپس میں اس قدر محلول ہو جاتے کہ ان کا جدا کرنا پھر ممکن نہیں ہوتا اور بنو امیہ کے زوال کے ساتھ اسلام بھی ختم ہو جاتا۔

۱۰۔ جیسا کہ ہم خود اپنے اس دور میں بھی کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں جو احتجاج کرنے اور انقلاب کی آگ روشن کرنے کیلئے خود کو اپنے تئیں آگ لگا کر جلا ڈالتے ہیں۔ (Self immolation) اگر چہ اسلام میں اس طرح سے مر جانا جائز نہیں بلکہ یہاں مارے نہ جانے کا اطمینان رکھنا بھی لازم نہیں ہے۔ قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن یقطر کے کام اسی قسم کے تھے۔

۲۔ قیام حسینؑ بن علیؑ کی علتوں کے بارے میں جب بحث چھڑ جاتی ہے تو کبھی بحث کا عنوان امامؑ ہوتے ہیں کہ آپؑ کی تحریک کے کیا محرکات تھے ؟اور کبھی بحث کا عنوان آپ کے دشمن ہوتے ہیں کہ ان کی طرف سے حسینؑ بن علیؑ پر دباؤ ڈالنے اور فشار پیدا کرنے کی کیا وجہ تھی ؟ آقائے صالحی دباؤ ڈالنے کا سبب تین چیزیں بتاتے ہیں :۔

(الف) حسینؑ سے بیعت لے کر اپنی حکومت کو مستحکم کرنا : امامؑ کی بیعت یزید کیلئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور آپؑ کا بیعت نہ کرنا اس کے لئے بہت مضر رساں تھا۔ اس وقت کے حالات میں امامؑ کا بیعت نہ کرنا اور ایک استبدادی حکومت جو بیس سال سے حکومت کر رہی تھی' اس کا سقوط پذیر ہونا بہت زیادہ اضطراب کی بات تھی۔

(ب) عقدۂ حقارت : امامؑ کا سر مبارک جب یزید کے سامنے لایا گیا' اس وقت یزید کا تحقیر آمیز رویّہ اس کے سخن سے ظاہر ہے کہ اس نے اس آیت سے تمسک کیا :قل اللهم مالك الملك ......(سورۂ آل عمران ۲۶)

(ج) وہ انتقامی جذبہ جو بنوہاشم اور بنوامیہ کے گزشتہ واقعات سے مربوط ہے : ہند کی جگر خواری اور طول تاریخ میں ابوسفیان کے مختلف عکس العمل اس بات کے گواہ ہیں۔ جنگ بدر بنوامیہ کے دلوں میں ایک کینہ وجود میں لایا تھا۔ یزید کے یہ اشعار اس بات کے گواہ ہیں :

لیت اشیاخی ببدرٍ شھدوا......"کاش ہمارے بدر میں مرنے والے بزرگ آج ہوتے اور یہ ماجرا دیکھتے......" [۱۰]

---

۱۰ یہاں پر ایک چوتھی صورت بھی ہے یا ان تین صورتوں کے لئے ایک مؤید ہے۔ وہ یہ کہ عرب خصوصاً زیاد اور ابن زیاد جیسے لوگ' طبعاً خونخوار اور عداوت رکھنے والے لوگ تھے۔

۳۔ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کی وضع اور اہلِ کوفہ کی آپؑ کی بیعت کیلئے فریاد اور مدد طلبی اور قتل عثمانؓ کے بعد حضرت امیرؑ کے حالات اور لوگوں کا اُن کی بیعت کیلئے مطالبہ۔ان دونوں بظاہر ایک جیسی صورتحال کا موازنہ اور دونوں ادوار کے لوگوں کا آپس میں موازنہ۔

۴۔ آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے کسی قیام کی ابتداء کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں شکست کا احتمال کامیابی کے احتمال سے کم ہو' ورنہ ابتدائی قیام جائز نہیں۔اس کے برعکس دفاعی قیام' خواہ اس میں موافق ہونے کا احتمال کتنا ہی کم ہو' جائز ہے۔

انہوں نے قیام کے جواز کو احتمال کی جہت میں ذکر کیا ہے کہ اگر زیادہ گمان ہو تو جائز ہے وگرنہ جائز نہیں۔ لیکن اس صورت میں جب احتمال کا رُخ موافقت میں زیادہ ہو' فقط جب ہی ہی محتمل کی جانب قیام زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔اس ضمن میں بعض گمان کرتے ہیں کہ اگر کامیابی کا احتمال نوّے فیصد بھی ہو اور ناکامی کا احتمال دس فیصد ہو' پھر بھی اقدام جائز نہیں جبکہ بعض سمجھتے ہیں کہ اگرچہ کامیابی کا احتمال حد سے زیادہ ضعیف ہو' پھر بھی قیام جائز ہے۔

۵۔ آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے امامؑ کا قیام دستگاہ حکومت پر ہجوم سے شروع ہوا اور اس کے چار مرحلے ہیں :

(الف) مکہ کیلئے نکلنے کے مصمم ارادہ سے لیکر مکہ میں قیام تک۔

(ب) کوفہ جانے کے ارادہ سے لیکر حُر ریاحی کے مدمقابل ہونے تک۔

(ج) حُر کے مدمقابل ہونے سے لے کر جنگ شروع ہونے تک۔

(د) جنگ کا مرحلہ۔

ان چاروں مراحل میں سے پہلا' تیسرا اور چوتھا دفاعی مراحل تھے اور دوسرا

مرحلہ نیم دفاعی اور نیم ابتدائی تھا۔

۶۔ آقای صالحی اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۴۶ (خطی نسخہ) میں اس بات کے مدعی ہیں کہ امامؑ تقاضائے بیعت سے پہلے مخالفت کا قصد نہیں رکھتے تھے۔ گویا اگر آپؑ سے بیعت کا تقاضا نہ کیا جاتا تو آپ ہرگز قیام نہ کرتے۔ جیسا کہ معاویہ کے دور میں آپؑ نے قیام نہیں کیا تھا۔ اسکے علاوہ وہ خط کہ جو کتاب "رجال کشی"، طبع نجف کے صفحہ ۴۹ پر اور کتاب "الامامة والسیاسة" کے ج ۱، ص ۱۸۱ پر نقل ہے، جس کے آخر میں امامؑ نے تحریر کیا: "وَما ارید لك حرباً ولا علیك خلافاً"[۱] سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ اور دونوں حکومتوں (معاویہ اور یزید) میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اسکا جواب یہ ہے کہ اول تو قیام کے لحاظ سے دونوں حکومتوں کے درمیان فرق تھا۔ یزید کی حکومت ایک نوبنیاد حکومت تھی اور اس کے مقابل میں سکوت اور خاموشی سستی اور دورُخاپن شمار ہوتی، جبکہ معاویہ کی حکومت اس کے برعکس تھی۔ اسکے علاوہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی دونوں حکومتوں

۱۔ "میں تم سے جنگ کرنے کا اور تمہاری مخالفت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں"۔ لیکن آقای غفاری کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے مقدمہ کے ص۔ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ امامؑ نے معاویہ کے خط کے جواب میں لکھا: "میں تم سے جنگ نہ کرنے کو اپنے لئے تقصیر شمار کرتا ہوں اور اپنے اس سکوت اور تمہارے خلاف قیام نہ کرنے پر اپنے آپؑ کو خدا کے نزدیک جوابدہ سمجھتا ہوں"۔ ان دونوں مطالب کو جمع کیا جائے تو مفہوم یہ بنتا ہے کہ امامؑ موقع کے انتظار میں تھے۔ کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے صفحہ ۷۳ پر ہے کہ صلح کے بعد جب امام حسنؑ نے کوفہ سے مدینہ کی طرف خروج کرنے کا ارادہ کیا، اس وقت معاویہ نے لکھا کہ آپؑ کو پہلے فروۃ بن نوفل خارجی سے جنگ کیلئے جانا چاہئے، اس کے بعد آپؑ مدینہ جائیں۔ امامؑ نے جواب میں لکھا: "لو آثرتُ ان اقاتل احداًمن اهل القبلة لبدأتُ بقتالك فانّی ترکتُك لصلاح الامة وحقن دمائها"۔ "اگر میں کسی اہل قبلہ سے جنگ لڑوں تو سب سے پہلے تم سے جنگ لڑوں گا، میں نے امت کی صلاح اور ان کے خون کی حفاظت کی خاطر تم سے جنگ نہیں کی ہے"۔ یہاں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ امام حسنؑ کی صلح، مسلحَ صلح تھی اور یہیں سے حسنی اور حسینی روش اور راہ کے ایک ہونے کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

کے مابین فرق تھا۔ یزید کی حکومت کے بر خلاف معاویہ کی حکومت ایک بے دین مگر عاقلانہ حکومت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یزید کی حکومت معاویہ کی حکومت کی نسبت زیادہ مسیحیوں کے زیر اثر تھی۔ یہ بات کہ اگر تقاضائے بیعت نہ ہو تا تو امامؑ قیام نہ کرتے' خود امام کے اس فرمان کے منافی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: "وعلی السلام السلام اِذقدبلیتِ الامة براعٍ مثلِ یزید"۔ ("اگر امت یزید جیسے کی حکومت میں گرفتار ہو' اس وقت اسلام پر میرا اسلام ہو")۔ یہ قول خود آقای صالحی کی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر مقتل خوارزمی کی جلد اص ۱۸۴ سے نقل ہے۔

امامؑ کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ یزید کی حکومت کو معاویہ کی حکومت سے مختلف اور متفاوت جانتے ہیں۔

۷۔ آقای صالحی اپنی کتاب کے ص ۷۶ پر "مقتل خوارزمی" سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے محمد بن حنفیہ سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا: "لولم یکن فی الدنیا ملجأ و لامأوی لما بایعت یزید بن معاویه"۔ "اگر دنیا میں میرے لئے کوئی بھی پناہگاہ نہ ہو' تب بھی میں یزید بن معاویہ کے ہاتھوں بیعت نہیں کروں گا"۔ آپؑ کا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ آپؑ بیعت نہ کرنے کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے۔ امامؑ کا یہ قول آخری ایام میں امامؑ کے بیعت کے لئے تیار ہو جانے والی آقائے صالحی کی بات سے صاف تضاد رکھتا ہے۔

۸۔ آقای صالحی نے اپنی کتاب کے ص ۷۰ پر امامؑ کے مدینہ سے مکہ کی طرف خروج کا' پیغمبر اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف مخفیہ ہجرت سے موازنہ کا ہے۔

۹۔ آقای صالحی کی کتاب میں دو مطالب بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک ممکن ہو خون نہیں بہانا چاہئے اور امن وامان کی حفاظت کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ ہے کہ کامیابی کا انحصار حکومت کی تبدیلی اور عنان حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینے میں ہے۔

۱۰۔ اپنی کتاب کے ص ۶۷ پر "مقتل خوارزمی" کے صفحہ ۶۷ سے آقائے صالحی نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے ابن عباس کے جواب میں فرمایا: "یاابن عباس فما تقول فی قوم اخرجوا ابن بنت رسول الله من وطنه وداره وموضع قراره ومولده وحرم رسوله و مجاورة قبره و مسجده وموضع مهاجرته ، وترکوه خائفاً مرعوباً لایستقرفی قرار ولا یأوی الی وطن بذلك قَتلَهُ وسَفكَ دَمِهِ"۔ "اے ابن عباس کیا کہتے ہو اس قوم کے متعلق جس نے اپنے نبیؐ کی بیٹی کے فرزند کو اس کے وطن، اس کے گھر، اس کی منزل، اسکی جائے پیدائش سے، حرم رسولؐ سے، اس کے نانا کی قبر کی مجاوری سے، پیغمبرؐ کی مسجد سے اور موضع ہجرت سے نکال باہر کیا اور اس کو مرعوب اور خائف کیا۔ اب نہ تو وہ کسی مقام پر ٹھہر سکتا ہے اور نہ کسی جگہ پناہ لے سکتا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس طرح سے اس کو قتل کریں اور اس کا خون بہائیں"۔

۱۱۔ آقای صالحی اپنی کتاب کے ص ۷۹ پر تاریخ یعقوبی کی جلد ۲، ص ۲۳۵ سے نقل کرتے ہیں کہ یزید نے ابن عباس کو ابن زبیر کے ہاتھوں بیعت نہ کرنے پر جو تشکر آمیز خط لکھا تھا اس کے جواب میں ابن عباس نے لکھا: "وَما انس من الاشیاء فلستُ بناس اطرادك الحسین بن علی من حرم رسول الله الی حرم الله ودسّك الیه الرجال تغتاله فاشخصتَهُ من حرم الله الی الکوفه"۔ "میں سب چیزوں کو اگر بھول بھی جاؤں تو اس چیز کو کبھی فراموش نہیں کروں گا کہ تم نے حسینؑ بن علیؑ کو حرم رسولؐ سے باہر کر کے حرم خدا کی

طرف جانے پر مجبور کیا اور وہاں پر کچھ افراد کو ابھارا کہ انؑ کو شہید کردیں اور یوں انؑ کو حرم خدا سے کوفہ کی طرف جانے پر مجبور کیا"۔

یہ قول طریحی کے اس معروف نقل کی تائید کرتا ہے کہ یزید نے ۳۰ افراد امامؑ کو شہید کرنے پر مامور کئے تھے اور اس بات کی بھی تائید کرتا ہے کہ امامؑ کے پاس اہلِ کوفہ پر اعتماد نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کوفہ جائیں اور ان کی باتوں پر اعتماد کریں۔

اسی طرح ارشاد شیخ مفیدؒ کے ص ۱۹۹ پر نقل ہے کہ امامؑ نے فرزدق شاعر کے جواب میں فرمایا: "**لولم اعجل لأُخِذ تُ**"۔ "اگر میں جلدی نہ کرتا تو وہ لوگ مجھے گرفتار کر لیتے"۔

شیخ مفیدؒ کہتے ہیں: "**ولم یتمکّن من تمام الحجّ مخافة ان یقبض علیه بمکة فینفذ به الی یزید بن معاویه**"۔ "میں اس خوف سے حج کو اتمام تک نہیں پہنچا سکا کہ کہیں مجھے مکہ میں گرفتار نہ کریں اور یزید بن معاویہ کے پاس نہ لے جائیں"۔[۱۷]

مقتل خوارزمی جلد ا ص ۲۲۶ پر نقل ہے کہ امامؑ نے ابو ہرہَ ازدی کے جواب میں فرمایا: "**ان بنی امیه قداخذومالی فصبرتُ وشتموا عِرضی فصبرت وطلبوا دَمی فهربتُ**"۔ "بنی امیہ نے میرا مال غصب کیا میں نے صبر کیا، میری عزت و آبرو پر حملہ کیا میں نے صبر کیا۔ اب وہ میرے خون کے پیاسے ہیں، اس لئے میں (حرم خدا اور حرم رسولؐ کو چھوڑ کر) نکل پڑا"۔

آقای صالحی بتاتے ہیں کہ یہ سب باتیں اس بات سے مربوط ہے کہ امامؑ نے

---

۱۷ کتاب سرمایہ سخن میں ہے: "عمر و بن سعید کچھ اور فوجیوں کے ساتھ اس کام (یعنی امامؑ کو شہید کرنے) پر مامور ہو چکا تھا"۔

کوفہ کا قصد کیا تھا تاکہ وہاں حکومت تشکیل دیں۔ لیکن جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ باتیں بیعت کے شدت کے ساتھ انکار سے اور مکہ میں عدم امن سے مربوط ہیں۔

۱۲۔ امامؑ زمام حکومت کو اپنے ہاتھ لینا چاہتے تھے۔

امامؑ نے حضرت مسلمؑ کے ساتھ اہلِ کوفہ کے نام جو خط بھیجا اس میں لکھا تھا:

"والعمری ماالامام الا العامل بالکتاب والقائم بالقسط والدائن بدین الحق".

"میری جان کی قسم امام صرف وہی ہے جو کتاب خدا پر عمل کرتا ہو' عدل کو رواج دیتا ہو اور دین حق پر قائم ہو"۔

حُر اور ان کے اصحاب کے سامنے خطبہ ایراد کرتے ہوئے فرمایا: "ونحن اهل البیت اولی بولایة هذا الامر من هؤلاء المدّعین مالیس لهم والسّائرین فیکم بالجور والعدوان". "ہمارا خاندان اس حکومت کی سرپرستی کے لئے بہت زیادہ سزاوار ہے بہ نسبت ان جھوٹے مدعیوں اور ان لوگوں کے جو تمہارے درمیان ظلم وجور اور دشمنی سے پیش آتے ہیں"۔

روز عاشور زہیر بن القینؓ نے بھی اپنے خطاب میں بنوامیہ کے ناشائستہ اور امام حسینؑ کے شائستہ ہونے کی باتیں کیں۔

۱۳۔ آقائے صالحی کا خیال ہے کہ حُر کے مدمقابل ہونے کے بعد امامؑ کا وظیفہ بدل گیا تھا۔ اس مرحلہ میں امامؑ کی تمام تر کوشش اپنی جان بچانا اور صلح کرنا تھی۔ لہٰذا فرمایا: وان لم تفعلوا وکنتم لمقدمی کارهین ولقدومی علیکم باغضین انصرفتُ منکم الی المکان الّذی جئتُ منه اِلیکم. "اس فعل کو نہ انجام دو۔ اگر میرا آنا تمہیں ناپسند ہے اور میرے آنے پر تم لوگ

خشمگین ہو تو میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں واپس جاتا ہوں"۔

یہاں پر کچھ سوالات ہیں۔ اول یہ کہ کیا امامؑ کے لئے مکہ میں بھی کوفہ کی طرح جان کا خطرہ تھا۔ ثانیاً اگر امامؑ بیعت کر لیتے اگرچہ حُر کے ذریعہ ابن زیاد سے ہی سہی، آیا پھر بھی وہ امامؑ سے متعارض ہوتے یا آپؑ کو آزاد چھوڑ دیتے، یا زیادہ سے زیادہ آپؑ کو یزید کے پاس لے جاتے؟ صالحی کے نے جو سوال اٹھایا ہے امامؑ کیوں صلح کے طرفدار تھے اور بالآخر کیوں صلح کی خاطر ان سخت شرائط میں بھی بیعت نہ کی؟

بالکل یہی مفہوم امامؑ کے اس جواب میں بھی ہے جو آپؑ نے عمر بن سعد کو دیا تھا اور جو "طبری"، "ارشاد شیخ مفیدؒ" اور "الاخبار الطوال" میں نقل ہے۔ آپؑ نے فرمایا: "فامّا اِذکَرِھتُمونی فانا انصرف عنکم"۔ "اگر تم لوگ مجھے نہیں چاہتے ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں"۔

اسی طرح کا جملہ امامؑ کے عاشورا کے خطبہ میں بھی ہے: "ایھا الناس اِذ کرھتمونی فدعونی انصرف الی مأمنی من الارض"۔ "اے لوگو! اب اگر مجھے نہیں چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو تاکہ میں زمین پر اپنی پناہگاہ ہیں واپس چلا جاؤں"۔ ان جملوں میں امامؑ کے مخاطب ظاہراً فقط کوفہ کے لوگ ہیں، نہ کہ حکومت یزید۔

آقای صالحی اپنی کتاب کے ص ۸۸ پر ذخائر العقبیٰ کے ص ۱۴۹ اور تاریخ ابن عساکر، جلد ۴، ص ۳۳۴ اور سیر النبلاء، ص ۲۰۹ سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے ان سے فرمایا: "الا تقبلون منّی ما کان رسول الله یقبل من المشرکین؟ کان اذاجنح احدھم للسلم قبل منه قالوا: 'لا'."۔ "آیا مجھ سے وہ چیز قبول نہیں کرو گے جو رسولِ خدا مشرکین سے بھی قبول کرتے

تھے ؟ جب بھی ان میں سے کوئی صلح کے لئے تیار ہوتا تھا" آنحضرتؐ قبول فرماتے۔ انہوں نے جواب دیا : "نہیں"."۔

یہ جملہ بہت زیادہ بعید نظر آتا ہے۔ مشکل ہے کہ کلمۂ ان جنحو اللسّلم کا مفہوم صلح ہو بلکہ ظاہراً اس کا مقصد تسلیم ہے' اور امامؑ کے اقوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ کبھی بھی تسلیم ہونے کے لئے تیار نہیں ہوئے ہیں۔

۱۴۔ آقائے صالحی ص ۹۳ پر طبری کے قول کو قبول کر لیتے ہیں کہ واقعاً امامؑ نے تین پیشنہاد کی تھیں :

(ا) حجاز کی طرف واپس لوٹ جائیں (حجاز کے جائے امن نہ ہونے کے باوجود "لو تُرِكَ القطالَنَام" (اگر قطار (ایک پرندہ) کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سو جاتا ہے)۔

(ب) یا کسی ایک سرحد کی طرف کوچ کر جائیں۔

(ج) یا یزید سے ملاقات کیلئے شام جائیں۔

۱۵۔ آقائے صالحی' سید مرتضٰی کی "تنزیہ الانبیاء" اور شیخ طوسی کی "تلخیص الشافی" میں جو نقل ہے' اس پر تکیہ کرتے ہوئے اس بات کے مدعی ہیں کہ :

(الف) امامؑ کوفہ کے حالات کی اطلاع ملنے اور حجاز واپس جانے کے امکان کی نفی ہونے کے بعد یزید سے ملاقات کرنے پر مائل تھے۔

(ب) یزید سے ملاقات کے ذریعہ آپؑ مسئلہ کو سلامتی سے حل کرنے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن آقائے صالحی اس بات کی توضیح نہیں کرتے کہ بیعت کے ساتھ یا بغیر بیعت کے۔ پہلی صورت کو امامؑ قبول نہیں کرتے تھے اور دوسری صورت یزید کو قبول نہیں تھی۔

(ج) امامؑ کے ساتھ' ابن زیاد کی نسبت یزید کا رویہ زیادہ نرم تھا۔ در حقیقت یزید امامؑ کو

شہید کرنے پر مائل نہیں تھا اور اس نے امامؑ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

(د) امامؑ کو اس بات پر یقین تھا کہ اگر ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہوئے تو ذلت کے ساتھ مار دیئے جائیں گے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ امامؑ کے پاس فرار کا کوئی بھی راستہ نہیں تھا۔ کوفہ کے حالات معلوم ہونے سے پہلے کامیابی کی امید تھی اور یہ امید زیادہ ہی تھی۔ اس واقعہ کے بعد آپؑ حجاز کی طرف واپس جانے کے لئے تیار تھے مگر انہوں نے اجازت نہ دی، یزید کے پاس جانا چاہا، نہ جانے دیا۔ اس لحاظ سے شہید ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ بات صرف اس میں تھی کہ ذلت کے ساتھ ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہو جائیں یا عزت کے ساتھ جنگ کرتے جان دیدیں۔ اور آپؑ نے عزت کی راہ کو اختیار کیا۔ اسکے برعکس حضرت مسلمؓ ابن زیاد کے امان سے فریب کھا گئے اور ذلت کے ساتھ شہید ہونا پڑا! لہذا اس صورت میں امامؑ کے لئے کوئی بھی شان و مقام اور حماسہ باقی نہیں رہتا تھا!

آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ اگر وہ امامؑ کو شام جانے کی اجازت دے دیتے تو آپؑ چلے جاتے اور بیعت بھی کر لیتے اور اس بیعت میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ امامؑ نے اس وقت تک بیعت سے انکار کیا جبتک آپ یہ خیال کرتے تھے کہ خلافت کو یزید سے چھین سکتے تھے۔ لیکن جب آپؑ نے دیکھا کہ یہ ممکن نہیں رہا، تب بیعت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ آقائے صالحی اس چیز کے بھی مدعی ہیں کہ امام سجادؑ نے بعد میں مسلم بن عقبہ کے ذریعے یزید کی بیعت کر لی تھی (آقائے صالحی ہی کے وہ بیانات جو نمبر ۵ اور ۷ میں ذکر ہوئے ہیں یہ تمام باتیں ان کے منافی ہیں)۔

۱۶۔ امام حسینؑ کے نام اکابر ان کوفہ کے خط کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد فالحمدلله الذی قصم عدوك الجبّار العنید الّذی انتزیٰ علی هذه الامة فابتزّها امرها، و غصبها فئیها، وتأمّر علیها بغیر رضیً منها، ثم قتل خیارها، واستبقیٰ شرارها، وجعل مال الله دولةً بین جبابرتها واغنیائها، فبعداً له کما بعدت ثمود. انه لیس علینا امام فاقبل لعل الله یجمعنا بك علی الحق"۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپؑ کے جبار سرکش دشمن کو ختم کر دیا جس نے امت کے معاملات کو درہم وبرہم کیا، اموالِ امت غصب کر لئے اور امت کی رضامندی کے بغیر اس پر زبردستی حکومت کی، جس نے نیک لوگوں کو قتل کیا اور بُروں کو باقی رکھا اور جس نے خدا کے مال کو اپنے سرکشوں اور مالداروں کی ملکیت قرار دے دیا۔ خدا اس کا بُرا کرے جس طرح قوم ثمود کا بُرا ہوا۔ سوائے آپؑ کے ہمارا کوئی امام نہیں۔ تشریف لایئے۔ امید ہے خدا آپؑ کے ذریعہ ہم کو حق پر جمع کر دے گا"۔

اس خط کو طبری نے "الامامة والسیاسة" میں، ابن اثیر نے کامل میں، شیخ مفیدؒ نے ارشاد میں اور خوارزمی نے مقتل میں نقل کیا ہے۔

خط کا یہ مضمون سلیمان بن صُرد خزاعی اور حبیب بن مظاہر وغیرہ جیسے محرّک اور پُرجوش وپُرولولہ لوگوں کا تھا۔ یہی امامؑ حسینؑ کے محرک ہونے کا سبب شمار ہو سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ امامؑ نے منزل ذُوحسَم پر اپنے اصحاب اور لشکرِ حُر سے جو خطاب فرمایا تھا وہ بھی انہی مطالب کی تائید ہے۔

۱۷۔ آقائے صالحی "اخبار الطّوال" کے ص ۲۱۰ اور "ارشاد مفید" کے ص ۱۸۲ سے نقل کرتے ہیں کہ اہل کوفہ کی طرف سے سب سے پہلا خط رمضان المبارک کو امامؑ کو ملا، یعنی امامؑ کے مکہ پہنچنے کے تقریباً ایک مہینہ بعد۔

۱۸۔ آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ حضرت مسلم ۱۵/ رمضان المبارک کو عازم کوفہ ہوئے اور ۵/ شوال کو کوفہ پہنچے (مروج الذہب ج ۲ ص ۸۶)۔ ایک مہینہ سات دن تک حالات کا تجزیہ کرتے رہے اور ۱۲ ذی القعدہ کو امامؑ کی خدمت میں گزارش ارسال کی (ارشاد مفید ص ۲۰۱) اور قاعدتاً حضرت مسلمؒ کا خط چودہ (۱۴) دنوں کے بعد یعنی ۲۷/ ذی القعدہ کو امامؑ کو ملا۔

آیا امامؑ نے ۸/ ذی الحجہ کو حرکت کی ہے؟

۱۹۔ آقائے صالحی ص ۱۶۱ پر "تذکرۂ سبط" اور "تاریخ ابن عساکر" سے ابن عباس کے نام یزید کے ایک خط کو نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید مکہ اور کوفہ کے روابط سے کلّی طور پر آگاہ تھا اور اس نے ضمناً نصیحت اور پیش بینی بھی کی تھی۔

۲۰۔ آقائے صالحی ص ۱۷۶ پر کہتے ہیں کہ امامؑ کے اس جملہ سے: **فهلّا لكم الويلات تركتمونا والسّيف مشيم والجاشُ طامِنٌ والرأی لما يستحصفُ** ایہ سمجھ میں آتا ہے کہ امامؑ اہل کوفہ کی جانب سے مدد و یاوری کا اطمینان حاصل کرنے کے بعد کوفہ آئے تھے اور اگر وہ پہلے ہی اپنی آمادگی کا اعلان نہ کرتے تو امامؑ ایسا ارادہ نہ کرتے اور کوفہ کی طرف نہ آتے۔

پس اولاً تو امامؑ کربلا کے قصد سے اور شہید ہونے کے قصد سے نہیں آئے تھے۔

ثانیاً امامؑ کو کوفہ والوں کی یاوری کرنے کے وعدہ پر اطمینان تھا۔

اور ثالثاً اگر یہ اطمینان نہ ہوتا تو آپؑ کبھی بھی کوفہ کی طرف نہ آتے، کوئی دوسرا لائحہ عمل اختیار کرتے۔ مثلاً بیعت کر لیتے اور تسلیم ہو جاتے۔ (لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ امامؑ کا کوفہ آنا اقل الخطرین یا الخطرات کے لحاظ

سے تھا۔ یہ جملے خود اہل کوفہ کی تکلیف کے لحاظ سے ہیں، نہ کہ امامؑ کے تصمیم کی نظر سے)۔

۲۱۔ آقائے صالحی لکھتے ہیں کہ یہ تصور کہ امامؑ پہلے سے ہی کربلا کے قصد سے اور شہید ہونے کے لئے نکلے تھے، اس کی وجہ درجِ ذیل پانچ چیزیں ہو سکتی ہیں :

(ا) پیغمبر اکرمؐ کی قبر کے سرہانے آپؑ کا خواب ۔

(ب) ان الله شاء ان یراك قتیلاً کی حدیث۔

(ج) خطّ الموت علیٰ ولد آدم والا خطبہ۔

(د) وہ خطبہ جس میں یہ جملہ آیا ہے :"لاارى الموت الا سعادة......"

(ھ) جناب ام سلمہ سے منسوب حدیث اور شیشی اور مٹی کا قصہ۔

خواب کی داستان "خوارزمی" نے "ابن اعثم کوفی" سے نقل کی ہے جو قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس خواب کو دوسروں مثلاً شیخ صدوقؒ نے "امالی" میں (بحار کی نقل کے مطابق جلد ۱۰ میں) محمد بن عمر بغدادی سے نقل کیا ہے۔ یہ بھی ابن اعثم کوفی کے زیر اثر تھے ۲۔

۱۔ ترجمہ "افسوس ہو تم لوگوں پر! جب شمشیر نیام میں تھی اور دل آرام سے تھے اور ابھی از روئے حقیقت عزم نہیں کیا تھا، کیوں اس وقت ہمیں آزاد نہ چھوڑا؟

۲۔ ابن اعثم کوفی اور صدوقؒ کے علاوہ ابن اثیر بھی اپنی کامل کی جلد ۳ ص ۲۷۷ پر کہتے ہیں کہ امامؑ نے جواب میں فرمایا: "میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس کو میں بیان نہیں کروں گا"۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آئمہ اطہارؑ نے اس کو نقل کیا ہے۔ مقتل ابو مخنف میں ہے:"وذکر عمّار فی حدیثه:ان الحسینؑ لما خرج من المدینه اتی قبر الرسولؐ فالتزمه وبکی بکاءً شدیداً وسلّم علیه وقال بابی انت وامّی یارسول الله لقد خرجت من جوارك کرهاً، وفرّق بینی وبینك ، و اخذت بالانف قهراً ان ابایع یزید بن معاویه شارب الخمور وراکب الفجور وان فعلت کفرت وان ابیت قتلت علینا انا خارج من جوارك علی الکره منّی فعلیك منّی السلام یا رسول الله ـ ثم عنّ علیه الکری ساعة فأجزعته انه رأی رسول اللهؐ فی منامه وقد وقف به وسلّم علیه و قال : یابنّی لقد لحق بی ابوك وامّك واخوك وهم مجتمعون فی دارالحیوان ولکنّا مشتاقون الیك فعجّل بالقدوم علینا، واعلم یا بنّی ان لك فی الجنة درجة مغشاة بنورالله فلست تنالها

اسی طرح "روضۃ الصفا"، "روضۃ الشہداء" اور محمد بن ابی طالب حسینی کی "تسلیۃ المجالس"، "نفس المہموم"، "ناسخ التواریخ"، ان سب نے بغیر واسطہ کے یا واسطہ کے ساتھ ابن اعثم پر اعتماد کیا ہے۔

۲۲۔ آقائے صالحی مدعی ہیں کہ امامؑ نے خطبہ خُطّ الموت...... فمن کان بازلاً فینا مهجتَهُ...... کو اس ترتیب کے ساتھ اور مکہ سے نکلتے وقت ارشاد فرمایا ہے۔ اس خطبہ کو فقط "لہوف" نے نقل کیا ہے، البتہ مقتل خوارزمی میں بھی یہ الفاظ میں کچھ اختلاف کے ساتھ نقل ہوا ہے مگر لکھا ہے کہ یہ خطبہ امامؑ نے روز عاشورا ارشاد فرمایا تھا اور جملہ فمن کان بازلاً فینا مهجته اصلاً وہاں پر موجود نہیں ہے۔ خوارزمی نے جو نقل کیا ہے، وہ یہ ہے :

"ایها الناس خُطّ الموت علی بنی آدم کمخط القلادة علی جید الفتاة. وما اولهنی الی اسلافی اشتیاق یعقوب الی یوسف، وانّ لی مصرعاً انا لاقیه، کانّی انظر الی اوصالی تقطّعها و

الا بالشهادة، وما اقرب قدومك علینا "۔ "عمار نے اپنی حدیث میں کہا ہے : جب امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلنے کا عزم کیا تو پیغمبر اکرمؐ کی قبر مطہر پر آئے اور قبر سے لپٹ گئے۔ بہت زیادہ روئے، اس کے بعد ان کو سلام کیا، پھر کہا : میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں یا رسولؐ اللہ۔ میں دل سے راضی نہ ہوتے ہوئے آپؐ کے جوار سے نکل رہا ہوں اور میرے اور آپؐ کے درمیان جدائی ہو رہی ہے۔ مجھے یزید جیسے شراب خوار اور فاجر کی بیعت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر میں بیعت کروں تو کافر ہو جاؤں گا اور اگر نہ کروں تو یہ مجھے مار دیں گے، اسلئے میں مجبوراً آپؐ کے جوار سے جا رہا ہوں۔ پس آپؐ پر میرا سلام ہو یا رسولؐ اللہ۔ اس کے بعد آپؑ پر نیند کا غلبہ ہوا۔ ایک خواب دیکھا جس سے آپؑ وحشت زدہ ہوئے۔ اور وہ خواب یہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ آپؑ کے پاس آئے اور سلام کیا۔ اس کے بعد فرمایا : بیٹا تمہارے ماں باپ اور بھائی مجھ سے آملے ہیں اور ہمیشہ رہنے والی زندگی میں سب جمع ہیں اور ہم سب تمہاری دید کے مشتاق ہیں۔ ہماری طرف جلدی کرو۔ عزیزم یہ جان لو کہ بہشت میں تمہارے لئے ایک درجہ ہے جو نور الٰہی سے آراستہ ہے اور وہ شہادت کے بغیر نہیں ملے گا۔ اور تمہارا ہمارے پاس آنا کس قدر نزدیک ہو گیا ہے"۔

مرحوم آیتی بھی کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے ص ۷۹ پر اس بات کے مدعی ہیں کہ امامؑ نے عبد اللہ بن جعفر کہ جو حاکم سے ملنے مکہ آیا تھا، کی بات کے جواب میں فرمایا : "میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا ہے"۔ پوچھا کونسا خواب۔ فرمایا : "جب تک میں زندہ ہوں گا کسی سے بیان نہیں کروں گا"۔

حوش الفلوات غُبراً و عفراً قدملأت منّی اکراشها ‘رضاالله رضانا اهل البیت’ نصبر علی بلائه لیوفینا اجورالصابرین‘لن تشذّ عن رسول الله لحمتُه وعترته ولن تفارقة اعضاوٗه وهی مجموعة له فی حظیرة القدس تقرّبها عینه وتنجز فیهم عدتُہ”.

”اے لوگو! موت کا قلادہ اولاد آدمؑ کے گلے میں اس طرح ہے جس طرح جوان عورت کے گلے میں ہار۔ مجھے اپنے اسلاف سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا شوق تھا۔ میری قتلگاہ معین ہو چکی ہے جہاں میں پہنچنے والا ہوں۔ میں گویا نواویس اور کربلا کے درمیان اپنے جسم کے جوڑ و بند دیکھ رہا ہوں کہ جنگل کے بھیڑیئے (لشکر یزید) ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں اور میرے جسم سے اپنے بھوکے پیٹ اور خالی توشہ دانوں کو بھر رہے ہیں۔ قلم قدرت نے موت کا جو دن لکھ دیا ہے اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ خُدا کی مرضی ہم اہل بیتؑ کی مرضی ہے‘ ہم اسکی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہم کو صابروں کے اجر سے سرفراز فرمائے گا۔ رسولؐ اللہ سے ان کے اہل بیتؑ جدا نہ کئے جائیں گے بلکہ بہشت میں سب کے سب آپ کی خدمت میں موجود رہیں گے۔ ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں روشن ہوں گی اور آپ اُن کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کریں گے“۔

۲۳۔ کتاب ”اثبات الوصیۃ“ میں مسعودی صفحہ ۱۳۹ پر جناب اُم سلمہ اور شیشی کی معروف روایت اور ابا عبد اللہ کا جناب اُم سلمہ کو میدان کربلا کا منظر دکھانے کی بات نقل کرتے ہیں۔ آقائے صالحی اس واقعہ کو امامؑ کی عادی زندگی کے منافی بتاتے ہیں اور اس روایت کو رد کرتے ہیں۔

۲۴۔ آقائے صالحی اپنی کتاب کے ص ۱۹۶ پر "اثبات الوصیۃ" کی روایت کو ردّ کرنے کے بعد بہت ساری روایات نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے تھوڑی سی تربت اُم سلمہ کو دے دی اور کہا کہ اس کی امام حسینؑ کی شہادت کی علامت کے طور پر نگہداری کریں۔ آقائے صالحی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد قبول بھی کر لیتے ہیں۔

۲۵۔ اہم سوالوں میں سے ایک یہ ہے کہ امامؑ نے حضرت مسلمؓ کی شہادت کی خبر ملنے اور کوفہ پر ابن زیاد کے تسلط سے واقف ہونے کے باوجود کوفہ کی طرف اپنے سفر کو کیوں جاری رکھا؟ بلکہ حضرت مسلمؓ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی: "من المؤمنین رجال صدقوا ماعاهدوا الله علیه فمنهم من قضیٰ نحبه ومنهم من ینتظر ومابدّلوا تبدیلاً"۔ "مومنین میں ایسے بھی مرد میدان ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو سچ کر دکھایا ہے' ان میں بعض اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنی بات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی ہے"۔ (سورۂ احزاب ۲۳)

۲۶۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ اگر آقائے صالحی کی یہ بات صحیح ہے کہ امامؑ حتی الامکان خون بہانے سے پرہیز کرتے تھے اور تسلیم نہ ہونے کی علت یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں ابن زیاد کے ہاتھوں قتل ہونا ہے' تو پھر اپنے اصحاب اور فرزندوں کو قتل ہونے سے کیوں نہیں بچایا؟ حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کے لئے امان نامہ آیا تھا۔ خود امامؑ کے فرمان کے مطابق کسی کو ان لوگوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیوں امامؑ ان سب کے قتل پر راضی تھے؟ اس کے علاوہ اگر امامؑ ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہو جاتے تو لشکر ابن زیاد میں موجود

کوفہ کے سینکڑوں افراد بھی مارے نہ جاتے۔ ان کا مارا جانا بھی ایک قسم کی خونریزی ہی تو تھی۔

۲۷۔ امامؑ کے پاس کوفہ سے جب قاصد مخصوص خط لیکر پہنچ جاتا ہے (محمد اشعث کی طرف سے حضرت مسلم کی وصیت پر) تو امامؑ لوگوں کے درمیان خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جسکے بعد کچھ لوگ جو طمع ولالچ میں وسط راہ میں ساتھ ہو لئے تھے، واپس لوٹ جاتے ہیں، مگر امامؑ خود اُسی طرح کوفہ کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ کیوں؟

۲۸۔ آقائے صالحی امامؑ کا حُر سے سامنا ہونے کو اس لحاظ سے تازہ مرحلہ بتاتے ہیں کہ حُر امامؑ کو ابن زیاد کے سامنے تسلیم کرنے پر مأمور تھا اور اس صورت میں کوفہ جانے سے لوگوں کی طرف سے کسی بھی قسم کی مدد کا احتمال نہیں تھا۔

۲۹۔ آقائے صالحی "اخبار الطوّال" کے ص ۲۲۷ سے نقل کرتے ہیں کہ جب امامؑ کو ابن زیاد کے عمر سعد کے نام لکھے گئے خط (جس میں امامؑ کیلئے دو راستے دکھائے تھے، تسلیم ہونا یا شہادت) کا علم ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

"فهل هو الا الموت؟ فمرحباً به"۔

"کیا موت کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے؟ مرحبا! اے موت")۔

۳۰۔ آقائے صالحی لکھتے ہیں محرم کی پانچ تاریخ کے تقریباً آخری اوقات میں عمر سعد کو ابن زیاد کا حکم ملا کہ حسینؑ سے کہہ دو کہ ابھی بیعت کریں، بعد میں ان کے بارے میں سختی کروں گا۔ چھٹی محرم کی شام امامؑ کا جواب کہ "کبھی بھی تسلیم نہیں ہوں گا" اس تک پہنچ گیا۔ ساتویں محرم کے آخری اوقات میں حکم آیا کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو۔

۳۱۔ آیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امامؑ کی کوفہ سے انصراف کی پیشنہاد (خود اپنے پاؤں

سے چل کر آنے کے بعد) اس لئے تھی کہ اس کے ذریعہ آپؑ انقلاب کو شدت اور وسعت بخشنا چاہتے تھے؟ جیسا کہ ابن زیاد نے جب عمر سعد کی پیشکش کو قبول کرنا چاہا تو شمر نے کہا: "اگر حسینؑ تمہارے ہاتھ سے نکل گئے تو پھر وہ قوی تر اور تم ضعیف تر ہو جاؤ گے"۔

۳۲۔ ایک سوال یہ ہے کہ امامؑ نے کیوں بصرہ کے لوگوں کے نام خط لکھا اور کیوں ان کو دعوت دی؟ آیا یہ دعوت حکومت کے خلاف قیام کے علاوہ کسی اور چیز کے لئے تھی؟ آیا شورش اور انقلاب برپا کرنے کے علاوہ یہ کسی اور قسم کی دعوت تھی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ کیوں شب عاشور حبیب بن مظاہرؓ کو بنو اسد کو دعوت دینے کے لئے بھیجا؟ کیوں شب عاشور اپنے بھائیوں' فرزندوں اور خاص اصحاب سے چلے جانے پر اصرار نہیں کیا تاکہ انکا خون نہ بہے؟

۳۳۔ عجیب بات ہے کہ آقائے صالحی نے اپنی کتاب میں تمام تر کوشش یہ کی ہے کہ قیام حسینی کے ابتدائی قیام ہونے کی نفی کریں۔ اس کے باوجود چوتھے باب کے ص ۲۹۹ پر حکومت یزید کے حالات' حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے' اس کے ظلم وستم اور استحصال وغیرہ کو بیان کرنے اور ان چیزوں کی امامؑ کے منزل بیضہ پر دیئے گئے خطبہ سے تطبیق کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اگر ان حالات میں کسی بھی حلقوم سے کوئی ندا نہ اٹھتی اور اگر بالفرض محال امام حسینؑ کسی شرط وقید کے بغیر یزید کو تسلیم کر لیتے' تو اس صورت میں دوسری مملکتیں اسلام کی شناخت یزید بن معاویہ کے قالب میں کرتیں۔ اگر رئیس مملکت اسلامی کے خلاف کوئی نہ اٹھتا اور معترض نہ ہوا ہوتا تو یزید تو باہر کی دنیا کی نظر میں روح اسلام کا نمائندہ تھا۔ اُس وقت بیگانے کہتے کہ اسلامی مملکت گویا ظلم و بے داد کی مملکت ہے۔......"۔

حسینؑ بن علیؑ کہ جن کی افق نظر عام لوگوں کی نظر سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جب آپؑ خارجی اور دنیاوی نظروں میں اسلام کی ایسی وضع دیکھتے ہیں اور اس صورتحال میں آپؑ سے یزید کی بیعت کرنے کیلئے کہا جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں : "وعلی الاسلام السلام اذ قدبلیت الامة براع مثل یزید" ۔ "جب امت یزید جیسے کی حکومت میں گرفتار ہو، اسوقت اسلام پر میر اسلام ہو"۔ (مقتل خوارزمی ج ۱، ص ۱۸۴)

اس مفہوم تک خود ہی رسائی ہوتی ہے۔ کبھی ایک اعتراض اور اظہار وجود کی اس قدر اہمیت ہوتی ہے کہ اس کی خاطر سینکڑوں آدمی اپنی جانیں قربان کردیتے ہیں۔ پس امام حسینؑ کے اس قدر معترض ہونے کے باوجود کیوں آقائے صالحی اس بات کے منکر ہیں ؟

اس کے بعد کہتے ہیں : "اسی وجہ سے حسین بن علیؑ مقاومت کا مصمم عزم کرتے ہیں...... تاکہ بیرونی دنیا جان لے کہ اسلام کو حسینؑ بن علیؑ کے افکار کے دریچہ میں اور فرزند پیغمبرؐ کے قالب میں شناخت کرنا ہے، نہ کہ یزید کے قالب میں...... تاکہ بیرونی دنیا جان لے کہ اسلام نے حسینؑ جیسے ہونہار فرزند کو تربیت دی ہے جو انسانیت اور عدالت کا دفاع کرتے ہوئے آزادی، حرّیت، تقویٰ اور فضیلت کی راہ میں والہانہ طور پر جان کی بازی لگادیتے ہیں۔

اسلئے اسلام کی جہانی اور بین الاقوامی موقعیت کے دفاع کو حسینؑ کے وسیع اور ہمہ زاویہ ہدف کا ایک جز جاننا چاہیئے۔

۴۳۔ آقائے صالحی کہتے ہیں : "بعض لوگ جیسے 'موسیو ماربین جرمن' کتاب "السیاسة الحسینیه" میں لکھتا ہے کہ امام حسینؑ عمداً مظلومیت کا منظر پیش کرنا

چاہتے تھے اور شہادت کے لئے جتنا بھی ہو سکے ' سخت مصیبت کے مقدمات فراہم کرنا چاہتے تھے تا کہ بہتر طور پر زیادہ تر لوگوں کے احساسات کو بنو ہاشم کی موافقت اور بنو امیہ کے خلاف متحرک کر سکیں"۔

"ماربین" کہتا ہے : "امام حسینؑ کئی سالوں سے متواتر اپنے شہید ہونے کے آثار دیکھ چکے تھے اور ایک اعلیٰ مقصد ان کے مدّ نظر تھا۔" (ص ۳۳)

اس نے یہ بھی کہا ہے : "حسینؑ ابن علیؑ کے مدّ نظر چونکہ قتل ہونے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا کیونکہ یہی آپ کے اس مقدس اور عالی (انقلاب) خیالات کا مقدمہ تھا' اسلئے اپنے لئے بے کسی اور مظلومیت کو سب سے بڑا وسیلہ جانا اور اسی کو اختیار کیا تا کہ آپ کے مصائب دوسروں کے دلوں پر مؤثر واقع ہوں"۔ (ص ۲۵)

یہ بھی کہا: "حسینؑ نے بنو امیہ کے ظلم و ستم کو ظاہر کرنے اور بنو ہاشم اور اولاد محمدؐ کے ساتھ انکی عداوت کو فاش کرنے میں کوئی فرصت ہاتھ سے جانے نہیں دی"۔ (ص ۲۶)

طفل شیر خوار کے بارے میں اس نے کہا ہے : "ان تمام جانکاہ مصائب ' پیاس اور اتنے سارے زخموں کے باوجود حسینؑ اپنے عالی مقصد (احساسات کو حرکت میں لانا) سے صرف نظر نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنو امیہ آپکے چھوٹے سے بچہ پر رحم نہیں کریں گے ' محض مصائب کو عظیم بنانے کے لئے خود اپنے ہاتھوں میں بچہ کو لیکر میدان میں گئے ' ظاہری طور پر اسکے لئے پانی کی التجا کی اور تیر سے جواب سنا"۔

۳۵۔ آقائے صالحی اپنی کتاب کے آخری حصہّ میں ص ۳۰۹ پر مغالطہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں : "اس جملہ کی تعبیر کے طور پر کہ "امام حسینؑ کے شہید ہونے

سے اسلام زندہ ہوا"، ہم کوئی صحیح اور قابل قبول معنی تصور نہیں کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس میں کوئی فرق نہیں کہ اسلام کے زندہ ہونے سے مراد احکام اسلام پر عمل کرنا ہو یا اسلامی فتوحات ہو یا بنوامیہ کی حکومت کو کمزور ہونا ہو یا شیعوں کو وجود میں لانا ہو یا بنوامیہ کو رسوا ہونا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کے صدر رئیس اور حافظ قرآن کے مرنے سے اسلام زندہ ہو جائے ؟!"۔

۳۶۔ آقائے صالحی لکھتے ہیں: "عبید اللہ نے عمر سعد سے فرمان کا مطالبہ کیا تو عمر سعد نے نہیں دیا اور مسئولیت کو عبید اللہ کے گلے میں ڈال دیا"۔

عثمان بن زیاد نے کہا: "میری خوشی اسمیں ہے کہ زیاد کے تمام فرزند قیامت تک ذلیل رہتے اور حسینؑ بن علیؑ شہید نہ ہوتے"۔

(طبری ج ۴ ص ۳۷۵)

ابن زیاد کی ماں "مرجانہ" کہتی ہے: "یاخبیثُ! قتلت ابن رسول الله، والله لاتریٰ الجنة ابداً"۔ "اے خبیث! رسولؐ اللہ کے فرزند کو قتل کیا؟ خدا کی قسم کبھی بھی بہشت کی صورت نہ دیکھ سکے گا"۔ (تذکرۂ سبط ص ۲۵۹)

یحییٰ بن الحکم (مروان بن الحکم کا بھائی) کہتا ہے: "تمہارے اور پیغمبرؐ خدا کے درمیان قیامت کے دن جدائی ہوگی۔ میں اس کے بعد تمہارے کسی بھی کام میں شریک نہیں ہوں گا"۔ (طبری ج ۴ ص ۳۵۶)

یحییٰ بن حکم نے جب سر مقدس امامؑ کو یزید کے سامنے دیکھا تو افسوس اور غصہ کی حالت میں بول اٹھا: "سمیّہ کے بچے تعداد میں اگرچہ کہ ریگِ بیابان کے برابر ہو جائیں تو اس کا مطلب کیا یہ ہوا کہ پیغمبرؐ خدا کی بیٹی کے فرزند قتل ہوں اور مٹ جائیں"۔ (طبری ج ۴ ص ۳۵۲)

یزید کی بیوی ہند پر جب یہ ماجرا کھلا تو اس نے اپنے مخصوص لباس سے حجاب کیا اور اندرون خانہ سے مردوں کی مجلس میں آکر بولی: "آیا یہ حسینؑ فرزند فاطمہؑ کا سر مقدس ہے؟" یزید نے کہا: "ہاں' یہ حسینؑ فرزند فاطمہؑ کا سر ہے۔ تُو ان کے لئے گریہ اور عزاداری کر' خدا ابن زیاد کو موت دے کہ اس نے ان کو مارنے میں عجلت کی"۔ (طبری ج ۴ ص ۳۵۶)

میری نظر میں ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ یزید کے بیٹے معاویہ نے خود کو خلافت سے الگ کیا' یزید و معاویہ پر لعنت بھیجی اور حق کو حسینؑ اور علیؑ کی طرف واپس کر دیا۔ اسلئے حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا اثر یہ تھا کہ اس نے نفاق کے پردہ کو چاک کیا اور سلطنت کا حساب عملی طور پر دین سے جدا کر دیا۔ اگر حادثۂ کربلا نہ ہوتا تو بنوامیہ دین کے نام سے لوگوں پر حکومت کرتے۔ البتہ ان کے یوں دین سے چپک جانے کو چند لوگوں کی نظریں انہیں بری الذمہ ٹھہراتیں مگر زیادہ تر لوگوں کی نظروں میں یہ عمل دین کو آلودہ کر دیتا۔

قیام حسینی کا کم از کم اثر یہ تھا کہ خلفاء اور دین ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

اس قیام کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ امام حسینؑ کی محبوبیت کا درجہ حدِّ معمول سے زیادہ بلند ہو گیا۔ واقعاً امامؑ جہانِ اسلام میں "شہید اُمت" اور "فداکاری کے قہرمان" کے طور پہچانے جانے لگے۔ آپؑ ایک مقدس قوت کی صورت میں سامنے آئے۔ اور اس آیت کا مصداق بن گئے: "انَّ الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودّاً"۔ "بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے' عنقریب رحمان اُن کیلئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا"۔ (سورۂ مریم ۹۶)

طبری ج ۴' ص ۳۴۶ اور مقتل خوارزمی ج ۲' ص ۳۴ پر ہے کہ خود امامؑ نے

روز عاشورا فرمایا: "وأیم الله انی لأرجو ان یکرمنی الله بهوانکم"۔
"خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ خدا تم کو ذلیل کر کے مجھے عزت بخشے گا"۔

۳۷۔ آقائے صالحی کے عقیدہ کی رو سے جہاں جہاں امامؑ نے اپنے اقوال میں تسلیم ہونے سے منع فرمایا ہے، اس سے آپکی مراد ابن زیاد کے حضور تسلیم ہے اور یہ یزید کی بیعت سے جدا ہے۔ ان کے خیال میں امامؑ یزید کی بیعت کرنے کے لئے آمادہ تھے لیکن بغیر کسی شرط و مقدمہ کے ابن زیاد کے سامنے تسلیم ہونے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ یقین رکھتے تھے کہ آپؑ کو ہر صورت میں ذلت کے ساتھ شہید کر دیا جائیگا۔

۳۸۔ آقائے غفاری نے کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے مقدمہ میں قیام حسینیؑ سے متعلق سوالات اس طرح سے اٹھائے ہیں کہ آیا امامؑ کا یہ کام بیعت سے فرار کی وجہ سے تھا؟ یا کوفہ والوں کی دعوت اسکا سبب تھی؟ یا پھر اسکا مقصد قیام، انقلاب اور شورش برپا کرنا تھا؟ اس قسم کے سوالات مطرح کرنے کے بعد خود تیسری صورت کو انتخاب کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہو جاتے ہیں کہ کچھ ایسے اسباب اور مقدمات پیدا ہو گئے تھے کہ امامؑ پر قیام اور اقدام کرنا وجوب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور کچھ ایسے آثار اور قرائن ہیں کہ امامؑ پہلے سے ہی کسی نہضت اور انقلاب کی فکر میں تھے۔
لیکن معاویہ کے دور میں بھی کچھ واقعات پیش آئے تھے:

(الف) سب سے اہم ترین بات خلافت کو موروثی قرار دینا تھا کہ یہ سب سے بڑی بدعت شمار ہوئی اور اس کا مقصد در حقیقت ابو سفیان کی دیرینہ آرزو کو جامۂ عمل پہنانا تھا۔ "تلقفوها تلقّف الكرة، اما والّذی یحلف به ابو سفیان لا جنّه و لا نار"۔ ایسی بدعت کے سامنے سکوت اختیار کرنا جائز نہیں تھا۔

(ب) شیعوں کے ساتھ رویہ صلح امام حسنؑ کی قرارداد کے برخلاف حد سے زیادہ سخت اور ناقابل تحمل تھا۔ بنوامیہ کی سیاست تشیع کے اساس کی ریشہ دوانی کرنا تھی۔ معاویہ ایک حکمنامہ میں لکھتا ہے: "من اتهمتموه بموالاة هؤلاء القوم فنكّلوا به واهدموا داره"۔ "جہاں بھی یہ گمان ہو کہ اس قوم کا طرف دار ہے، اس کو عبرتناک سزا دو اور اس کے گھر کو ویران کردو"۔ اپنے ایک اور حکم میں لکھتا ہے: "انظروا الیٰ من قامت علیه البینةُ انّه یُحبُّ علیّاً واهل بیته فامحوه من الدیوان واسقطوا عطاءهُ ورزقه"۔ "نگرانی رکھو، جہاں بھی یہ ثابت ہو جائے کہ وہ علیؑ اور ان کے خاندانؑ کا دوست اور محبّ ہے، اس کا نام رجسٹر سے مٹا دو، اس کے حقوق اور روزانہ کی خوراک کو بند کردو"۔ (ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۵ چھاپ مصر)

(ج) رسمی طور پر نماز جمعہ کے خطبوں میں حضرت علیؑ پر سبّ و لعن کو رواج دینا۔

(د) شیعوں کی شہادت اور گواہی قبول نہ کرنا اور ان کو اجتماعی حقوق سے محروم رکھنا۔

(ھ) شیعہ اکابرین جیسے حجر بن عدی اور رشید ہجری کو شیعہ ہونے کے جرم میں قتل کرنا۔

(و) بنوامیہ کی اپنے حق میں جھوٹی تبلیغات اور معاویہ کو اس طرح سے صحابہ کبار کی صف میں قرار دینا۔ اگر یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہتا تو ایک دن ایسا بھی آجاتا کہ لوگ معاویہ کے بتائے ہوئے اسلام کے علاوہ اسلام کو نہ پہچانتے۔ لیکن امام حسینؑ کے پہلے سے ہی قیام کرنے کا قصد رکھنے نے بنوامیہ کے مکر و فریب کی قلعی کھول دی اور اسلام کو اس ناقابل تلافی نقصان سے بچالیا۔

مقدمتاً یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت امیرؑ، حضرت حسن مجتبیٰؑ اور حضرت سید الشہداءؑ کی روش، درحقیقت ایک کلی اصول کی تابع تھی۔ یہ حضراتؑ اپنے آپ کو مستحق خلافت سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود خود

خلافت کے غصب ہونے پر قیام نہ کرنا' دراصل اس اصول کی پیروی تھی جو حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے موقع پر بیان فرمایا تھا :

''واللہ لَاُسلِمنّ مَا سَلِمت اُمورُ المسلمین ولم یکن فیھا جور الا علیّ خاصۃ[۱]''۔ ''خدا گواہ ہے کہ میں اس وقت تک حالات کا ساتھ دیتا رہوں گا جب تک مسلمانوں کے مسائل ٹھیک رہیں اور ظلم صرف میری ذات تک محدود رہے''۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۷۴)

امر بہ معروف کی یادداشت نمبر ۲۳ کی طرف رجوع کریں۔

تیسرا باب

حضرت امام حسین علیہ السلام
اور
حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام

امام حسین علیہ السلام اور عیسیٰ مسیح علیہ السلام

سید الشہداءؑ کی ولادت

۱۔ "قال انی عبداللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیاً ☆وجعلنی مبارکاً این ماکنت واوصانی بالصّلوۃ والزکوٰۃ مادمتُ حیّا ☆برّاً بوالدتی ولم یجعلنی جبّاراً شقیّا☆والسلام علیّ یوم ولدتُ ویوم اموتُ ویوم اُبعثُ حیّا"

"(عیسیٰؑ نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور جہاں بھی میں رہوں مجھے بابرکت قرار دیا ہے اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوۃ کی وصیت کی ہے اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن و سلوک کرنے والا بنایا ہے اور ظالم و بد نصیب نہیں بنایا ہے اور جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ اٹھایا جاؤں گا' مجھ پر سلام ہے"۔(سورۂ مریم آیت ۳۰ تا ۳۳)

۲۔ مسیحیوں میں حضرت عیسیٰؑ اور امت اسلام میں حضرت امام حسینؑ کے درمیان کچھ چیزیں مماثلت رکھتی ہیں ان میں سے ایک مماثلت ماں کے حوالے سے ہے کہ حضرت مریمؑ سیدۃالنّساء ہیں اور اسی طرح حضرت زہراء(س) بھی ہیں ۔حضرت مریمؑ کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"واذقالت الملائکۃ یامریم ان اللہ اصطفٰکِ وطھّرکِ واصطفٰکِ علی النساء العالمین"۔"اور اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے مریم کو آواز دی کہ خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دیدیا ہے"۔(سورۂ آل عمران ۴۲)

احادیث میں اسی طرح کا خطاب حضرت زہراء (س) کے لئے بھی واقع ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے :

فانّ مریم احصنت فرجها وجاء ت بعیسیٰ کبدر الدّجیٰ
فقد احصنت فاطم وَجُهها وجاء ت بسبطی نبیّ الهدیٰ

"حضرت مریمؑ نے اپنے دامن کو آلودگیوں سے پاک رکھا اور حضرت عیسیٰؑ کو جو تاریک راتوں کے ماہ تابان ہیں' دنیا میں جنم دیا۔ حضرت فاطمہؑ نے بھی اپنی صورت کو (خدا کے علاوہ) چھپا کر رکھا اور پیغمبر اکرمؐ کے دو نواسوں کو جنم دیا"۔

حضرت مریمؑ اس امت کی صدیقہ ہیں : "ماالمسیح ابن مریم الارسول قد خلت من قبله الرسل وامُّهُ صدّيقةٌ کانا یأکلان الطعام"۔ "مسیح بن مریم کچھ نہیں تھے' سوائے اِسکے کہ ہمارے رسول تھے۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے اور ان کی ماں صدیقہ تھیں۔ دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھایا کرتے تھے)۔ سورۂ مائدہ آیت ۷۵"۔

حضرت زہراء (س) بھی اِس امت کی صدیقۂ طاہرہ ہیں۔ دونوں ذوات کے لئے "بتول" و "عذرا" کے القابات ذکر ہوئے ہیں۔

۳۔ حضرت امام حسینؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں ایک اور شباہت' حمل کی مدت کے حوالے سے ہے۔ حدیث میں ہے کہ سید الشہداء کی پیدائش کے وقت حضرت زہراؑ کا مدت حمل چھ ماہ تھا۔ کوئی بھی بچہ چھ مہینے کا پیدا نہیں ہوا ہے اور اگر پیدا ہوا ہے تو زندہ نہیں رہا ہے' سوائے حسین اور عیسی علیہما السلام کے۔ حدیث میں ہے کہ یہ آیت امام حسین علیہ السلام کی شان میں وارد ہوئی ہے : "ووصيّنا الانسان بوالديه احساناً حملتهُ امّه كُرهاً وَضَعَتهُ

كرها و حمله وفِصالُهُ ثَلاثُون شهراً حتّٰى اذا بلغ اشُدّه وبلغ اربعين سنة قال ربّ اوزعنی ان اشكر نعمتك الّتی انعمت علیّ وعلی والدّی وان اعمل صالحاً ترضيٰه واصلِح لی فی زرّيتی انّی تبتُ اليك وانی من المسلمين"۔ "اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی نصیحت کی ہے کہ اس کی ماں نے بڑی سختی میں اسے شکم میں رکھا اور پھر بڑی تکلیف سے جنم دیا۔ اور اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کا کل زمانہ تیس مہینے کا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ توانائی کو پہنچ گیا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے دعا کی کہ پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے اور ایسا نیک عمل کروں کہ تو راضی ہو جائے۔ اور میری زریت میں بھی صلاح و تقویٰ قرار دے کہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوں اور تیرے فرمانبردار بندوں میں ہوں"۔ (سورۂ احقاف آیت ۱۵)۔

روایت میں ہے کہ یہ آیت سید الشہداءؑ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ برّاً بوالدتی تھے، یعنی اپنی والدہ پر بہت مہربان تھے اور حسینؑ بھی ووصيّنا الانسان بوالدته احساناً تھے۔ عیسیٰؑ نے کہا: "انی عبدالله" ("میں اللہ کا بندہ ہوں") ، حسینؑ کے بارے میں نازل ہوا: "انی من المسلمين"۔ ("میں اللہ کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں")۔

مکہ کے حاکم، عمرو بن سعید بن عاص اشدق نے سید الشہداءؑ کے نام ایک خط میں لکھا: "وحذره من النفاق والشّقاق" ۔ "اور اُس کو نفاق اور جھگڑا کرنے سے دور رکھو"۔ حضرت نے خط کے جواب میں لکھا: "لم يشاقق الله ورسوله من دعا الی الله وعمل صالحاً و قال انی من المسلمين

"جو شخص خدا کی طرف دوسروں کو دعوت دے اور اچھے اعمال انجام دے اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں' وہ خدا اور رسول سے نزاع اور جھگڑا نہیں کرتا"۔ امام کا یہ جواب اشارہ ہے اس آیت کریمہ کی طرف کہ :

"ومن احسن قولاً ممّن دعا الیٰ الله وعمل صالحاً وقال انّنی من المسلمین"۔ "اور اس سے زیادہ بہتر بات کس کی ہوگی جو لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں اس کے اطاعت گزاروں میں سے ہوں"۔ (سورۂ فصلّت آیت ۳۳)

حضرت عیسیٰؑ کے وقت حضرت مریمؑ کی مدتِ حمل ایک روایت میں نو گھنٹے اور نو دن بھی بتلائی گئی ہے [۱۰]۔ اس بارے میں کتاب "جلوۂ مسیح" کی طرف رجوع کریں۔

حضرت سید الشہداءؑ کا یومِ تولد اگر تین شعبان تسلیم کیا جائے اور حضرت حسن مجتبیٰؑ کی ولادت نیمہ رمضان ہو' تو بعض روایات میں یہ جو ذکر ہے کہ آپؑ دونوں کی پیدائش کے درمیان فاصلہ چھ مہینے اور دس دن ہے' اس لحاظ سے ۳/ شعبان کی تاریخ کا درست ہونا ممکن نہیں ہے۔ چھ ماہ اور دس دن والی بات کے لحاظ سے تو وہی روایت درست ہے جس میں حضرت کا تولد ربیع الاول کے آخر میں بتلایا گیا ہے۔ (اس کے بارے میں تفصیل کیلئے "نفس المہموم" کی طرف رجوع کریں)۔

۴۔ حسین و عیسیٰ علیہم السلام میں ایک مماثلت ان دونوں سے متعلق لوگوں

۱۰۔ ضمناً ایک اور مماثلت کا بھی ذکر کر دوں کہ عیسیٰ و حسین علیہم السلام کی مادرانِ گرامی کے وضع حمل کے طریقہ میں بھی شباہت پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ دونوں رنج اور پریشانی کے عالم میں پیدا ہوئے۔ تاہم حضرت مریم اس لئے پریشان اور رنجیدہ تھیں کہ ان پر فرشتہ ظاہر ہوا تھا جس نے کہا: انّی اعوذ بالرحمن منك ان کنت تقیاً اور یہ بھی کہا: یالیتنی متُّ قبل هذا جبکہ حضرت زہراء (س) اسلئے رنجیدہ تھیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ خبر دی تھی کہ ان کا فرزند شہید ہوگا' اور جب ان سے یہ کہا گیا کہ آئمہ اور اوصیاء ان کی نسل سے ہونگے تو راضی ہو گئیں۔

کے عقیدہ میں ہے۔ دونوں کے بارے میں لوگوں نے مسئلہ "تفدیہ" پیدا کیا ہے [۱]، اور یہ خیال کیا ہے کہ یہ دونوں شہید اسلیئے ہوئے ہیں تاکہ دوسروں کے گناہوں کو اپنی گردن پر لے لیں اور دوسرے آزاد رہیں اور ان سے تکلیف ساقط ہو جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تو خود شہادت کی بات ہی جھوٹ ہے اور حضرت سید الشہداءؑ کی شہادت کا فلسفہ یہ نہیں تھا۔ بہ قول مولویؔ: "ز آنکه از قرآن بسی گمرہ شدند......"۔ "جو قرآن سے دور ہوا، وہ گمراہ ہو گیا" اِن دونوں ذوات کے درمیان ایک اور شباہت پاک و پاکیزہ اور بابرکت ہونے کے حوالے سے ہے، یعنی دونوں کا وجود حد سے زیادہ بابرکت تھا۔ [۲] برکت کے معنی ہیں خیر و اچھائی میں نمو و زیادتی، جیسا کہ مجمع البیان اور تفسیر صافی میں ملتا ہے۔ مفردات راغب میں ہے: "ولمّا كان الخير الا لهى يصدر من حيث لا يحسّ وعلى وجه لايحصىٰ ولايحصر قيل و كل مايشاهدمنه زيادة غيرمحسوسة هومبارك وفيه بركة"۔ "چونکہ خیر الٰہی وہاں سے آتی ہے کہ جہاں سے آنے کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا اور بے حد و حساب آتی ہے، اسلیئے جہاں بھی خیر غیر محسوس جگہ سے زیادہ دیکھنے میں آئے، اس کو مبارک کہا جاتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے"۔ جس طرح ایک زمین مبارک ہوتی ہے، جیسے فلسطین کی زمین: "و بارکنا حوله......" (سالہا سال سے یہ دعویٰ کیا جاتا رہا ہے کہ اسرائیل نے

۱۔ المنجد میں ہے: "الفادی" حضرت مسیح کا لقب جس کے معنی ہیں وہ کہ جس نے اپنے خون کو دوسروں پر فدا کیا۔

۲۔ تحف العقول میں ص ۳۹۶ پر خداوند عالم کی حضرت عیسیٰؑ سے متعلق مناجات کے ضمن میں لکھا ہے: "يا عيسىٰ اوصيك وصية المتحنّن عليك بالرحمة حتىٰ حقّت لك الولاية بتحرّك منى المسرّة، فبوركت كبيراً، وبوركت صغيراً حيثُ ماكنت". "اے عیسیٰ میں تم کو سفارش کرتا ہوں، اس بات کی سفارش کہ تم مہربان اور دلسوز رہو تاکہ میری رضامندی حاصل کرو اور مجھ سے ملنے کے سزاوار بن جاؤ تم بچپن میں بھی بابرکت تھے اور بڑے ہو کر بھی بابرکت ہو، جہاں بھی گئے برکت والے بن گئے"۔

ایران کے پیٹرول کے برابر وہاں کے مرکبات سے فائدہ اٹھایا ہے) اور جس طرح کچھ پانی بابرکت ہوتے ہیں جیسے بارش کا پانی "ونزّلنا من السماء ماءً مبارکاً" ۔ "اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ہے" اور جس طرح کچھ حیوان مبارک اور بابرکت ہیں جیسے بھیڑ، اسی طرح بعض انسانوں کا وجود بھی واقعاً "مبارک" ہوتا ہے اور یہ ان کے بارے میں خوشامد نہیں ہے، یہ ویسی ہی زمین کی طرح ہوتے ہیں جو سال بھر محصول دیتی ہے اور ویسی ہی بارش ہوتے ہیں جو ہمیشہ برستی رہتی ہے۔

فُطرس مَلَك کا واقعہ وجود بابرکت سید الشہداءؑ کا ایک رمز ہے۔ جس کا پَر ٹوٹ چکا ہو، آپؑ سے اگر مل جائے تو صاحب پَر ہو جاتا ہے۔[1] قوم و ملت اگر صحیح معنوں میں اپنے آپ کو حسینؑ کے گہوارہ سے متمسک کردے تو ہر قسم کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔

امروز ہمہ روی زمین رشک برین شد تا از صدف پاک خدا دُرّ ثمین شد
فرمان خدا وند بہ جبرئیل امین شد باخیل ملَک از عرش تازان بہ زمین شد

تا عرضہ دھد تہنیت حضرت خاتم

صبح ازل از غیب بر آورد تنفس انوار ہدی تافت بر آفاق و بر انفس
تا چند دلا راندہ ای از صُقع تقدس برخیز و فرا گیر پر و بال چو فطرس

بر تہنیت مقدم مولود مکرم[2]

---

[1]۔ اسی طرح یہ حدیث: "جعل الشفاء فی تربتہ والا جابة تحت قبته والائمة من ذرّیته" آپؑ کے مبارک اور بابرکت ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔

[2]۔ یہ پورا قصیدہ کتاب "سرمایۂ سخن" کی تیسرے جلد میں سید الشہداءؑ کی ولادت کے سلسلہ سے ذکر ہوا ہے اور یہی دو بند سب سے بہتر ہیں۔

بے شک حسینؑ کا مکتب اس امت کے لئے راہ نجات ہے' اسلئے کہ حسینؑ کی کرسی امر بہ معروف و نہی از منکر کی کرسی ہے۔ سورۂ الشعراء سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پیغمبروں کا ظہور زمانوں میں مفاسد ظاہر ہونے کی وجہ سے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حسینؑ کا مکتب حسینؑ کے ظہور سے ہر زمانہ میں زندہ وپائندہ رہتا ہے یعنی ہر سال اور ہر محرم میں امام حسینؑ ایک عالمی مصلح کی صورت اختیار کر کے ظہور فرماتے ہیں اور اس فریاد کو لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے ہیں :

"الا ترون ان الحق لایعمل بہ......"۔ "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہورہاہے......" یا یہ کہ: "الموت اولیٰ من رکوب العار......"۔ "ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے......"۔

یہ بھی امام حسینؑ سے منسوب ہے :

سبقت العالمین الی المعالی   بحسن خلیقة وعلوّھمة

ولاح بحکمتی نورالھدیٰ فی   دیاجی من لیالی مدلھمّة

یریدالجاحدون لیطفئوہٗ   ویأبی اللہ اِلّا ان یُتّمه

"حسینؑ نے اپنی خوش خلقی اور بلند ہمتی کے ذریعے مقام حاصل کرنے میں تمام دنیا والوں پر سبقت لی اور تاریک ترین راتوں میں اپنی حکمت سے نورِ ہدایت کو روشن کیا۔ منکرین چاہتے ہیں کہ اس نور کو خاموش کردیں مگر خدا نے یہی چاہا کہ یہ تمام اور کامل ہو جائے"۔

۵۔ ان دونوں ہستیوں میں ایک اور شباہت یہ ہے کہ مسیحی اور مسلمان دونوں ہی اپنے ان رہبروں کی ولادت اور وفات وشہادت کے دنوں کو عظیم شمار کرتے ہیں۔ فرق صرف اس میں ہے کہ مسیحی دونوں موقعوں پر عیاشیوں، رقص

اور شراب خوری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔[1] جبکہ مسلمان ہر دو موقعوں پر اس قسم کے کاموں سے منزہ و پاک رہتے ہیں۔ مسلمان عظیم الشان طریقے سے لیکن تمام تر تقدس اور احترام ملحوظ رکھتے ہوئے جشن ولادت مناتے ہیں چونکہ اسلام بیہودہ کاموں اور لہو ولعب کی اجازت نہیں دیتا، اور وفات کے موقع پر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ روز عروج یعنی حضرتِ عیسیٰؑ کے قتل ہونے کے تین دن بعد کے دن کو بطور خوشی مناتے ہیں۔ (نمبر ۷ اور ۸ کی طرف رجوع کریں)

شاید حضرت عیسیٰؑ اور سید الشہداءؑ کے درمیان ایک اور شباہت ہو اور وہ یہ ہے کہ ان سے قبل یہ دونوں نام کسی کا کے نہ تھے۔ شاید یہ صورت حضرت یحییٰؑ سے مربوط تھی، نہ کہ حضرت عیسیٰؑ سے۔ اس صورت میں پھر یہ حضرت سید الشہداءؑ اور حضرت یحییٰؑ کے درمیان شباہت ہے۔ جسطرح سے یہ دونوں حضرات شہادت میں مماثلت رکھتے ہیں اسی طرح انکی شہادت بھی بہت زیادہ فاسد و فاجر شخص کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے اور دونوں ہی شہیدِ امر بہ معروف و نہی از منکر ہیں "وان من هوان الدنیا انّ رأس یحیی بن زکریا اهدِیَ اِلیٰ بغیّ من بغایا بنی اسرائیل"۔ "اور دنیا کی پستی یہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا کے سر کو بنی اسرائیل کے ایک بدکار سرکش کے لئے ہدیہ بھیجا گیا۔"

۶۔ ان دونوں میں ایک اور شباہت انصار و حواریوں کے لحاظ سے بھی ہے "کما قال عیسی بن مریم للحوّاریّن مَن انصاری الیٰ الله......"۔ "عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا تھا کہ اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون

---

[1] البتہ مسیحی کرسمس کی رات اپنے روحانی پیشوا کے حضور ایک قسم کی دعا بھی کرتے ہیں۔

ہے ؟"۔(سورۂ صف ۱۴)

سید الشہداءؑ نے بھی شب عاشورا اپنے حواریوں کا انتخاب کیا۔ صاحبِ کتاب "انوار البہیۃ" ص ۴۵ پر امام موسیٰ بن جعفرؑ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: "و فی وصیّة موسی بن جعفر علیهماالسلام لهشام قال:وقال الحسینؑ بن علی علیهما السلام :انّ جمیع ما طلعت علیه الشمس فی مشارق الارض ومغاربها بحرها و برّها وسهلها و جبلها عند ولیّ من اولیاء الله واهل المعرفة بحقّ الله کفیٔ الظّلالِ ـثم قال ؑ:الاحُرّیدع هذه اللّما ظَةَ لاهلهاليس لانفسكم ثمن الاالجنه فلا تبیعوها بغیرهافانه من رضی من الله بالدنیا فقدرضی بالخسیس" ۔

"حضرت موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کی ہشام سے وصیت کے ضمن میں آیا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ نے فرمایا: وہ تمام چیزیں کہ جن پر سورج کی روشنی پڑتی ہے خواہ وہ مغرب و مشرق کی زمین میں ہو' دریا و خشکی میں ہو' ہموار زمین پر ہو یا پہاڑوں پر' سب کی سب ولیٔ خدا ہیں اور اہل معرفت کے نزدیک ایک سایہ کی مانند ہیں۔ آیا کوئی آزاد انسان ایسا پیدا ہو سکتا ہے جو اس چبائے ہوئے لقمہ سے ہاتھ اٹھائے ؟ تمہارے لئے بہشت کے علاوہ کوئی اور قیمت نہیں ہے۔ پس اپنے آپ کو بہشت کے علاوہ کسی اور چیز کے عوض نہ بیچو۔ جو بھی خدا سے اس دنیا کے ملنے پر راضی ہوا' وہ پست چیز پر راضی ہوا"۔

مولوی نے مثنوی کی تیسری جلد میں مریم کے لئے روح القدس کے ظہور کی داستان بہت کوب بیان کی ہے۔

امام حسینؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی شباہت کا اجمالی خلاصہ : دونوں کی ماں سیدة النساء تھیں' صدیقہ تھیں' بتول اور عذرا تھیں' ملائکہ کی مخاطب تھیں'

مدت حمل میں اور کراہت حمل میں دونوں مادران مشابہ تھیں۔ یہ دونوں حضرات والدین کے ساتھ اچھابرتاؤ کرنے میں "انی عبداللہ" اور "انی من المسلمین" ہونے میں' فدیہ ہونے کے اعتقاد میں' بابرکت ہونے میں' ولادت اور وفات کی حرمت میں' ان کے نام ان سے پہلے کسی کے نام نہ ہونے میں اور انصار اور حواریوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثل ہیں جبکہ سید الشہداءؑ کی شہادت جنابِ یحییٰ کی شہادت سے مماثلت رکھتی ہے۔

۷۔ جیساکہ ہم نے نمبر ۵ میں ذکر کیاکہ ہم مسلمان اور مسیحی دونوں سید الشہداءؑ اور حضرت مسیحؑ کی ولادت اور وفات کو بڑی حرمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ لوگ دونوں موقعوں پر جشن مناتے ہیں اور ہم فقط ولادت امامؑ کے موقع پر جشن مناتے ہیں و شہادت پر سوگواری و ماتم کرتے ہیں۔اس کے برعکس اُن کے ہاں اُن کے عقیدہ کی روسے (کہ حضرت مسیحؑ نے مرنے کے تین دن بعد عروج کیا)' یہ دن بھی بطور جشن منایا جاتا ہے اور ان کا یہ جشن قومی اور ملّی تہوار کی طرح سے ہوتا ہے' یعنی روحانیت ' معنویت اور اخلاق سے خالی۔ سب لوگ ناچنے گانے 'شراب و مستی' پیر پٹخنے ' تالی بجانے اور فسق وفجور میں مشغول ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمان جشنِ ولادتِ حسینی معنوی شکوہ کے ساتھ مجالس وعظ و خطابت کے اہتمام کے ذریعے 'خوشی کے آنسو بہاکر اور اسے خدا سے تقرب کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر تعلیم وتربیت کی صورت میں مناتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جس زمانہ میں' میں قم میں رہتا تھا وہاں پر محمد مسعود کی ایک کتاب پڑھی تھی۔اس میں مسیحیوں کے حضرت عیسیٰؑ کے قتل ہونے کے دن کو خود ان کے گمان کے تحت (لیکن ہمارا عقیدہ جو قرآن سے لیا گیا ہے' یہ ہے: "وَ

ما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شُبَّہَ لھم"۔ "نہ انہیں قتل کیا گیا' نہ صلیب پر چڑھایا گیا بلکہ معاملہ کو ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا") منانے اور ہمارے حضرت اباعبداللہ کی شہادت منانے کا موازنہ کیا ہوا تھا اور مسیحیوں کے عمل کو ترجیح دی تھی' اس لحاظ سے کہ وہ لوگ اپنے پیشوا کی شہادت کو کامیابی شمار کرتے ہیں اور ہم شکست۔ لہٰذا وہ لوگ خوشی مناتے ہیں اور ہم گریہ کرتے ہیں۔ بعد میں میں نے یہ اعتراض دوسرے لوگوں سے بھی سنا جو ان کے آگے بڑھ جانے اور ہمارے پیچھے رہ جانے کا یہی ایک رمز بتلاتے تھے۔ ان کے جواب میں میں عرض کرتا ہوں کہ اعتراض کرنے والے ایک نکتہ سے غافل رہ گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم واقعہ کو فقط شخصی اور فردی اخلاق کے مقیاس و میزان سے دیکھیں' تب تو مطلب وہی ہے جو ان حضرات نے ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے تو خود اسلام کی منطق کی رو سے بھی شہادت کامیابی ہے' نہ کہ شکست۔ مگر ایسا نہیں تھا کہ حضرت علیؑ ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے تھے اور فرماتے تھے: "لالف ضربۃٍ بالسیف اھون علیّ من میتۃ علی فراش......"۔ "میرے لئے تلوار کی ہزار ضربتیں کھانا بستر پر مرنے سے بہتر ہے" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۳)۔ کیا امام علیؑ نے یہ نہیں فرمایا: "واللہ لابن ابی طالب آنسُ بالموت من الطفل بثدی امّہِ"۔ "خدا کی قسم ابو طالب کا فرزند موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے مانوس ہوتا ہے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵)۔ کیا ابن ملجم مرادی سے ضربت کھانے کے فوراً بعد آپؑ نے نہیں فرمایا: "فزتُ و ربّ الکعبہ"۔ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا"۔ (مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۱۲)۔ جب بستر پر پڑے تو اس وقت کیا نہیں فرمایا: "وما کنتُ الا کقارب ورد

وطالب وجد"۔ "میں تو اس شخص کے مانند ہوں جو رات بھر پانی کی جستجو میں رہا ہو اور صبح کو چشمہ پر وارد ہو جائے اور تلاش کے بعد اپنے مقصد کو پا لے"۔ (نہج البلاغہ مکتوب ۲۳)۔ کیا سید الشہداءؑ نے نہیں فرمایا تھا: "و ما اولهنی الی اسلافی اشتیاق یعقوب الی یوسف"۔ "لہوف ص ۲۵) "میں کس قدر شوق رکھتا ہوں اپنے بزرگوں سے ملنے کا جسطرح یعقوب یوسف سے ملنے کا شوق رکھتے تھے"۔ کیا آپؑ نے نہیں فرمایا تھا: "لا اری الموت الاّ سعادةً ولا الحیوة مع الظالمین الا برماً"۔ "میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ان ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا عذاب جان خیال کرتا ہوں"۔ (تحف العقول ص ۲۴۵)۔

اس مفہوم کو ایک دوسرے ترازو میں تولنا چاہئے اور وہ ہے اجتماعی ترازو۔ تمام مسیحی اصولوں میں مل کر بھی شاید ایک خالص اجتماعی اصول پیدا نہ ہو[1] اگر اسلام میں اجتماعی تعلیمات کا ایک سلسلہ ہے۔ اسلام میں منطقی حب و بغض کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے۔ ائمہ اطہارؑ عزائے حسین بن علیؑ کو قائم کرنے کا جو حکم دیتے ہیں جیسا کہ ہم سنہ ۸۲ کی عاشورا کے تقریروں میں (بعنوان "خطابہ اور منبر"[2]) بتا چکے ہیں کہ یہ حضرت زہراء (س) کے قلب کی تشفی کے لئے نہیں ہے۔ حضرت زہراء (س) کی شان ان کاموں سے بہت بلند و بالا ہے۔ بلکہ عزا کا یہ قیام حضرت سید الشہداءؑ اور حضرت زہراء (س) کی جو نیت تھی، اسکے احیاء کے لئے ہیں۔ ہم اس لحاظ سے اظہار رنج کرتے ہیں کہ کیوں ایسا حادثہ رونما ہوا۔ یہ عزا "آخ" کے برابر ہے کہ کہیں دوبارہ ایسا حادثہ نہ رونما

۱۔ کتاب "تحف العقول" کے آخر میں ظلم سے متعلق کچھ دستورات حضرت عیسیٰؑ سے نقل کئے گئے ہیں۔

۲۔ ان تقریروں کو کتاب "دہ گفتار" مؤلف استاد شہید میں چھاپا گیا ہے۔ (اردو ترجمہ جامعۂ تعلیمات اسلامی کی شائع کردہ کتاب "گفتار عاشورا" میں موجود ہے"۔)

ہو جائے۔ یہ عزاداری مبارزہ کی روح کو تقویت دینے کے لئے ہے۔ البتہ شہادت کا احترام کرنا ضروری ہے۔ جشن شہادت بھی اگر معنوی اور اخلاقی شکل میں ہو، نہ کہ اس طرح جیسے آج کل کرسمس کا تہوار منانے کا معمول ہے، تو ممکن ہے اس میں جہاد کی تشویق ہو۔ لیکن تنہا تشویق کافی نہیں ہے، حب اور بغض باہم ایکساتھ ہونا چاہئے تاکہ انسان کے اندر مبارزہ کی روح پیدا ہو جائے [۱]۔ عزاداری، روحِ مبارزہ کا احیاء اس طرح سے ہے کہ ہم ہمیشہ ظلم اور کفر کے مظاہر پر لعن و نفرین کرنا اپنا فرض جانیں اور ان کے قلع و قمع کے آرزو کی تلقین کرتے رہیں۔ جیسا کہ ہم ہمیشہ (دوران حج) رمی جمرات میں شیطان کو مجسم فرض کر کے اس کو پتھر مارتے ہیں۔ یہاں غرض فقط مرنے کی تلقین کرتے رہنا نہیں ہے، فقط مرنے کی آرزو کرنا اچھا نہیں ہے۔ یہاں غرض شہادت کی آرزو ہے اور شہادت کی آرزو اس وقت حقیقی ہو سکتی ہے جب انسان اپنے آپ کو مخالف کے مقابل صف میں دیکھے اور ان کی پیش قدمی اور ان کے منصوبہ زیر عمل ہونے سے قبل اجتماع میں اثر پیدا کر دے، اور اپنے اشک شوق سے عالی انسانیت کے نمونہ لوگوں کے لئے، کفر اور ظلم کے مظاہر کے روبرو، اپنے غصہ کی آگ کا دہانہ کھولے۔ ہم "تعلیمات اجتماعی" کے صفحوں پر [۲] "منطقی حب و بغض" کے مقابل میں "عاطفی حب و بغض" کی تفصیل انشاء اللہ عرض کریں گے۔

پس شہادت کو اگر ہم انفرادی ترازو میں تولیں تو کامیابی شمار کرنا چاہئے اور

---

[۱]۔ دوسرے الفاظ میں عزائے حسینی کا مکتب فقط تاثر کا مکتب نہیں، انقلاب و قیام کا مکتب ہے۔ طول تاریخ میں یہ واقعہ بہت سے انقلابات کے لئے بنیاد بنا ہے۔ ظلم کے بلند و بالا قصور کو حادثۂ کربلا کے برملا تاثر اور منطقی اور اجتماعی بغض نے درہم برہم کیا ہے اور آئندہ بھی برہم ہونگے۔

[۲]۔ ان صفحوں کے مطالب آئندہ استاد شہید کی یادداشتوں کی ذیل میں بیان ہونگے۔

اسکے لئے جشن کریں اور خوشی منائیں۔ لیکن اگر اجتماعی ترازو پر تولیں گے تو ہو سکتا ہے ایک لحاظ سے اس میں جامعہ کو شکست نظر آئے ایسا جامعہ ایک پست جامعہ اور معاشرہ ہوتا ہے جسکے بارے میں خود سید الشہداءؑ نے فرمایا: "وعلی السلام السلام اذ قدبلیت الامة براع مثل یزید"۔ (مقتل مقرم ص ۱۴۶) اور اس طرح کے دوسرے کلمات۔ اجتماعی مصالح کی رو سے ہماری یہ عزاداری روحِ مبارزہ کی تجدید اور احیائے راہ حق میں نبرد آزمائی ہے اور مکتب گریہ وزاری کی ایجاد و تاثیر طولِ تاریخ میں نہایت مفید اور مؤثر رہی ہے۔

اسی طرح کا ایک بیان ہم نے "العدلُ افضل اَم الجود" کی حدیث کے ذیل میں سنہ ۸۱ء کی ۱۹ رمضان المبارک کی تقریر میں عرض کیا۔ (یہ تقریر کتاب "بیست گفتار" میں چھاپی جاچکی ہے)

۸۔ نکتہ نمبر ۵ کے ذیل میں ہم نے عرض کیا تھا کہ: مسیحیوں کے عقیدہ کے تحت حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ۲۵ دسمبر ہے، یعنی مسیحی سال کے اختتام سے ۶ دن قبل۔ ان کے سال کی ابتداء یکم جنوری ہے۔ ولادت کی عید کو عید کریسمس کہتے ہیں۔ اس دن پوپ حسبِ معمول ہر سال تمام دنیا کے لوگوں کو صلح اور محبت کی دعوت پر مبنی ایک پیام دیتے ہیں اور آخر میں دعا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پوپ کبھی سونے کے تخت سے لوگوں کو فقراء کی حالت پر رحم کھانے کی دعوت دیتے ہیں!!! جشن کریسمس میں دو چیزیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک کاج (صنوبر کی قسم) کا درخت کہ جسے اس جشن کا مظہر اور علامت تصور کیا جاتا ہے۔ ہر مسیحی کے گھر میں اور ان کی اجتماع گاہوں پر ایک درخت یا کم از کم کاج کے درخت کی ایک شاخ دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ ایام

کاج کے درخت کا بازار گرم ہونے کے دن ہوتے ہیں لوگ کاج کا درخت جڑ سے اکھاڑ کر لاتے ہیں اور بعض سالوں میں تو بلدیہ بھی درپے ہوئی تھی اور روکنا چاہا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس درخت کو وہ مختلف قسم کے چراغوں، روشن قمقموں اور رنگارنگ کاغذوں سے سجاتے ہیں۔ دوسری چیز اس جشن میں جو نمایاں ہوتی ہے وہ فادر کرسمس (Santa Claus) ہیں۔ قدیمی سنت کے تحت اس رات ایک بوڑھا شخص کہ جس کے سر اور داڑھی کے بال بہت گھنے اور سفید ہوتے ہیں فادر کرسمس بنتا ہے جو آسمان سے بچوں کیلئے تحفے اور کھلونے لاتا ہے۔ جب بچے سوئے ہوتے ہیں، اسوقت ان کے جوتوں میں یا ان کی جیبوں میں تحائف رکھے جاتے ہیں۔ یوں اس جشن میں بچوں کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔

روزنامہ اطلاعات سنہ ۴۲ھ ش۔ ۳/ دی ماہ کے ص ۱۳ پر لکھتا ہے: "بہت سے عمومی مراکز مثلاً اسٹیڈیم اور ہوٹلوں میں، آج رات کریسمس کی مناسبت سے خصوصی پروگرام رکھتے جاتے ہیں"۔

بنابراین کریسمس کی رات بیہودہ عقائد اور اعمال فسق وفجور کا مجموعہ ہے۔ بحمد للہ ہمارے درمیان نہ اس طرح کے بیہودہ عقائد ہیں اور نہ ہی اس قسم سے فسق وفجور ہوتے ہیں۔

۹۔ نکتہ نمبر ۴ میں ہم نے بتایا تھا کہ مکتب حسینی ہی بلاشک وشبہ اس امت کی نجات کا واحد راستہ ہے کیونکہ دین کی بقا کا سبب امر بہ معروف و نہی از منکر ہے اور یہ دونوں اپنے وسیع معنی یعنی معروف کی تشویق وترویج اور منکرات سے مبارزہ، میں امام حسینؑ سے وابستہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق اسلام نبوی الحدوث اور حسینی البقاء ہے۔

۱۰۔ نکتہ نمبر ۵ میں ہم نے بیان کیا امام حسینؑ کا واقعہ عالم اسلام کیلئے ایک نمونہ اور اس کی یاد مسلمانانِ عالم کیلئے امر بہ معروف و نہی از منکر کی تجدید حیات ہے' ایک ایسا ظہور ہے کہ سید الشہداءؑ سال بھر خطباء وذاکرین یا مصلحین اور صالح انقلابیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۱۔ روزنامہ کیہان' ۴۲ھ ش' چہارم دیماہ (کرسمس کا دن) اخبار لکھتا ہے :
"ایک دو ہفتہ پہلے سے روسی سفارت خانہ کی دیوار کے اطراف اور اسی طرح برطانوی سفارت خانہ کے اطراف اور شہر کی شمالی سڑکوں پر بہت سے صنوبر کے درخت اکھڑے ہوئے تھے۔ یہ تہران میں مسیحیوں کے بڑے تہوار کے نزدیک ہونے کی خبر دے رہے تھے۔ مسیحی حضرات صنوبر کے درخت آراستہ کرنے کے بعد اس کے نیچے شب بیداری کر کے اپنے پیغمبر کا جشن مناتے ہیں۔ کل رات تولد کے وقت (جو مسیحی عقیدہ کے مطابق آدھی رات ہے) سے پہلے وہ کلیسا جاتے ہیں اور دعا و عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے گھروں میں شب کرسمس کے مخصوص کھانے (کہ بہت سے گھروں میں بو قلمون کھانے پکتے ہیں)' کھاتے ہیں۔ مسیحیوں کے کیتھولک فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صنوبر کے درخت کے نیچے پیدا ہوئے تھے۔ (تاہم قرآن کریم میں صریح ارشاد موجود ہے کہ کھجور کے درخت کے نیچے پیدا ہوئے تھے)۔ یہ فرقہ اس درخت کو مقدس جانتا ہے۔ خصوصاً کرسمس کی رات اس کو بہت اچھی طرح خوبصورتی سے سجاتے ہیں اور جنوری کے جشن کے اختتام تک (۹ دن کا تہوار ہوتا ہے) کیتھولک فرقہ کے گھر سجے رہتے ہیں۔ فادر کرسمس نصف رات کو (قصہ کے مطابق) زرّین ٹانگے پر سوار برف پوش زمین پر آتے ہیں تاکہ بچوں کو تحائف دیں۔

گزشتہ شب مسیحی بچوں نے اپنی جرابوں کو بخاریوں کے نیچے یا کسی اور جگہ پر رکھا ہوا تھا تاکہ رات میں فادر کرسمس انکے لئے تحائف ان جورابوں میں چھوڑ جائیں اور آج کی صبح یہ بچے ان تحائف کو حاصل کر کے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں کہ جنہیں عام طور پر مسیحی ماں باپ اپنے بچوں کے لئے مہیا کرتے ہیں (ظاہراً اس قصہ کے گھڑنے کا مقصد حضرت مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنا ہے تاکہ بچوں میں مسیح کی الوہیت کا اعتقاد پیدا کریں)۔ کل رات تہران کے قہوہ خانے بھی ان لوگوں سے بھرے ہوئے تھے جو اپنی کرسمس کی رات اس طرح کی جگہوں پر گزارتے ہیں۔ تہران کے بہت سے غیر مسیحی بھی اپنے مسیحی دوستوں کی دعوت پر یا دعوت کے بغیر ان مراسم میں شریک تھے"۔

خلاصہ یہ ہے کہ شخصیت کے لحاظ سے ان دونوں مقدس وجود کے درمیان کچھ تو واقعی شباہتیں ہیں' جو مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) ماں کے حوالے سے: دونوں کی مادرانِ گرامی سید النساء ہیں' صدیقہ ہیں' ملائکہ کے مخاطب ہونے میں اور بتول و عذرا ہونے میں دونوں میں مماثلت ہے۔

(ب) مدت حمل میں۔

(ج) کراہت حمل میں۔

(د) مبارک ہونے میں: عیسیٰؑ کیلیئے ارشاد ہوا: "وجعلنی مبارکاً"۔ امام حسینؑ کے لئے وارد ہوا: "وجعل الشفاء فی تربته والا جابة تحت قُبَّتِهِ و الائمه فی ذریته"۔ ""خداوند عالم نے ان کی تربت میں شفا رکھی' ان کے قبہ کے نیچے دعا قبول ہوتی ہے اور اماموںؑ کو انؑ کی نسل سے قرار دیا"۔

ایک اور روایت میں ذکر ہوا:

"لولا صوارمهم وقطع نبالهم لم تسمع الآذان صوت مكبّر"۔ "اگر تلواروں اور تیروں سے یہ قطع نہ ہوئے تو کان موذّن کی صدا نہ سنتے"۔

اس کے بر خلاف ان دونوں ہستیوں کے درمیان ایک سلسلۂ شباہت ایسا بھی ہے جو لوگوں کے ان سے سوءِ استفادہ اور سوء تعبیر کی بنا پر ہے۔ کہ لوگوں کی نظر میں دونوں مصداق "یضلّ به کثیراً و یهدی به کثیراً" ہیں۔ (خدا بہت سے لوگوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دی دیتا ہے"۔

اس بارے میں مفصل بحث کیلئے رجوع کریں تفسیر المیزان ج ۳ ص ۳۲۰ :

"المسیح من الشفاء عندالله ولیس بفادٍ۔ "حضرت مسیح شفیعیان میں سے ہیں نہ کہ خود امت کے گناہوں پر فدا"۔

چوتھا باب

قیامِ حسینی میں امر بہ معروف کے عنصر سے متعلق یادداشت

قیامِ حسینی میں امر بہ معروف کے عنصر سے متعلق یادداشت

۱۔ معروف و منکر کے معنی اور امر بہ معروف و نہی از منکر کے معنی۔

""معروف"" میں اسلام کے تمام مثبت اہداف شامل ہیں اور کلمۂ ""منکر"" سے مراد وہ سب کچھ ہے جسے اسلام نے بُرا گردانا ہے۔ پس معروف و منکر کے معنی عمومی تعبیر کے ساتھ ہیں۔ لیکن امر بہ معروف اور نہی از منکر' اگرچہ کہ یہ اصطلاحات امر اور نہی کی عمومی تعبیر کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں لیکن حدیث' فقہ اور اسلامی قطعی تاریخ کی نص کے مطابق اس میں وہ تمام شرعی وسائل شامل ہیں جن سے اسلامی اہداف کے حصول کیلئے استفادہ کیا جاسکتا ہو۔ اس لئے ان سب کے درودیوار کی حفاظت کرنا چاہئے اور سب کو وسعت دینا چاہئے۔

۲۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے امر بہ معروف کی واقعی قدر و قیمت

قرآن و سنت نے اس اصول کو کس قدر اہمیت دی ہے اور قرآن و سنت اس کی کس قدر ارزش کے قائل ہیں؟' اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امر بہ معروف و نہی از منکر کے بارے میں قرآن کریم میں بہت سی آیات موجود ہیں اور اس موضوع پر بڑی عجیب روایات ملتی ہیں۔ پس یہ اصول متن اسلام میں اور مقام ثبوت میں بہت زیادہ محکم اور بے حد قدر و قیمت کا حامل ہے اور تعلیمات اسلامی کے ارکان میں سے ہے۔

۳۔ نہضت حسینی میں تین عوامل یا تین محرکات کا دخل ہے۔ یہ نہضت ان میں سے ہر ایک عنصر کے اعتبار سے ایک خاص قدر و قیمت پیدا کرتی ہے۔

۴۔ خود امر بہ معروف اور نہی از منکر کی مسئولیت کا قبول کرنا سنگین شرائط رکھتا ہے' خواہ یہ آگاہی یا اطلاع بہم پہنچانے کے لحاظ سے ہو یا اس کے اجراء کی

قدرت رکھنے کے لحاظ سے ہو۔ ہمارا اشتباہ فقط یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ ہم نے اس اصول اور رکن پر کافی توجہ نہیں دی ہے بلکہ ہمارا زیادہ تر اشتباہ یہ رہا ہے کہ ایسے عظیم وظیفہ کی انجام دہی کیلئے کہ جو در حقیقت اسلامی اہداف کو آگے بڑھانے کیلئے اجتماعی اور عمومی مسئولیت [۱] ہے، ہم خود کو آمادہ نہیں پاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ ہماری آگاہی کامل رہی ہے اور نہ ہماری اجرائی قدرت۔ لہٰذا ہم نے جاہلانہ طور پر اس اسلامی اصول کے چلانے اور اجراء کرنے کی وجہ سے جو نقصان اٹھایا ہے، وہ نقصان اس کے ترک کرنے میں نہ ہوتا۔ اس راہ میں ہماری فعالیت اور کارکردگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہم کس حد تک آمادگی رکھتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امر بہ معروف اور نہی از منکر کے میدان میں ہماری کارکردگی بہت خراب اور سیاہ ہے۔ اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میدان میں ہماری آگاہی کس حد تک تھی اور ہماری قدرت کسقدر تھی۔ البتہ ہمارے کام میں زیادہ تر اشکال مرحلۂ آگاہی میں ہے، نہ کہ قدرت میں [۲] اور یہ دونوں شرائط بہ اصطلاح 'شرط وجود' ہیں، نہ کہ 'شرط وجوب' یعنی ایسی شرط کہ جسکا حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہماری کارکردگی ان مسائل کے بارے میں ہماری حساسیت کی عکاس ہیں۔ ہم جو کتابیں نشر کرتے ہیں، وہ کس حد تک اسلامی

۱۔ دوسرے الفاظ میں ہماری کامل ہمبستگی مراد ہے جو یہ ہے کہ المومن للمؤمن کالبنیان تشدُّ بعضهُ بعضاً ، المسلمون تتكافؤُ دماؤُهم...... "ایک مومن دوسرے مومن کیلئے ایسا ہے جیسے دیوار جو آپس میں جوڑی ہوئی ہوتی ہے۔ مسلمان آپس میں رشتہ ٔ خون کے ساتھ منسلک ہیں"۔ اس مفہوم کا خلاصہ اور نتیجہ بھی ہمبستگی، ہمدردی وحدت اور عظمت ہے۔

۲۔ یہ ناآگاہی اس جہت سے ہے کہ ہم خود اپنے زمانہ کے حالات سے واقف نہیں ہیں، نہ حالات حاضرہ کہ جو حوادث کے بطن میں چھپے ہوتے ہیں ہم انہیں درک نہیں کرتے اور ان سے ہدایت نہیں لیتے، بلکہ بالکل ظاہر بین چیزوں کو بھی نہیں دیکھتے۔

اہداف کو آگے لیجانے میں ممد و معاون ہوتی ہیں ؟ ہم جو پیسے خرچ کرتے ہیں، جو تبلیغ کرتے ہیں، وہ مسائل ہوتے ہیں جو ہماری فکر کو زیادہ تر خود میں مشغول رکھتے ہیں۔ ان سب چیزوں سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہم نے کس قدر اس اصول کی قدر و قیمت کو درک کیا ہے۔

۵۔ پانچواں نکتہ یہ ہے کہ اس اصول کے بارے میں ہماری کارکردگی کیسی رہی ہے ؟ افسوس کہ اس میدان میں ہمارا کوئی درخشان کارنامہ نہیں ہے۔ اس عنوان کے تحت ہمارا کام امر بہ معروف اور نہی از منکر کے بجائے ایک قسم کا منکر رہا ہے۔ اس میدان میں ہماری کارکردگی خواہ بصورت تبلیغ ہو یا کتاب و نوشتہ کی صورت ہو، خواہ دوسرے ممالک میں مبلغ بھیجنے، پیسہ خرچ کرنے ادارے قائم کرنے، یا کسی اور صورت میں ہو، صِفر یا صِفر کے نزدیک ہی رہی ہے۔

۶۔ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے بھی مراتب اور اقسام ہیں : لفظی اور عملی، مستقیم اور غیر مستقیم، انفرادی اور اجتماعی۔

۷۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ ہم جب اس اصول کی قدر و قیمت کو اسلام کے نقطہ نظر سے جان چکے اور اس بات میں پایۂ ثبوت تک پہنچ گئے، یہ بھی جان گئے کہ نہضت حسینی کی زیادہ قدر و قیمت اسی عنصر کی بدولت ہے [۱۰] اور یہ کہ امامؑ نے اپنی جان، عزیزوں اور اصحاب و یاران کی جان اور تمام دوسری چیزوں کو امر بہ معروف اور نہی از منکر کی راہ میں نظر انداز کر کے اس اصول کو ایک

۱۰۔ یہی وہ عنصر ہے کہ جو یہ بتاتا ہے کہ جس شکل میں بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو، انقلاب کے دامن کو وسعت دینا چاہئے، حتیٰ خونریزی اور انقلاب کیلئے بھی نقشہ کھینچا جائے اور لوگوں کو تلواروں کے سامنے قتل ہونے کی دعوت دی جائے۔ یہی وہ عنصر ہے جو اعتراض، تنقید، جرم کے اعلان اور عدالت خواہی کی فریاد کو خون سے لکھنا واجب کر دیتا ہے کیونکہ پھر وہ مٹ نہیں سکتا جیسا کہ طولِ تاریخ میں ہم نے دیکھا عدالت خواہی کی ہر وہ فریاد اور انسانی آرزو جو اس گرانبہا مرکب سے لکھی گئی تھی، پھر کبھی بھی مٹ نہ سکی۔

قدر و قیمت 'اعتبار اور شائستہ آبرو بخشی ہے ۱۰۔ یعنی دوسرے لوگ اس اصول کو اپنے شخصی ضرر پر موقوف کر کے اس کی قدر و قیمت کو گرا دیتے ہیں لیکن نہضت حسینی اس کے لئے کسی حدومرز کی قائل نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے جاننے کے بعد اب ہمیں نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ ہم کیا کریں کہ جس سے قدر و قیمت پیدا ہو 'ہم کیسے خود اپنے آپ کو ارزش دیں' کیسے خدا کے نزدیک اپنی قدر و قیمت کو بڑھائیں' کیسے پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک اپنی آبرو بڑھائیں 'کیسے دنیا کی تمام ملتوں کے سامنے اپنی آبرو اور عزت کو بڑھائیں' تاکہ وہ لوگ ہماری قدر و قیمت کے قائل ہوں۔ اس کے لئے ہم کیا کریں ؟ اور یہ بھی کہ ہم کیا کریں کہ حسینؑ کی عزاداری کی قدر و قیمت بڑھ جائے ؟ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم حسینؑ کے زندہ شعار کا انتخاب کریں' نہ کہ "نوجوان اکبر من" جو ایک بوڑھی عورت کا شعار ہے اور نہ "زینب مضطرسم الوداع الوداع"۔

اس سوال کا جواب خداوند عالم نے قرآن میں دے دیا : "کنتم خیرامّة اخرجت للنّاس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر"۔ "تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو" (آل عمران : ۱۱۰)۔ تم دنیا کے بہترین اور باارزش ترین لوگوں میں سے اسلئے ہو کہ اس مقدس اصول یعنی امر بہ معروف و نہی از منکر پر کاربند ہو' اجتماعی تعاون' ہمدردی اور ہمبستگی کے حوالے سے جامعہ اسلامی کے سامنے احساس مسؤلیت رکھتے ہو۔

۱۰۔ مراد یہ ہے کہ قیام و نہضت حسینی امر بہ معروف اور نہی از منکر کے درجہ کو بلند مقام پر لے گئی 'ورنہ خود اس کی قدر و قیمت اپنی جگہ پہلے ہی سے ثابت تھی۔

ہمیں وقت شناس اور موقع شناس ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ بقول "سید شرف الدین": "لایُقضیٰ علَی الباطل الا عن حیثُ جاءَ"۔ (کچھ ایسے ہی الفاظ ہیں) "باطل کو جہاں سے وہ اٹھا ہے' اس جگہ کے علاوہ کہیں اور سر کوب نہیں کر سکتے"۔

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہم نہ صرف اُن حوادث سے باخبر نہیں جو زمانے کے بطن میں پوشیدہ پرورش پا رہے ہیں بلکہ بالکل نمایاں چیزوں کو بھی درک نہیں کرتے۔ اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ہمارا زیادہ تر اشتباہ اس میں ہے کہ ہم آگاہ نہیں ہیں' نہ یہ کہ توانائی نہیں رکھتے۔ یہ ناممکن بات ہے کہ ایک سات سو ملین کی جمعیت کو دنیا گنتی میں نہ لائے۔

اِن دونوں مطالب یعنی کہ اول ہماری ناآگاہی کس قدر ہے؟ اور ثانیاً یہ کہ ہم قدرت رکھتے ہیں' کی نمایاں مثال گزشتہ تیس سال کی غم انگیز اور خواب غفلت سے بیدار کرنے والی فلسطین کی حالت ہے۔

پہلے فلسطین میں کتنے یہود آباد تھے؟ صرف حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں انہوں نے حکومت تشکیل دی تھی اور اس کے بعد کبھی بھی کوئی یہودی حکومت وجود میں نہیں رہی ہے۔ حتیٰ وہ کبھی اکثریت میں بھی نہیں رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں فلسطین کی فتح کے وقت......[1]

۱۔ امامؑ نے کیوں اہل بصرہ کے نام خط لکھے اور ان کو دعوت دی؟ اگر یہ خود انقلاب اور خونریزی کو وسعت دینے کیلئے نہ تھا' تو پھر کیا تھا؟ ان سب سے بالاتر امامؑ نے شب عاشورا کیوں حبیب بن مظاہر کو بنو اسد کی طرف بھیجا؟ امامؑ نے اپنے اصحاب اور یاروں کو کیوں مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنے آپ کو

---

[1] خود استاد شہید کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ اسی طرح تھا۔

مرنے کیلئے پیش نہ کریں؟

امامؑ خصوصی طور پر چاہتے تھے کہ اپنے اعتراض وانتقاد کو، اپنے جرم کے اعلان کو اور اپنی عدالت خواہی اور حقیقت خواہی کی فریاد کو خون سے لکھیں تاکہ وہ ہرگز نہ مٹ سکے۔ امامؑ اپنے سخت ترین خطبوں کو "حُر" سے مدمقابل ہونے اور اس کی بندشوں میں آنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں (نمبر ۳ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

تاریخ کلی طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ خون سے لکھی گئی عبارت کبھی بھی نہیں مٹتی، اسلئے کہ وہ تصمیم اور گہری فکر کی حکایت کرتی ہے۔

۲۔ جیساکہ نمبر ایک میں جو بیان ہوا تھا کہ قیامِ امامؑ کا اصول امر بہ معروف و نہی از منکر تھا اور اسی کے زیر اثر آپنے شہید کی منطق اختیار کی تھی جو عقل کی منطق سے بالاتر اور زیادہ منفعت جو ہے۔ اس منطق میں فقط ایک چیز نظر میں ہوتی ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنے ہدف تک پہنچنا ہے۔ اس کے برعکس تمام دوسرے عوامل یعنی بیعت سے انکار کے عامل اور اہل کوفہ کی تشکیلِ حکومت کے لئے دعوت کے عامل کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں تھا۔

۳۔ بہت سے سلاطین کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے نام، ان کی تقاریر اور پیغامات (اگرچہ کہ ان میں کوئی پیغام نہیں ہوتا تھا) باقی رہیں۔ لہٰذا اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنا نام پتھر پر کندہ کرا کے رکھوائے ہیں کہ میں ہوں مثلاً شاہ شاہان، میں ہوں ایزد، میں ایزد کے نسل سے ہوں، اور خداؤں کی نسل سے ہوں اور اسی طرح کی بیہودہ اور بے معنی باتیں (پتھر پر کتبہ سے متعلق لکھی گئی تواریخ کی طرف رجوع کریں)، لیکن یہ چیزیں کبھی بھی دلوں اور سینوں میں کندہ نہیں ہوئیں۔ اس کے برعکس امام حسینؑ کا پیغام کسی پتھر یا لوہے پر کندہ نہ

ہوا تھا' فقط ہوا کے لرزاں صفحہ پر ثبت ہوا تھا اور اسی سے سینوں اور دلوں میں کندہ ہو گیا اور وحی کے نورانی خطوط کی طرح اولیائے خدا کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔ (ان للحسین محبّةً مکنونةً فی قلوب المومنین) سید الشہداءؑ سب سے بلند مقام اور روحوں کے احساسی مرکز ثابت ہوئے کہ انؑ کا نام لینا ہی آنسو جاری کرتا ہے اور خدا جانتا ہے کہ اب تک کتنے ہزار ٹن آنسو جاری ہو چکے ہیں۔ کس لئے ؟ اسلئے کہ یہ ایک ایسی نہضت تھی جو ہدف اور مقصد کے لحاظ سے انسانی تھی' عالی تھی' عدالت خواہی اس کا مقصد تھا اور یہ تقویٰ کے حصول کیلئے تھی۔ خود وجود امام حسینؑ اسکے مؤثر ہونے کا سبب تھا اور یہ وجود ایک الٰہی اور مافوق وجود تھا۔

۴۔ ایک ایسے وقت میں کہ جب جامعہ پر فساد اور تباہی حکومت کر رہی ہو اور تمام جگہوں پر ظلم و ستم اور فساد پھیل چکا ہو' اگر کسی بھی حلقوم سے اپنی جان اور حیثیت کی حفاظت کی خاطر کوئی آواز نہ اٹھے تو دوسرے جو مکان اور زمان کے لحاظ سے دور ہیں' یہ خیال کریں گے کہ جو ہو رہا ہے وہ لوگوں کے ہی نمائندہ کی طرف سے اور لوگوں کی رضا اور رغبت پر ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ایسا سب کچھ ہوتا دیکھ کر اسلام ہی سے منہ موڑ لیں یا اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف ایک انقلابی تصور قائم ہو۔

۵۔ خود بنو امیہ کے عکس العمل کہ جس کو ہم نے یادداشت نہضت حسینی کے نمبر ۳۶ میں نقل کیا ہے' عثمان بن زیاد' مرجانہ' یحییٰ بن الحکم' ہند زوجۂ یزید' اور معاویہ بن یزید سے جو باتیں نقل ہوئیں ہیں' یہ سب ابا عبداللہ کی شہادت کے لرزانے والے اثر کی وجہ سے ہیں۔ اس واقعہ نے نفاق کے پردہ کو چاک

کیا، چھپی ہوئی چیزوں کو بر سر عام کیا اور بنو امیہ کو ہمیشہ کے لئے اسلام سے جدا کر دیا۔ یہ تمام باتیں خود بتلاتی ہیں کہ امام حسینؑ کو حق تھا کہ اپنے لئے شہید کی منطق اختیار کرتے۔

۶۔ روز عاشورا امام حسینؑ کا جملہ : (انی لارجوا ان یکرمنی اللہ بھوانکم "۔ "میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ خدا تمہیں ذلیل کر کے مجھے عزت بخشے گا"۔) اس بات کی تائید کرتا ہے کہ امامؑ اپنی شہادت کے مثبت اثر سے مطمئن تھے۔ آپؑ کو اطمینان تھا کہ یہ شہادت بنی امیہ کی آبرو کو زائل کر دیگی، ان کے اہداف کو خاک میں ملادے گی اور امامؑ کی آبرو بڑھائے گی۔ یہ بات بھی اوپر ذکر کئے گئے ہمارے دعویٰ کی مؤید ہے۔

۷۔ وہ خاص عوامل کہ جن کی وجہ سے امامؑ کا امر بہ معروف کے لئے قیام کرنا واجب ہو گیا تھا، مندرجہ ذیل ہیں :

الف۔ حکومت و خلافت کو موروثی قرار دینا اور ابو سفیان کی آرزو کو حقیقت بخشنا۔

ب۔ صلحِ امام حسنؑ کی شرائط کا توڑنا۔ معاویہ کا شیعوں کے ساتھ ناقابل برداشت رویہ، حتیٰ کہ یہ حکم کہ شیعہ ہونے کا اگر گمان بھی ہو، تب بھی ان کو پکڑا جائے۔ حکومت کے رجسٹر سے نام خارج کرنے کے لئے فقط علیؑ کی محبت کا کافی ہونا۔ شیعوں کے اجتماعی حقوق پر ڈاکہ، گواہی دینے، قضاوت کرنے اور جماعت کی امامت سے شیعوں کی محرومیت۔ شیعوں کی بزرگ ہستیوں کا قتل جیسے حجر بن عدی، عمرو بن حُمِق خزاعی وغیرہ۔

ج۔ منبروں سے حضرت علیؑ پر سب و شتم۔

د۔ بنو امیہ خصوصاً معاویہ کے مفاد میں تبلیغات، اس کو صحابۂ کبار کی صف میں قرار دینا۔

۸۔ بنو امیہ کی سیاست مجموعی طور پر یہ تھی کہ اسلام کی ظاہری شکل کی حفاظت کریں اور اس کو اندر سے خالی کر دیں۔ دوسرے الفاظ میں جیسا کہ خود پیغمبر اکرمؐ نے عالم رؤیا میں دیکھا تھا' بنو امیہ کی سیاست کا محور لوگوں کا رخ اسلام کی طرف رکھ کر' ان کو اسلام سے دور کرنا تھا۔

پانچواں باب

عاشورا کے تاریخی واقعہ میں تحریفات

عاشورا کے تاریخی واقعہ میں تحریفات

۱۔ "تحریف" کلمۂ حرف سے لیا گیا ہے جس کے معنی کسی چیز کو اس کے اصلی مسیر اور مجریٰ سے منحرف کرنا اور دوسری راہ پر لگانے کے ہیں۔ تحریف دو نوعیت کی ہوتی ہیں: "ایک نوع لفظی، قالبی اور پیکری ہے' دوسری نوعیت معنوی اور روحی ہے؟ جیساکہ قواعد میں مغالطہ کی بھی دو قسمیں ہیں: لفظی اور معنوی۔

تحریف اور مغالطہ کا تاریخ میں سابقہ ہے۔ قرآن کریم بھی پہلے کی آسمانی کتابوں کی تحریف کے بارے میں ذکر کرتا ہے' جسے ہم نے "تحریف کلمہ" کے اوراق میں ذکر کیا ہے ۱۔ تحریف جس طرح نوع کے لحاظ سے دو قسم کی ہوتی ہے: لفظی اور معنوی' اسی طرح عامل یعنی محرّف کے لحاظ سے بھی اسکی دو اقسام ہیں۔ تحریف یا دوستوں کی طرف سے ہوتی ہے یا دشمنوں کی طرف سے۔ بالفاظ دیگر تحریف واقع ہونیکی وجہ یا دوست کی جہالت ہے یا دشمنوں کی عداوت۔ اسی طرح سے موضوعِ تحریف کے لحاظ سے بھی یعنی محرّف فیہ (جس کی تحریف کی جائے) کی بھی چند اقسام ہیں:

ایک انفرادی اور بے اہمیت کام میں تحریف جیسے کہ کسی خصوصی خط میں یا کسی گرانقدر ادبی کتاب میں تحریف دوسرے کسی تاریخی سند میں تحریف' جیسے اسکندریہ کی کتابسوزی کو جعل کرنا۔ تیسرے اخلاقی' تربیتی اور ایک اجتماعی سند میں تحریف ہے۔

۲۔ مرحوم آیتی کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کی پانچویں تقریر میں فرماتے ہیں کہ اہل بیتؑ کا اسیر ہونا اس بات کا ایک بہت بڑا محرک بنا کہ وقایع عاشورا کی

۱۔ یہ مطالب استاد شہید کی یادداشت کے ضمن میں آئندہ ذکر ہوں گے۔

حقیقت لوگوں کو بتلائی گئیں تاکہ حقیقت بدل نہ جائے۔
مرحوم ڈاکٹر آیتی چھٹی تقریر میں ص ۱۵۱ پر کہتے ہیں: ”ہمیں اس چیز کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ تاریخ نہضتِ ابا عبداللہ الحسینؑ بہت سے دیگر تاریخی ابواب کی نسبت تحریف سے محفوظ اور سلامت رہ گئی ہے“۔
خصوصاً اس واقعہ کا دردناک اور غمناک ہونا ان لوگوں کی نگاہوں میں محفوظ رہا جنہوں نے اس واقعہ کو غمناک ہونے کے لحاظ سے مطالعہ کیا ہے اور اس واقعہ کا عظیم ہونا اور قابلِ احترام و تکریم ہونا' ان افراد کی نگاہوں میں روشن رہا جنہوں نے اس کا اس زاویہ سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ باتیں خود سبب بنیں کہ اس واقعہ کے جزئیات بھی بہت بڑے اہتمام کے ساتھ لکھے جائیں۔ پس اس واقعہ کے جزئیات بھی سامنے آئے ہیں اور تاریخ میں ثبت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ طبری' ابن واضح (یعقوبی)' شیخ مفید' ابوالفرج اصفہانی نے کہ جو دوسرے' تیسرے اور چوتھے قرن میں گزرے تھے اس واقعہ کی جزئیات باوثوق اور قابل اطمینان راویوں سے نقل کی ہیں۔
مرحوم آیتی ص ۱۶۸ پر اس بات پر بہت زور ڈالتے ہیں کہ امام علی بن الحسینؑ کے ساتھ ساتھ خواتین اہلبیت کے خطبوں کا اہتمام اور مختلف موقعوں پر یہ خطبات اسی لئے تھے کہ حادثہ کربلا کی تحریف میں مانع ہوں (تحریف لفظی ہو یا معنوی)۔ اہل بیت اطہارؑ چاہتے تھے کہ اس حادثہ کو تحریف اور تبدل کے حوالے نہ ہونے دیں۔ چنانچہ جو چیز واقع ہوئی تھی اس کے متن کو ہی اپنے خطبوں میں بیان کیا اور امام عالی مقامؑ کے ہدف کی بھی تشریح کی۔
۳۔ مرحوم آیتی اپنی نویں تقریر (ص ۱۷۵) کے آغاز میں اہل بیتؑ کی تقریروں اور خطبوں کی ارزش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"آج ہم واقعۂ کربلا کو امامؑ اور اہل بیتؑ کے خطبوں سے جو مکہ 'حجاز' عراق' کربلا' کوفہ و شام اور مدینہ میں دیئے ہیں اور اُن تقریروں سے جو لوگوں کے سوالوں کے جواب میں کی ہیں اور وہ رجز جو خود امامؑ اور آپؑ کے اصحابؓ نے روز عاشورا دشمن کے مقابل میں فرمائے ہیں' جو معتبر کتابوں میں ثبت وضبط ہوئے ہیں اور ان خطوط کے تبادلہ سے جو امامؑ اور کوفہ وبصرہ کے لوگوں کے درمیان ہوئے اور ان خطوط سے جن کو یزید نے ابن زیاد کو اور ابن زیاد نے یزید اور عمر سعد کو لکھے ہیں۔ اور عمر بن سعد کے ابن زیاد کو اور ابن زیاد کے حاکم مدینہ کو لکھے گئے خطوط' کہ یہ سب معتبر تواریخ میں ثبت وضبط ہیں اور آئندہ آنے والی نسلوں تک بھی پہنچیں گے اور ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ ان مدارک کے ذریعے ہم واقعۂ عاشورا کی اسکی تمام جزئیات کے ساتھ شرح وتوصیف کر سکتے ہیں۔ کسی دوسرے مدرک وماخذ کی کوئی حاجت نہیں"۔

۴۔ دشمنی کی جملہ تحریفات میں سے ایک یہ ہے کہ یزید نے ابن زیاد کے نام پر جو حکم صادر کیا تھا اس میں لکھا ہے :

"میرے دوستوں (جاسوسوں) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مسلم بن عقیلؓ کوفہ آئے ہوئے ہیں تاکہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کریں"۔

اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خود ابن زیاد نے گرفتار کرنے کے بعد حضرت مسلمؓ سے کہا :

"فرزند عقیل! اس شہر کے لوگ آسودہ خاطر تھے' تم آئے اور ان کے درمیان تفرقے ڈالا اور لوگوں کو ایک دوسرے کی جان کے درپے کر دیا"۔

حضرت مسلمؓ نے ابن زیاد کے جواب میں فرمایا :

"ایسا نہیں ہے۔ میں خود بخود اس شہر میں نہیں آیا کہ یہاں کے لوگوں کو پراگندہ کروں بلکہ اس شہر کے لوگوں نے ہمیں خطوط لکھے ہیں اور ان خطوط میں لکھا ہے کہ تمہارے باپ (زیاد) نے ان کے اچھے لوگوں کو قتل کیا' ان کا خون بہایا اور دنیا کے ستمگروں اور مشرکین جیسا ان سے سلوک کیا۔ ہم اسلئے آئے ہیں تاکہ عدالت قائم کریں اور لوگوں کو قرآن مجید کے حکم کی طرف دعوت دیں"۔

بہر حال یہ تحریف زور نہ پکڑ سکی اور دنیا میں بجز قاضی ابن العربی اندلسی کے کوئی ایسا تاریخ نگار پیدا نہیں ہوا کہ اس طرح قضاوت کرے۔

۵۔ وہ تحریفات کہ جو لفظاً یا معناً واقعہ عاشورا میں ہوئی ہیں :

لفظی تحریفات ۱ :

(الف) شیر اور فضہ کی داستان ۲ کہ متاسفانہ کافی میں بھی ذکر ہے۔

(ب) حضرت قاسم کی عروسی کی داستان۔ ظاہراً یہ قصہ بہت زیادہ نیا ہے اور قاچاری زمانہ سے پہلے کا نہیں ہے (ملا حسین کاشفی کے زمانے سے ہے)۔

۱۔ ان لفظی تحریفات کو وجود میں لانے کے کیا عوامل اور محرکات تھے ؟ ایک بات تو یہ ہے کہ کلی طور پر دنیا کی بزرگ ہستیاں عوام کے افسانوں کا موضوع بن جاتے ہیں۔ جب لوگوں نے بو علی سینا کے بارے میں افسانہ تراشے' جب رستم اور سہراب کے افسانے خلق ہوئے' لازماً علی بن ابی طالبؑ اور حسین بن علی کے لئے بھی افسانہ طرازی ہوئی۔ مثال کے طور پر خیبر میں حضرت علیؑ کی ضربت اور جبرئیلؑ کے بال و پر بچھانے کا قصہ' آسیب بدن کا قصہ' کربلا میں دشمن کی تعداد سات لاکھ ہونے کا افسانہ' روز عاشورا کا بہتر گھنٹے کا ہونا ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ کسی نے کہا سنان بن انس کا نیزہ ساٹھ گز کا تھا تو ایک شخص بول اٹھا کہ دنیا میں کسی نے بھی ساٹھ گز کا نیزہ نہیں دیکھا ہے۔ اس پر اس نے جواب دیا : "اس نیزہ کو خدا نے بہشت سے اس کیلئے بھیجا تھا"۔

دوسرا عامل اور سبب جو امام حسینؑ کے اس واقعہ میں تحریف کیلئے مختص ہے' وہ امام حسینؑ پر رلانے کا موضوع ہے۔ بعد میں ہم اس کی تاثیر کے بارے میں بات کریں گے۔

۲۔ "منتخب" طریحی اور دربندی کی "اسرار الشہادۃ" میں بھی ایک اسدی شخص سے بھی نقل ہوا ہے کہ راتوں کو وہاں پر ایک شیر آیا کرتا تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شیر علی بن ابیطالبؑ تھے (العیاذ باللہ)

(ج) فاطمۂ صغریٰ کے مدینہ میں ہونے کی داستان اور کسی پرندہ کا ان کے پاس امامؑ کی شہادت کی خبر لے جانا۔

(د) اس یہودی لڑکی کی داستان جو مفلوج تھی اور کسی پرندہ کے ذریعے ابا عبداللہ کے خون کا ایک قطرہ اس لڑکی کے بدن پر ٹپکا اور وہ صحتیاب ہوگئی۔

(ھ) جناب لیلیٰ کے کربلا میں موجود ہونے کی داستان اور حضرت امامؑ کا ان کو حکم دینا کہ جاؤ ایک الگ خیمہ میں جا کر اپنے بالوں کو کھول دو اور یہ شعر:

نذرٌ عليّ لئن عادوا و ان رجعُوا　　لازرعنّ طريق الطّفّ ريحانا

"میں نے منت مانی ہے کہ اگر یہ واپس آگئے تو طفّ کے راستے میں ریحان کے پھول اگاؤں گی"۔

اور اسی طرح کے دوسرے اشعار:

لیلیٰ ز غم اکبر......

خیز ای بابا از این صحرا رویم　　نک بہ سوی خیمہ لیلا رویم

"اٹھو بابا! اس بیاباں سے چلیں　　اب سوئے خیمۂ لیلیٰ چلیں"

(و) ابا عبداللہ کے ایک بچہ کی داستان جو شام میں دنیا سے گزر گیا اور باپ کو بہت یاد کرتا تھا۔ جب باپ کا سر مقدس لایا گیا تو اسی جگہ وفات پا گیا۔

(نفس المہموم کی طرف رجوع کریں)

(ز) اسیران اہل بیتؑ کے اربعین کے موقعہ پر کربلا آنے کی داستان۔ یہ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب اسیرانِ اہل بیتؑ کا قافلہ عراق اور مدینہ کے دوراہے پر پہنچا تو انہوں نے نعمان بن بشیر سے خواہش کی کہ ان کو کربلا لے جایا جائے۔ اربعین کے بارے میں جو حقیقت ہے وہ جابر کی زیارت اور عوفی کا عطیّہ ہے۔ لیکن اسیروں کا کربلا سے گزرنا اور امام سجادؑ کی جابر سے ملاقات افسانہ ہے۔

(ح) عمر سعد کے لشکر میں آٹھ لاکھ بلکہ بعض کہتے ہیں سولہ لاکھ افراد تھے۔
عاشورا کا دن ۷۲ گھنٹے کا تھا۔ فلاں نے ایک حملہ میں دس ہزار نفر کو قتل کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہاشم مرقال کا نیزہ ۱۸ گز لمبا اور حضرت قاسمؑ کے قاتل کا نیزہ ۱۸ گز کا اور سنان کا نیزہ ۶۰ گز کا تھا۔ یہ سب افسانہ ہے۔

(ط) ایسی داستانیں کہ جن میں اہل بیتؑ کیلئے دشمن کے سامنے اظہار تذلل ہے جیسے اشقیاء سے پانی مانگنا۔

(ی) اس بچہ کی داستان کہ اسارت کے وقت جس کی گردن کو اسی سے باندھ کر سوار اسے کو گھسیٹ رہا تھا' یہاں تک کہ وہ بچہ مر گیا۔

معنوی تحریفات :

(الف) سب سے پہلی تحریف یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس حادثہ کو ایک استثنائی اور مجرمانہ دستور سے پیدا ہونے والے خصوصی حادثہ کا نام دیا۔ امام حسینؑ امت کے گناہوں پر فدا ہو گئے! وہ شہید اسلئے ہوئے کہ امت کے گناہ بخش دیئے جائیں! بلاشک وشبہ یہ ایک مسیحی فکر ہے جو ہمارے درمیان بھی رائج ہو گئی ہے۔ یہی وہ فکر ہے جو امام حسینؑ کے ہدف کو کلی طور پر مسخ کرتی ہے اور انؑ کو گناہ کرنے والوں کی پناہ گاہ کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ امامؑ کے قیام کو دوسروں کے بُرے کاموں کا کفارہ قرار دیا جاتا ہے۔ امام حسینؑ شہید ہوئے تاکہ گنہگاروں کے لئے عذاب الٰہی کا خاتمہ ہو جائے! معصیت کرنیو الوں کی معصیت کے لئے جوابدہ آپ ہوں[۱]۔ کسی آدمی سے پوچھا گیا کہ تم کیوں نماز نہیں پڑھتے ہو' روزہ نہیں رکھتے ہو' اور کیوں شراب پیتے ہو؟!!

۱۔ امام حسینؑ تین مرحلے میں شہید ہوئے اور آپؑ کی شہادت تین قسم کی ہیں : بدن کی شہادت' نام کی شہادت اور ہدف کی شہادت۔

اس نے جواب میں کہا: "کیا شب جمعہ کو انجمن میں تم نے میری سہ ضربی سینہ زنی کو نہیں دیکھا ہے۔"؟ آقائے بروجردی نے بہت چاہا کہ قم کے ماتمی دستوں کے سرپرستوں کو بعض کاموں سے منع کریں مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: "ہم ایک دن کے سوا تمام سال آپ کے مقلّد ہیں۔ ہمارے اور مسیحیوں کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ کوئی بہانہ ہونا چاہیئے کہ مکھی کے بال کے برابر آنسو بہے اور یہی ہمارے جھوٹ' ہماری خیانتوں' شراب خوریوں' سود خوریوں' ظلم اور آدم کُشی کا جواب دینے کے لئے کافی ہے! ہمارے ہاں اب امام حسینؑ کا مکتب' بجائے اسکے کہ احکام دین کے احیاء کا مکتب ہو' 'اشهدانك قد اقمت الصلوة وآتيت الزكوةوامرت بالمعروف ونهيت عن المنكر' کا مکتب ہو' اور جیسا کہ امامؑ نے فرمایا: "أُريد ان آمربالمعروف وأنهىٰ عن المنكر" کا مکتب ہو' ابن زیاد سازی اور یزید سازی کا مکتب بن گیا ہے۔

اس میدان میں گئی افسانہ بنائے گئے ہیں جیسے یہ داستان کہ ایک آدمی لوگوں کا راستہ روکتا تھا' لوگوں کو مار ڈالتا تھا' ٹکڑے کر دیتا تھا' اس کو اطلاع ملی کہ زوّار حسینی کا کوئی قافلہ آج رات فلاں جگہ سے گزرے گا۔ وہ کسی موڑ پر ان کی گھات میں چھپ گیا۔ انتظار کر رہا تھا کہ اسے نیند آگئی۔ قافلہ آیا اور چلا گیا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوا۔ جب قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا' وہ سو رہا تھا اور جو گرد و غبار اٹھی وہ اس کے لباس اور بدن پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس نے خواب دیکھا کہ قیامت برپا ہوئی ہے اور ناحق خون بہانے' چوری کرنے' لوگوں کا مال لوٹنے اور امن وامان ختم کرنے کے جرم میں اسے بھی کھینچتے ہوئے جہنم کی طرف لے کیونکہ اسلام کی نظر میں ایسے آدمی کو محارب کہتے ہیں۔ "وانما

جزاء الذین یحاربون الله ورسوله...... ان یقتلوا ویصلّبوا او تقطع ایدیهم......"۔ "بس خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والے کی سزا یہی ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ہاتھ اور پیر مختلف سمت سے قطع کر دیئے جائیں......"۔ (سورۂ مائدہ آیت ۳۳) اس کے تفصیل کیلئے آیہ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

لیکن جیسے ہی جہنم کے نزدیک پہنچا، جہنم نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حکم ہوا کہ اس کو واپس لے جاؤ، یہ وہ شخص ہے کہ جب سو رہا تھا، زوّار حسینی کے قدموں کی دھول اس کے چہرہ پر بیٹھی ہے۔

فانّ شئت النجاة فزر حسینا   لکی تلقی الاله قریر عین

فان النار لیس تمسّ جسماً   علیه غبار زوّار الحسینؑ

"اگر نجات چاہتے ہو تو حسینؑ کی زیارت کے لئے جاؤ تاکہ خدا کا دیدار روشن آنکھوں سے کرو۔ جہنم کی آگ اس جسم کو نہیں چھوئے گی جس پر زائرانِ حسینی کے قدموں کی دھول بیٹھی ہو"۔

پس جب زوّار حسینی کے قدموں کی دھول کسی ڈاکو کے چہرہ پر بیٹھ جائے اور اس کو نجات ملے، تو خود زوّار کا کیا مقام اور درجہ ہوگا! اور حتماً ابراہیم خلیلؑ سے بالاتر ہوگا[۱۰]۔

۶۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ تحریف کے دو بنیادی عوامل ہیں۔ اب ہم ان عوامل کی تفصیل میں جاتے ہیں:

الف۔ دشمن اپنے اغراض کے تحت یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ ان واقعات کو اُلٹ دے اور

۱۰۔ اس کے بعد استاد شہید مطہریؒ معنوی تحریفات سے متعلق فارسی کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ "گناہ خواہ کتنے ہی سنگین ہوں، حسینؑ پر رونے کیوجہ سے بخش دیئے جائیں گے"۔

ان میں تحریف کردے' جیساکہ اس کاایک نمونہ ہم نے نمبر ۴ میں بیان کیاہے۔

(ب)افسانہ سازی اور خرافات سازی کی حس لوگوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ آقای ڈاکٹر شریعتی نے اپنی عید غدیر کی تقریر میں افسانہ سازی کی طرف لوگوں کی توجہ کی بنیاد کو احسن طریقہ سے بیان کیاہے اور ہم بھی پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ افسانہ پردازی ہی ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضرت علیؑ کی ضربت سے زخمی ہونے کی وجہ سے چالیس دن تک اوپر نہیں جاسکے۔اور اسی طرح یہ بھی کہ حضرت علیؑ کی ضربت اس قدر نرم اور اسکی کاٹ اسقدر تیز ہوتی ہے کہ خود مرحب ضربت کھانے کے بعد بھی متوجہ نہ ہوسکا اور علیؑ سے کہنے لگا: "اے علیؑ! یہ سب لوگ جو تمہاری اتنی تعریف کرتے ہیں' تمہاری تمام قوت اور ہنر یہی ہے ؟" علیؑ نے فرمایا: "ذرا خود کو حرکت دے تو سہی تو تجھے معلوم ہو کہ کیا خبر ہے"۔ جب وہ اپنی جگہ سے ہلتا ہے تو اس کا آدھا دھڑ اس طرف اور آدھا اُس طرف گر جاتا ہے!۔

(ج) حادثۂ عاشورا میں تحریف کے حوالے سے خصوصی طور پر ایک اور خاص عامل کا بھی دخل رہاہے۔ وہ یہ کہ دین کے سربراہان کی طرف سے ایک خاص فلسفہ کی خاطر یہ تاکید ہوئی تھی کہ اس واقعہ کو ایک مصیبت کے عنوان سے یاد کیا جائے اور لوگ اس پر گریہ کریں۔ اس ذکر اور رونے رلانے کا مقصد' اس یادگار کو زندہ رکھنا تھا اور اس واقعہ کو زندہ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اس نہضت کے تمام اہداف ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جائیں۔ امام حسینؑ ہر سال لوگوں کے درمیان اسی طرح سے ظاہر ہوں اور لوگ آپ کے حلقوم مبارک سے یہ سنتے رہیں کہ :الا ترون انّ الحق لا یعمل به

وان الباطل لایتناھیٰ عنہ۔لوگ ہمیشہ سنتے رہیں :لااری الموت الا سعادۃ والحیاۃ مع الظالمین الابرما'لوگ اس ندا کو سنیں کہ جو حماسہ کے ساتھ اُٹھی ہے اور اس تاریخ کو دیکھیں جو خون سے لکھی گئی ہے۔

لیکن رونے رلانے کے اس مفہوم کو سمجھے بغیر اور رونے اور رُلانے کے ہدف کی طرف توجہ دئے بغیر 'خود رونا ہی موضوع بن گیابلکہ اب تو یہ ایک مخصوص ہنر ہو گیا ہے۔ اپنے موضوع سخن سے مصائب کے عنوان میں داخل ہونا'اہل منبر اور ذاکرین کا ایک ہنر ہے۔لوگوں کو زیادہ سے زیادہ رلانا ظاہری طور پر اس لئے ہے کہ زیادہ اجر وثواب حاصل ہو۔ جھوٹے مصائب جعل ہوئے۔ ہمارے لوگ بھی چائے کے عادی لوگوں کی طرح (جن کو گہرے رنگ کی چائے کی عادت ہے وہ ہلکے رنگ کی چائے پسند نہیں کرتے) بہت سخت اور حاشیہ دار مصائب کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ بات خود اس کا سبب بنی ہے کہ کچھ اہل منبر لوگوں کو رُلانے کے لئے مجبوراً جھوٹے مصائب کا سہارا لیتے ہیں اور اگر محترمانہ انداز میں ذکر کرنا چاہیں تو ضعیف مصائب ذکر کرتے ہیں۔

یہاں پر دو داستانیں ہیں : آذربائیجان کے ایک عالم غلط مصائب پڑھے جانے پر بہت رنجیدہ ہوتے تھے اور اہل منبر پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ معمولاً یہ کہتے تھے "یہ کیا زہرپاشی ہے جو تم پڑھتے رہتے ہو؟"لیکن کوئی بھی ان کی بات پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ آخرکار خود انہوں نے اپنی مسجد میں ایک عشرہ رکھا ۔چونکہ بانئ مجلس بھی خود تھے اسلئے مجلس پڑھنے والے کو پابند کیا کہ (خود ان کی اصطلاح میں) زہر پاشی والی غلط روایات نہیں پڑھے گا۔ذاکر نے کہا:"آقا! مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ جان لیں کہ لوگ روئیں گے نہیں"۔اس

پر عالم دین نے کہا: "تمھیں اس سے کیا سروکار؟ میری مجلس میں ایسی زہرپاشی، یعنی جھوٹے مصائب نہیں پڑھے جائینگے"۔ مجلس شروع ہوئی۔ آقا خود محراب میں تھے اور منبر محراب کے ساتھ ہی تھا۔ ذاکر نے مصائب پڑھنا شروع کئے کتنا ہی چاہا کہ سچے مصائب سے لوگوں کو رلائے، لوگ نہیں روئے، آقا خود بھی ہاتھ پیشانی پر رکھے ہوئے تھے۔ دیکھا عجب! مجلس سرد پڑی تھی۔ اپنے آپ سے کہا لوگ کہیں گے کہ آقا کی مجلس کامیاب نہیں ہوئی، گمان کریں گے کہ آقا کی نیت صاف نہیں اور اس طرح میرے تمام مرید مجھ سے جدا ہو جائیں گے۔ آہستہ سے اپنے سر کو منبر کی طرف لے گئے اور ذاکر کے کان میں بولے: "اس زہرپاشی میں سے تھوڑا ملادے"۔

دوسری داستان یہ ہے: کسی شہر کی مجلس میں، میں نے پہلی مرتبہ ایک خاتون کی داستان سنی جو متوکل کے زمانہ میں ابا عبداللہ کی زیارت کے لئے گئی تھی۔ لوگ اس کے مانع ہوئے اس کے ہاتھ کاٹے گئے، آخر کار (داستان کی تفصیل یاد نہیں) اس کو دریا میں پھینکا جاتا ہے اور وہ فریاد کرتی ہے: "یا اباالفضل! میری فریاد کو پہنچو" دریا میں سے ایک سوار نمودار ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے اور اس خاتون سے کہتا ہے: "آؤ میری رکاب تھام لو!" وہ خاتون کہتی ہے: "آپ کیوں اپنے ہاتھوں کو آگے نہیں بڑھاتے اور مجھے نہیں پکڑتے؟" سوار جواب میں کہتا ہے: "میرے بدن پر ہاتھ نہیں ہیں"۔

پس معلوم یہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے خود یہ جعلی مصائب اور یہ تحریفات تخلیق کی ہیں۔ بہت سی زبان حال، زبان حال نہیں ہیں۔

جیسے یہ شعر:

اے خاک کربلا تو بہ من یاوری نما   چون نیست مادری تو بہ من مادری نما

"اے خاک کربلا! تو میری مدد کر، چونکہ میری ماں نہیں ہے تو مجھ سے ماں کا سلوک کر۔"

یہ سب کیا ہے؟ نہ امامؑ ایسے کلمات زبان پر لائے ہیں اور نہ ہی یہ امامؑ کے شایان شان ہیں۔ بلکہ یہ کسی بھی مرد کیلئے شائستہ نہیں۔ ایک ستاون (۵۷) سالہ مرد اگر بالفرض یہ چاہے کہ غربت اور تنہائی پر نالہ کرے تو وہ ماں کو نہیں پکارتا۔ ماں کو پکارنا ایک بچہ کی شان ہے جسے ابھی ماں کی گود کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ سن ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر بچے اپنی ماؤں کی پناہ میں ہوتے ہیں۔

کتاب "لؤلؤ مرجان"[۱] اپنی نوعیت کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب مرحوم مؤلف کے واقعی عالم ہونے کی حکایت کرتی ہے۔ مرحوم محدث نوری نے اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے "اخلاص" اور "صدق" اور دونوں حصوں کو بہت خوب بیان کیا ہے۔

"صدق" کی بحث میں ص ۱۴۶ پر اس سے مربوط آیات کو نقل کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ آیت ہے: "فویلٌ للّذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذامن عنداللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً فویلٌ لھم ممّا کتب ایدیھم وویلٌ لھم ممّایکسبون"۔ "وائے ہو ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑے دام میں بیچ لیں۔ ان کے لئے اس تحریر پر بھی عذاب ہے اور اس کی کمائی پر بھی"۔ (سورۂ بقرہ: ۷۹)

اس کے بعد جھوٹی نسبت دینے سے متعلق آیات کو نقل کیا ہے جو بہت زیادہ ہیں۔[۲]

---

[۱] اس کتاب کا اردو ترجمہ دار الثقافۃ الاسلامیہ نے "آداب اہل منبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہاں پر جو صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں وہ اسی اردو ترجمہ کے مطابق ہیں۔ (مترجم)

[۲] اور اگر ہماری طرح تحریف سے متعلق متذکر آیات سے متمسک ہوتے تو شاید بہت زیادہ مناسب تھا۔

۷۔ مرحوم کتاب کے صفحہ ۱۶۴ پر ذاکرین کے بیان کردہ کچھ جھوٹے مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے :

(الف) حضرت علی اکبرؑ کا میدان میں جاکر واپس آنا اور اسوقت امامؑ کا اکبر کی ماں لیلیٰ سے یہ فرمانا : "اٹھو خلوت میں جاکر اپنے بیٹے کے لئے دعا کرو۔ میں نے اپنے ناناؐ سے سنا ہے کہ ماں کی دعا اپنے فرزند کے حق میں مستجاب ہوتی ہے"۔

(ب) حضرت زینبؑ اسوقت کہ جب امامؑ احتضار کی حالت میں تھے، امامؑ کے سرہانے آئیں۔ فرمقها بطرفه فقال لهااخوه:ارجعي الى الخيمةفقد كسرت قلبي وزدت كربي۔ "پس حضرتؑ نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا : خیمہ کی طرف واپس جاؤ، تم نے میرا دل توڑ دیا اور میرے کرب میں اضافہ کر دیا"۔

(ج) امامؑ نے کئی بار دشمن پر حملے کئے اور ہر بار "دس ہزار" نفر کو مارا!

۸۔ آقای نوری اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴۶ پر شیخ مفیدؒ کے اشتباہ کو نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ حضرت علیؑ کسی بھی جنگ میں زخمی نہیں ہوئے تھے۔ ص ۲۴۸ پر اسیروں کی شام سے واپسی پر کربلا سے گزرنے کی داستان نقل فرمایا ہے کہ جو فقط کتاب "لہوف" میں آئی ہے اور اس کے بعد ابن نمانے "مثیر الاحزان" میں اسے نقل کیا ہے۔ یہ کتاب سید بن طاؤس کی وفات کے چوبیس سال بعد تالیف ہوئی ہے۔

۹۔ ص ۲۷۰ پر آخوند ملا مہدی نراقی کی کتاب "محرق القلوب" کا نام لیا ہے جو بعض جھوٹ پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک [۱۰] یہ داستان ہے کہ "جب

۱۰۔ یہ داستان طول و تفصیل کے ساتھ کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہداء" میں آئی ہے اور انہوں نے ظاہرا محرق القلوب سے نقل کی ہے۔ روضۃ الشہداء میں ہے کہ فضل بن علیؑ ہاشم کی مدد کے لئے دوڑے!!!

کچھ اصحاب ویاران امامؑ میدان جنگ میں شہید ہو گئے تو ناگاہ بیابان سے ایک مکمل مسلح سوار نمودار ہوا جو ایک کوہ پیکر گھوڑے پر سوار تھا' سر پر فولادی خود رکھے ہوئے تھا' شانے پر گول سپر لٹکائے ہوئے تھا' چمکتی بجلی کی مانند جوہر دار یمانی تلوار حمائل کئے ہوئے تھا' اٹھارہ گز کا نیزہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا' غرض تمام اسباب جنگ سجائے ہوئے "کالبرق اللامع والبدر الساطع" (چمکتی ہوئی بجلی اور بدر منیر) کی مانند میدان کے درمیان پہنچا۔ اعدائے دین کو بھگانے اور اپنے گھوڑے کو جولان دینے کے بعد اس نے اپنا رخ سپاہِ مخالف کی طرف کیا اور کہا: "جو مجھے نہیں پہچانتا ہے پہچان لے کہ میں ہاشم بن عتبہؓ بن ابی وقاص' عمر سعد کا چچازاد بھائی ہوں"۔

پھر اس نے اپنا رُخ امام حسینؑ کی طرف کیا اور کہا: "السلام علیك یا اباعبدالله ۔اگر میرا چچازاد بھائی عمر سعد آپؑ سے جنگ کے لئے آیا ہے تو میں آپؑ پر اپنی جان نثار کرنے کیلئے آیا ہوں"۔

۱۰۔ ص ۲۷۴ پر برغانی اور قزوینی کی تالیفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو جھوٹ پر مشتمل ہیں۔

۱۱۔ ص ۲۷۵ پر کہتے ہیں: "مجھے یاد ہے کہ جب میں کربلائے معلی میں تھا اور اپنے عصر کے علامہ شیخ عبدالحسین تہرانی طاب ثراہ' سے استفادہ کر رہا تھا' تو حِلّہ سے ایک سید عرب ذاکر آیا۔ اس کا باپ مشہور و معروف ذاکروں میں سے تھا۔ اس ذاکر کے پاس اپنے باپ کی میراث سے ایک کتاب کے کچھ کہنہ اجزاء تھے۔ اس کتاب کا نہ اول تھا اور نہ آخر۔ اس کے حاشیہ پر لکھا تھا کہ یہ کتاب جبل عامل کے فلاں عالم کی تالیفات میں سے ہے' جو صاحبِ "معالم" کے شاگردوں میں سے تھے۔ غرض اس سید نے اس کتاب کو استاد کی

خدمت میں پیش کیا۔ مرحوم شیخ عبدالحسین نے اول تو اس عالم کے احوال زندگی میں "مقتل" پر کوئی کتاب نہ پائی اور جب خود اجزائے کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں اس قدر جھوٹی روایات تھیں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی کتاب کسی عالمِ دین کی تالیفات میں سے ہو۔

پس علامہ نے اس سید کو اس کتاب کو نشر کرنے اور نقل کرنے سے منع فرمایا۔ لیکن بعد میں یہی کتاب مرحوم دربندی کے ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے اس کے مطالب کو اپنی کتاب "اسرار الشہادۃ" میں نقل کیا اور یوں اس کی جعلی اور واہیات روایات کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا"۔

"اسرار الشہادۃ ۱۰" میں دربندی عمر سعد کی فوج کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں: "کوفہ کی فوج میں چھ لاکھ سوار اور سولہ لاکھ پیدل تھے"۔

۱۲۔ ص ۲۷۷ پر کہتے ہیں: "مرحوم دربندی نے مجھ سے بالمشافہ یہ روایت نقل کی ہے۔ فرمانے لگے: میں نے گزشتہ دنوں یہ بات سنی تھی کہ فلاں عالم نے کہا یا یہ روایت نقل کی کہ عاشورا کا دن ستّر گھنٹے کا تھا۔ مجھے اس وقت تو ان کی یہ بات عجیب محسوس ہوئی اور اس نقل پر میں بڑا متعجب ہوا۔ لیکن اب جب کہ میں نے روز عاشورا کے واقعات میں تامل کیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس عالم کی بات درست تھی کیونکہ وہ تمام واقعات اتنے ہی عرصہ میں رونما ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ اس سال (سنہ ۱۳۸۹ھ ق) محرم سے دو تین دن پہلے چونکہ میں کربلا کے تاریخی واقعہ میں تحریفات سے متعلق بحث و گفتگو کرنا چاہتا تھا ٹیلیفون کر کے مؤسسہ کتاب فروشی صدوق کے مدیر علی اکبر غفاری سے جھوٹی ترین کتاب کی فرمائش کی تو ان کی نظر اسرار الشہادۃ کی طرف گئی۔ آقا غفاری کے پاس یہ کتاب نہیں تھی لیکن وعدہ کیا کہ مہیا کر دیں گے۔ تاہم دو تین دن بعد فون کر کے بتایا کہ جس کتاب فروش سے پتہ کیا وہ خود بھی اس کے پیچھے تھا۔ کہنے لگے کہ اس کے بہت زیادہ خریدار ہیں اور سب اہل منبر ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ آپ انتقاد کی غرض سے اور وہ لوگ نقل کے لئے استفادہ کرتے ہیں۔

۱۳۔ ص ۲۷۹ پر ہے کہ شہر کرمان شاہ میں ایک شخص عالمِ کامل، جامع فرید، آقائے محمد علیؒ، صاحبِ "مقامع" کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی: "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے دانتوں سے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے بدن مبارک کا گوشت کاٹ رہا ہوں"۔ آقائے محمد علیؒ اس شخص سے واقف نہ تھے۔ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر اس سے فرمایا: "شاید تو ذاکری کرتا ہے؟" اس نے عرض کی: "جی ہاں"، آقا نے فرمایا: "یا تو ذاکری ترک کر دے یا روایات کو معتبر کتب سے نقل کیا کر"۔

۱۴۔ ص ۲۸۲ پر ذاکروں کی اکاذیب کے نمونے بیان کرنے کیلئے مقدمتاً بنو اسرائیل کے مسنا اور تلمود کو، جو سینہ بہ سینہ یہودیوں تک پہنچے اور اس کی جمع آوری ہوئی، اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی صدور الواعظین ولسان الذاکرین سے تمثیل کرتے ہیں۔

۱۵۔ ص ۲۸۶ پر گزشتہ مطالب کے ساتھ ایک عبارت اور بیان کی ہے، کہتے ہیں: "البتہ یہودی کی "مسنا" ایک مشہور و معروف کتاب ہے جو ان دو تفسیروں (شرح مسنا) کی موجودگی کی وجہ سے زیادتی اور کمی سے محفوظ رہی۔ لیکن امت محمدیہ کی "مسنا" کی روایت بیل بوٹوں کی سی ہے کہ جب ذاکر یا خطیب اس روایت کو ایک مجموعہ سے دوسرے مجموعہ میں نقل کرتے ہیں تو وہ روایت فوراً نمو کرتی ہے، بابرکت ہو جاتی ہے اور اس میں تازہ شاخ اور پتے، طراوت اور تازگی کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ روایت منزل و منابر تک پہنچتی ہے اور اس کے نقل کرنے کا موسم آپہنچتا ہے تو اس میں حیوانی تاثیر ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے پر و بال پیدا کر لیتی ہے اور خیال کا طائر ہر لمحہ مختلف جہات میں پرواز کرتا ہے۔ ہم بطورِ مثال ان میں سے بعض

کی طرف اشارہ کرتے ہیں"۔ ہم ان میں تین کی مثالیں چونکے پہلے نقل کر چکے ہیں' لہٰذا یہاں چوتھی مثال سے شروع کریں گے :

۱۶۔ (د) ص ۲۸۹ پر محدثِ نوری نے حضرت امیرؑ کے ضربت لگنے کے بعد کا ایک افسانہ بیان کرنے بعد "کوفہ کے اس قاصد کا افسانہ بیان کیا ہے کہ جو امام حسینؑ کی خدمت میں ایک خط لے کر آیا اور آپؑ سے اس خط کا جواب چاہا ۔ حضرتؑ نے تین روز کی مہلت مانگی اور تیسرے دن عازم سفر ہوئے۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ جا کر بادشاہِ حجاز کی جلالتِ شان تو دیکھوں کہ وہ کس طرح سوار ہوتے ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچا' تو دیکھا کہ حضرتؑ کرسی پر تشریف فرما ہیں' بنوہاشم آپؑ کے گرد گھیر اڈالے ہیں' اور لوگ بھی کھڑے ہیں۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی ہیں اور چالیس محملیں ہیں جو سب کی سب حریر و دیباج سے ڈھنپی ہوئی ہیں...... اور یہ قاصد عصر عاشورا تک اہل بیتؑ کے ہمراہ تھا۔ جب ابن سعد کے حکم پر اشقیاء نے اسیروں کے سوار ہونے کے لئے بے کجاوہ اونٹوں کو حاضر کیا......"۔

(ہ) ص ۲۹۱ : "شبِ عاشورا جناب زینب سلام اللہ علیہا اعداء کے خوف سے اقربا اور انصار کی خبر رکھنے کے لیئے خیام کے درمیان پھر رہی تھیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ حبیب ابن مظاہر نے اصحاب کو اپنے خیمہ میں جمع کیا ہوا ہے اور ان سے عہد لے رہے ہیں کہ کل ایسا نہ ہو کہ بنوہاشم میں سے کوئی ایک بھی ہم سے قبل میدان میں جائے...... پس وہ مخدّرہ خوش ہو کر خیمۂ ابی الفضلؑ کے پشت پر آئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ابی الفضلؑ علیہ السلام بھی بنوہاشم کو جمع کیئے ہوئے ان سے اسی قسم کا عہد لے رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ پہلے انصار میں سے کوئی میدان میں جائے۔ پس جناب زینبؑ مسرور ہو کر حضرت

سید الشہداءؑ کی خدمت میں پہنچیں اور تبسّم فرمایا۔ حضرت نے ان کے اس تبسّم پر تعجب کیا اور سبب پوچھا' مخدرہ نے جو کچھ دیکھا تھا عرض کیا......"

(و) ص ۲۹۱: "روز عاشورا اہل بیتؑ اور اصحاب کی شہادت کے بعد حضرت سید الشہداءؑ 'امام زین العابدینؑ کے سرہانے تشریف لائے۔ امام زین العابدینؑ نے پدر بزرگوار سے جناب کے اعداء کے ساتھ معاملہ کا حال پوچھا تو حضرتؑ نے انہیں خبر دی کہ نوبت جنگ تک جا پہنچی ہے۔ امام سجادؑ نے بعض اصحاب کے نام لئے اور ان کا حال پوچھا۔ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: "قُتِل 'قُتِل "۔ یہاں تک کہ امام سجادؑ نے بنو ہاشم کا حال دریافت کیا اور جناب علی اکبرؑ اور ابی الفضلؑ کا حال پوچھا۔ سید الشہداءؑ نے وہی جواب دیا اور فرمایا: "جان لو کہ ان خیام میں میرے اور تمہارے سوا کوئی مرد باقی نہیں رہا"۔

یہ قصہ کا خلاصہ ہے اور اس کے بہت سے حواشی ہیں۔ یہ واقعہ صراحتاً دلالت کرتا ہے کہ جناب امام زین العابدینؑ کو جنگ کی ابتداء سے لے کر اپنے پدر بزرگوار کے مبارزہ کے وقت تک اقرباء وانصار اور میدان جنگ کے حالات کی بالکل کوئی خبر نہ تھی۔

(ز) ص ۲۹۲: "ایک عجیب و غریب داستان حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے میدان میں جانے کے وقت سواری کا گھوڑا طلب کرنے سے مربوط ہے۔ اس وقت کوئی آدمی نہ تھا جو گھوڑے کو حاضر کرتا۔ پس جناب زینب(س) گئیں گھوڑا لے کر آئیں اور حضرت سید الشہداءؑ کو سوار کیا......اور جتنے منبر اتنی باتیں' اس موقعہ پر بھائی اور بہن کے درمیان بہت سے مکالمات ذکر کئے جاتے ہیں اور ان روایتوں کے مضامین' عربی اور فارسی کے اشعار کے ضمن میں بھی آئے ہیں۔ ذاکرین اور خطیب حضرات اپنی

مجالس کو اِن روایات کے ذریعے بارونق بناتے اور حاضرین سے آہ وفغان بلند کراتے ہیں۔

ظاہراً اسی وقت کا قصہ ہے کہ حضرت زینب (س) نے وداع کے وقت بھائی کو روکا اور فرمایا: مجھے ماں کی ایک وصیت یاد آئی ہے۔ماں نے فرمایا تھا کہ ایسے وقت میں میرے حسینؑ کے گلے کا بوسہ لینا۔ایک داستان یہ بھی ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے دیکھا کہ گھوڑا حرکت نہیں کر رہا ہے۔جب تازیانہ مارنے پر بھی وہ نہ ہلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ گھوڑے کے سُم سے لپٹا ہوا ہے۔

صفی علی شاہ کے معروف اشعار جو عشق و عقل کے دو جاذبہ کے بیان میں ہیں' وہ حضرت زینبؑ سے مربوط اسی وقت کے بارے میں ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت زہراءؑ کی وفات کے وقت جناب زینبؑ کی عمر فقط پانچ سال تھی"۔

(ح) ص ۲۹۴ :"جناب زینب سلام اللہ علیہا قتل گاہ میں حضرت سید الشہداءؑ کے سرہانے آئیں:" ورأته يجود بنفسه ورَمَت بنفسها عليه وهي تقول : انت اخي' انت رجائونا' انت كهفنا 'انت حِمانا"۔"بی بی نے دیکھا کہ اُن کا آخری وقت ہے تو اپنے آپ کو بھائی پر گرادیا اور اسی حال میں کہتی تھیں۔ہائے میرے بھائی' ہائے میری امید کے سہارے' ہائے میرے ملجا' ہائے میری پناہ گاہ"۔

(ط) ص ۲۹۵ :"ابوحمزہؒ ثمالی سے منسوب افسانہ کہ وہ ایک دن امام زین العابدینؑ کے گھر آئے اور دروازے پر دستک دی۔ایک کنیز باہر آئی۔جب اسے پتہ چلا کہ ابوحمزہؒ ہیں تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے ان کو بھیجا تاکہ وہ حضرتؑ کو تسلی دیں کیونکہ آپؑ دو مرتبہ بے ہوش ہو چکے تھے۔پس

ابو حمزہ ثمالی داخل ہوئے اور انہوں نے حضرتؑ کو ان الفاظ میں تسلی دی
''شہادت تو آپ کے گھرانے کی وراثت ہے' آپؑ کے جد' پدر اور عم......''۔
آپؑ نے جواب میں ان کی تصدیق فرمائی اور فرمایا لیکن اسیری تو اس گھرانے
کی وراثت نہ تھی۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کی اسیری
کے کچھ حالات بیان فرمائے''۔

(ی) ایک حکایت وہ ہے کہ جسے ہشام بن الحکم سے نسبت دے کر نقل کیا جاتا
ہے۔ ہشام نے کہا کہ جس زمانے میں حضرت صادقؑ بغداد میں تھے' میں
حسب الحکم ہر روز آپؑ کی خدمت عالیہ میں حاضر رہتا تھا۔ ایک روز حضورؑ
کے کسی شیعہ نے مجھے مجلس عزا میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے عذر
پیش کیا کہ چونکہ مجھے حضورؑ کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہنا ہے' اسلئے مجلس
میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ اس نے کہا امامؑ سے اجازت طلب کر لو۔ میں نے
کہا میں آپؑ کے حضور میں ایسی بات نہیں کر سکتا کیونکہ حضور ضبط نہ
کر سکیں گے۔ اس نے کہا بغیر اجازت کے آجایئے۔ میں نے کہا دوسرے
دن جب میں آپؑ کی زیارت سے مشرف ہوں گا' تو آپؑ مجھ سے پوچھیں گے
(کل کہاں گئے تھے) تو میں کیا جواب دوں گا؟ ہشام کہتے ہیں کہ آخر کار وہ
مجھے لے گیا۔ دوسرے دن حضرتؑ نے مجھ سے پوچھا: حضرتؑ کے تقاضے
کے بعد میں نے عرض کر دیا تو آپؑ نے فرمایا: کیا تیرا گمان ہے کہ میں وہاں
نہیں تھا یا میں ایسی مجالس میں حاضر نہیں ہوتا ہوں؟ و میں نے عرض کی کہ
میں نے تو آپؑ کو وہاں نہیں دیکھا۔ فرمایا: جس وقت تو حجرہ سے باہر آیا تو تو
نے جوتے اتارنے کی جگہ پر کیا کوئی چیز نہیں دیکھی تھی؟ ہشام نے عرض
کی وہاں ایک جامہ پڑا تھا' فرمایا: وہ میں تھا' میں نے عبا کو اپنے سر پر ڈالا ہوا تھا

اور اپنا منہ زمین کی طرف جھکایا ہوا تھا"۔

اسی افسانہ کی طرح امام سجادؑ کے بارے میں ایک افسانہ ہے کہ آپؑ نے کسی مجلس عزاداری میں شرکت کی تھی کہ جہاں پر چراغوں کو بجھادیا گیا تھا۔ جب مجلس ختم ہو گئی تو چراغ دوبارہ روشن کئے گئے۔ کیا دیکھا کہ امامؑ عزاداروں کے جوتے سیدھے کر رہے ہیں۔

۱۷۔ ص ۳۰۱ پر کہتے ہیں: "دو چیزیں سبب ہوئیں ہیں کہ جن سے اس جماعت (ذاکرین، خطباء اور بعض مؤلفین) کو جرأت ہوئی کہ وہ بے بنیاد اخبار و حکایات اور ایسے مآخذ نقل کرتے ہیں جن کے صدق کا امکان بھی نہیں ہوتا، بلکہ بعض تو جھوٹے مصائب جعل کرتے ہیں اور اخبار و حکایات کے نقل کے سلسلے میں دروغ بافی سے کام لیتے ہیں۔

اول: جو اخبار و احادیث رلانے کی مدح اور ترغیب میں وارد ہوئی ہیں، ان میں یہ بات ذکر نہیں کی گئی ہے کہ ذاکر کس قسم کی حکایات و روایات سے مومنین کو رلائے اور کیا کچھ بیان کرے اور کیا پڑھے۔ ان باتوں کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جو چیز بھی رلانے کا سبب اور دلوں کو تڑپانے کا موجب ہو اور آنکھوں سے اشک لانے کا وسیلہ بنے، وہ قابل تعریف اور مستحسن ہے۔ بنابر این یہ کہنا چاہئے کہ وہ بہت سی احادیث جو جھوٹ بولنے کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں، وہ عزاداری کے علاوہ دوسری جگہوں کیلئے ہے۔

اس بیان کے ذریعے تو بہت سے گناہان کبیرہ کو مباح بلکہ مستحب کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً جو بہت سی احادیث قلبِ مؤمن کو خوش کرنے کے بارے میں ہیں، اس لحاظ سے اگر کوئی غیبت کرے یا کسی عورت کے رخسار کا بوسہ

لے یا کسی بیگانہ سے زنا یا لواط کرے اور اگر یہ سرور دینے اور دل خوش ہونے کا سبب ہو تو جائز ہے"۔

۱۸۔ ص ۳۰۵ : یزد سے تعلق رکھنے والے ایک موثق اہلِ علم نے مجھ سے بیان کیا کہ : "جب میں اس کٹھن راستے سے یزد سے پا پیادہ مشہد گیا تو راستے میں خراسان کے ایک دیہات میں پہنچا جو نیشابور سے قریب تھا۔ چونکہ میں وہاں اجنبی تھا، اسلئے وہاں کی مسجد میں چلا گیا۔ مغرب کے وقت دیہات کے رہنے والے جمع ہو گئے تو خادم نے ایک چراغ روش کر دیا۔ اسی اثناء میں ایک پیش نماز آیا اور مغرب و عشاء کی نمازیں باجماعت پڑھی گئیں۔ پھر پیش نماز بالائے منبر جا کر بیٹھ گیا۔ خادمِ مسجد نے اپنا دامن پتھروں سے بھرا اور انہیں بالائے منبر مولوی صاحب کے پاس رکھ دیا۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے ؟ مولانا صاحب نے تقریر کا آغاز کیا۔ ابھی چند کلمات ہی پڑھے ہوں گے کہ خادم نے اٹھ کر چراغ گل کر دیا۔ میری حیرت اور بڑھ گئی۔ اسی حال میں میں نے دیکھا کہ منبر پر سے سامعین پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی اور لوگوں کی چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایک کہتا تھا اے وائے میرا سر، دوسرا اپنے بازو کو پکارتا، تیسرا اپنے سینے کو اور اسی طرح گریہ و شیون بلند ہوا۔ کچھ دیر بعد پتھر ختم ہو گئے، مولانا نے دعا کی، چراغ روشن کر دیا گیا اور لوگ خون بہتے سر اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ چلے گئے۔ آخر کار میں اس پیش نماز کے پاس گیا اور ان کے اس قبیح عمل کی حقیقت دریافت کی۔ وہ بولے : میں مجلس پڑھتا ہوں مگر لوگ اس عمل کے بغیر گریہ نہیں کرتے، لہٰذا لامحالہ میں اس عمل کے ذریعہ ان کو رلاتا ہوں"۔ (تاکہ امام حسینؑ پر رونے کا ثواب مل جائے)۔

۱۹۔ ص ۳۰۶ : دوئم : "اپنی تالیفات میں ضعیف روایات کو نقل کرنا، فضائل، قصص اور مصائب کے ابواب میں غیر صحیح روایات کو ضبط تحریر میں لانا اور ان مقامات، خصوصاً آخر الذکر مقام میں کاہلی اور سستی سے کام لینا علماء میں جاری سیرت ہے، جسے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے"۔

مرحوم حاجی نوری اس کے بعد ادلۂ سنن میں تسامح (تساہلی) کے مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور ضعیف حدیث اور موہون حدیث (یعنی بے وزن اور بے بنیاد خبر) کے درمیان فرق بتاتے ہیں اور کہتے ہیں : وہ احادیث جو قابل تسامح ہیں وہ ضعیف احادیث ہیں، نہ کہ احادیث موہونہ۔

۲۰۔ ص ۳۱۵ پر کہتے ہیں : زعفر جنّی کا قصہ اور حضرت قاسم کی شادی کی داستان علماء کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔ یہ دونوں قصے روضۂ کاشفی (روضۃ الشہداء ص ۳۲۲) میں ہیں اور موخرالذکر قصہ شیخ طریحی کی کتاب "منتخب" میں بھی ہے۔ یہ کتاب بے بنیاد اور موہون روایات پر مشتمل ہے مثلاً اس میں دشمنوں کا جناب "عبدالعظیم حسنی" کو ملک رے میں زندہ دفن کرنا بیان ہوا ہے (المنتخب ص ۱۰)۔

۲۱۔ ص ۳۱۶ : "شادی کا قصہ "روضۂ کاشفی" سے پہلے کسی بھی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ البتہ زبیدہ، شہربانو اور قاسم ثانی کے قصے، رے کی سرزمین اور اس کے اطراف میں زبان زد عام تھے۔ یہ سب فضول خیالی قصے ہیں...... تمام علماء انساب اس بات پر متفق ہیں کہ قاسم ابن الحسنؑ کے کوئی اولاد نہ تھی (بلکہ آپؑ کمسن تھے)"۔

۲۲۔ ص ۳۱۷ پر کہتے ہیں : "مسعودی کہ جو شیعہ ہیں اور مرحوم کلینیؒ کے ہم عصر ہیں، انہوں نے "اثبات الوصیۃ" میں حضرت سید الشہداءؑ کے ہاتھوں

قتل ہونے والوں کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو لکھی ہے اور وہ بھی اس عبارت کے ساتھ و روی انه قتل بیده ذلك اليوم الفاً و ثمانمائة۔ "روایات میں آیا ہے کہ اس دن آپکے ہاتھ سے ایک ہزار آٹھ سو افراد مارے گئے"۔ محمد بن ابی طالب نے اس تعداد کو ایک ہزار نو سو پچاس تک پہنچایا ہے جبکہ وہ کتاب جو ہزار سال بعد تالیف ہوئی ہے (دربندی اسرار الشهادة) اس میں حضرت سید الشہداءؑ کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد تین لاکھ، حضرت ابی الفضل العباسؑ کے ہاتھوں قتل ہونے الوں کی تعداد پچیس ہزار اور باقی تمام اقربا و انصار کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد بھی پچیس ہزار لکھی ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ امامؑ نے ہر سیکنڈ میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے، تو تین لاکھ آدمی کے قتل کے لئے ۸۳ گھنٹے اور ۲۰ منٹ چاہئیں، اور یہ مشکل تو روز عاشورا کو ۷۲ گھنٹے کا دن بتانے سے بھی حل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح پچیس ہزار آدمیوں کو قتل کرنے کیلئے، اگر ایک سیکنڈ میں ایک نفر قتل ہو تو کیلئے چھ گھنٹے اور ۵۶ منٹ اور ۴۰ سیکنڈ کا وقت درکار ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مشکل یہ ہے کہ سولہ لاکھ نفر کے لئے کربلا میں جگہ کہاں تھی؟ ان کے وسائل و اسباب کہاں سے فراہم ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ سارے لوگ کوفہ سے تھے، حجاز اور شام سے کوئی نہیں تھا[۱]! خداوند عالم ان کو کچھ عقل عنایت فرمائے"۔

۲۳۔ ص ۳۲۷ پر محدثِ نوری ایک اور افسانہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہم

---

[۱]۔ (یہاں پر انسان کو وہ افسانہ یاد آتا ہے کہ جو ایک مبالغہ گو شخص نے شہر ہرات کی بڑائی بیان کرتے ہوئے تاریخ کے حوالہ کر دیا کہ اس زمانے میں ہرات میں اکیس ہزار احمد نام کے یک چشم کلہ پائے والے انسان لیتے تھے۔ ایسی ہی مثل سَرو کاشمیر نے بھی لشکر فرعون کے مقابل بنی اسرائیل کی تعداد کے بارے میں کہی ہے۔)

پہلے کچھ افسانے ذکر کر چکے ہیں' اسلئے اس کو بار ہواں افسانہ قرار دیتے ہیں :

یب۔ "ایک روز امیر المومنین علیہ السلام بالائے منبر خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت سید الشہداءؑ کو پیاس لگی۔ آپؑ نے پانی مانگا۔ حضرت نے قنبر کو پانی لانے کا حکم دیا۔ حضرت عباسؑ اس وقت بچے تھے' جب انہوں نے بھائی کی پیاس کو سنا تو دوڑ کر اپنی مادر گرامی کے پاس آئے' ایک کوزے میں بھائی کے لئے پانی لیا اور اسے اپنے سر پر رکھ کر چلے۔ کوزے سے پانی چھلک رہا تھا اور اسی حال میں مسجد میں داخل ہوئے۔ جب پدر بزرگوار جناب امیر المومنینؑ کی نظر ان پر پڑی تو رو پڑے اور فرمایا: "آج اس طرح سے ہے اور روز عاشورا ایسا ہو گا......"۔

یہ قصہ کوفہ ہی کا ہونا چاہئے کیونکہ اس میں خطبہ اور منبر کی بات کی گئی ہے۔ اس زمانہ میں حضرت ابی عبد اللہ کی عمرِ مبارک تیس سال سے زیادہ تھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس عمر کا شخص لوگوں کی موجودگی میں باپ سے اور وہ بھی خطبہ کے دوران پانی کی درخواست کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ قصہ کسی بھی مصادر صحیح میں نہیں آیا ہے۔

یج۔ "حضرت ابو الفضلؑ نے جنگ صفین میں اسّی آدمیوں کو یکے بعد دیگر ہوا میں پھینکا تھا اس تیزی کی ساتھ کہ ابھی ان میں کا پہلا واپس نہیں آیا تھا اور ان میں سے جو بھی گرتا اسے شمشیر سے دو ٹکڑے کر دیتے......"۔

ید۔ ص ۳۲۳ : "ان لوگوں نے (جھوٹے قصے بیان کرنے والوں نے) اس ذُرّیتِ طاہرہ' خاص کر حضرت ابی عبد اللہ الحسینؑ کے ساتھ ایسی کنواری بیٹیوں کو شریکِ سفر کر دیا جن میں سے کچھ کو آپؑ مدینہ ہی میں چھوڑ جاتے ہیں' بعض کی کربلا میں شادی کر دتے ہیں اور بعض کو جبرئیلؑ کے قول

"صَغیرُ ھم یمیتھم العطش "(تمہارے بچوں کو تشنگی مار دے گی) کی صداقت کے لئے کربلا میں پیاس سے مرنے دیتے ہیں اور بعض کو قتل گاہ میں عبداللہ بن الحسن کی مانند شہید کرتے ہیں......"۔

۲۴۔ص ۳۳۵ : پر کتاب کے خاتمہ پر میرزانوری "اخبارِ کاذبہ اور جھوٹی حکایات و قصص سننے کی مذمت میں اور بے پرواہ ذاکرین کی طرف سے کہی گئی اس قسم کی باتوں کے حوالہ سے سامعین کی ذمہ داری کے بارے میں" فرماتے ہیں :۔

"خداوند عالم یہود بلکہ منافقین کی مذمت اور ان کی صفات خبیثہ اور افعال قبیحہ کے بیان میں فرماتا ہے :"سمّاعون للکذب اکّالون للسُّحت"۔ " یہ جھوٹ کے سننے والے اور حرام کے کھانے والے ہیں"(سورۂ مائدہ ۴۲)۔اہل جنّت کے بارے میں فرماتا ہے :"لا یسمعون فیھا لغواً ولا کذّاباً"۔"وہاں نہ کوئی لغویات سنیں گے نہ جھوٹ "(سورۂ نساء آیت ۳۵)۔اہل دوزخ کہ جو دنیا میں دروغ گوئی کے عادی تھے' وہ آخرت اور مقام قیامت میں بھی اس دروغ کو ترک نہیں کریں گے۔"ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون مالبثو غیرساعة کذالك کانو یوفکون "۔ "جس دن قیامت برپا ہوگی تو مجرمین قسم کھاکر کہیں گے کہ وہ دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے 'درحقیقت یہ اسی طرح دنیا میں بھی افترا پردازیاں کرتے تھے"۔(سورۂ روم ۵۵)

اور یہ بھی فرماتا ہے :"ویوم یبعثم الله جمیعاً فیحلفون له کما یحلفون لکم ویحسبون انھم علی شئ الا انھم ھم الکاذبون"۔"جس دن خدا ان سب کو دوبارہ اٹھائے گا تو یہ لوگ جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اسی طرح اس (خدا) کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور خیال

کریںگے کہ وہ حق پر ہیں۔ آگاہ ہو یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں" (سورۂ مجادلہ آیت ۱۸) اور یہ بھی ارشاد فرماتا ہے: "ثم لم تکن فتنتهم الا ان قالوا والله ربّنا ماکنّا مشرکین☆ انظر کیف کذبوا علی انفسهم وضلّ عنهم ما کانوا یفترون"۔ "اس کے بعد ان کا کوئی فتنہ نہ ہوگا سوائے اس کے کہ یہ کہہ دیں کہ خدا کی قسم ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھئے انہوں نے کس طرح اپنے آپ کو جھٹلایا اور کس طرح ان کا افتراء حقیقت سے دور نکلا"۔ (سورۂ انعام آیت ۲۳۔۲۴) اور فرمایا: "واجتنبوا قول الزور"۔ "لغو اور مہمل باتوں سے اجتناب کرتے رہو" (سورۂ حج آیت ۳۰)۔ اور یہ بھی فرمایا: "والّذین لایشهدون الزور"۔ "اور وہ لوگ جھوٹ اور فریب کے کاموں کے پاس حاضر بھی نہیں ہوتے ہیں" (سورۂ فرقان: ۷۲)۔

۲۵۔ ص ۳۴۳: "نیز اس کی مذمت اور قبح پر زبان کے اکثر گناہوں جیسے غیبت، غنا، سبّ، بہتان، استہزاء اور اس قسم کے دیگر گناہوں کا استقراء دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ جیسے شرع میں غیبت کرنا حرام ہے، اسی طرح اس کا سننا بھی حرام ہے اور جیسے گانا گانا حرام ہے، اسی طرح اس کا سننا بھی حرام ہے۔ جس طرح خداوند عالم کے اولیاء یا کسی مومن کو سبّ وشتم کرنا کفر یا معصیت ہے، اسی طرح اس کا سننا بھی حرام ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:
"وقدنزّل علیکم فی الکتاب ان اذاسمعتم آیات الله یکفربها و یستهزءُ بها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره انکم اذاً مثلهم......"۔ "اور اس نے کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب آیات الٰہی کے بارے میں یہ سنو کہ ان کا انکار اور استہزاء ہو رہا ہے تو خبردار ان کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا، جب تک کہ وہ دوسری باتوں میں مصروف نہ ہو جائیں،

ورنہ تم ان ہی کی طرح ہو جاؤ گے ......" (سورۂ نساء : ۱۴۰)۔ جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوا' ایسا ہے گویا اس نے آیات الٰہیہ میں سے کسی آیت کے ساتھ استہزاء کیا۔

۲۶۔ ص ۳۴۹ : پس اب ضروری ہے کہ اربابِ دانش و بینش حضرت اباعبداللہ کی مجالسِ عزا میں مصائب کو نئے سرے سے ترتیب دیں اور آپؑ کے وجودِ مبارک پر اسوقت زائرین' مجاورین اور خدام کی طرف سے' آپؑ کے علوم کے حاملین' متعبدین' ناسکین' ماموین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کی جانب سے' جو انواع واقسام کے صدمات شب و روز پہنچ رہے ہیں' انہیں جمع کر کے کسی دیندار دلسوز کے ہاتھ میں دیں تاکہ وہ اہل تقویٰ و دیانت اور صاحبانِ غیرت و عصبیت کی مجالس میں انہیں پڑھے' انہیں رُلائے' تڑپائے اور خداوند عالم سے سلطانِ ناشرِ عدل و امان' باسطِ فضل و احسان اور قامع کفر و نفاق و عدوان کے ظہور میں تعجیل کی دعا کرے۔

---☆---☆---☆---

۲۷۔ یہ بحث چار ابواب میں بیان ہو گی :

الف۔ تحریف کے معنی اس کی اقسام اور یہ خاص طور پر حادثۂ عاشورا میں ہونے والی تحریفوں کی اقسام۔

ب۔ تحریف کے عمومی عوامل واسباب اور حادثۂ عاشورا میں تحریف کے خصوصی عوامل۔ بالفاظ دیگر حوادث میں تحریف کے اسباب بطور عمومی اور اس حادثہ میں بطور خصوصی۔

ج۔ ان تحریفوں کی تشریح جنہوں نے لفظاً یا معناً' شکلاً یا روحاً' حادثۂ عاشورائے حسینی میں کردار ادا کیا۔

د۔ بطور عموم علمائے امت کا وظیفہ اور بالخصوص حادثۂ کربلا میں تحریف کے مقابل بطور خاص علمائے دین کی ذمہ داریاں کہ : "اذا ظهرت البدع فعلى العالم ان يظهر علمه والا فعليه لعنة الله"۔ "جب بھی بدعتیں رونما ہوں عالم پر ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کو آشکار کرے' وگرنہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی"۔ (اصول کافی ج ا ص ۵۴) اور یہ بھی : "وانّ لنا فی كل خلف عدولاً ينفون عنّا تحريف الغالين و انتحال المبطلين"۔ "ہمارے لئے ہر نسل میں کچھ ایسے عادل لوگ ہیں کہ جو غلو کرنے والوں کی تحریف اور بطلان کرنے والوں کی جھوٹی باتوں کو ہم سے (دین سے) دور کرتے ہیں"۔ (اصول کافی ج ا ص ۳۲) مسئلۂ تحریف میں عام طور پر اور اس تاریخی حادثہ کی تحریف میں خاص طور پر ایسی مجالس سننے اور ان میں شرکت کرنے کی حرمت' نیز عملی طور پر مبارزہ اور نہی از منکر کو لازم جاننے کے لحاظ سے اس مسئلہ میں ملت مسلمان کی ذمہ داری کیا ہے ؟

۲۸۔ **تحریف کے معنی** : راغبِ اصفہانی "مفردات" میں فرماتے ہیں : "حرف الشَّیِٔ طَرَفُهُ...... وتحريفُ الشئ امالته كتحريف القلم وتحريف الكلام ان تجعله على حرف من الاحتمال يمكن على الوجهين ۔ قال عزوجل:يحرّفون الكلم عن مواضعه ...... ومن بعد مواضعه......" "کسی چیز میں تحریف اس میں کجی پیدا کر دینا ہے' جیسے قلم کو ٹیڑھا کر کے مائل کرنا۔ تحریف سخن یعنی جس کلام میں دو معنی کا امکان پایا جاتا ہو' انہیں سے ایک احتمال پر حمل کرنا۔ قرآن میں ہے : یہ لوگ کلمات (کلام قرآن) کو انکے مقامات سے منحرف کر دیتے ہیں...... ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد"۔

تفسیر امام فخر رازی جلد ۳ ص ۱۳۴ پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۷۵ کے ذیل میں ہے: "قال القفّال :التحریف :التغییر والتبدیل' واصله من الانحراف عن الشی والتحریف عنه' قال تعالی:"الا متحرفاً لقتال او متحیزاً الی فئة" والتحریف هو امالة الشیٔ عن حقّه 'یقال :قلم محرّف اذاکان رأسه قطّ مائلاً غیر مستقیم ۔قال القاضی: ان التحریف امّاان یکون فی اللفظ او فی المعنی۔ وحمل التحریف علی تغیر اللفظ اولی من حمله علی تغییر المعنی......"۔ "قفّال کہتا ہے: تحریف تغیّر دینے اور تبدیل کرنے کو کہتے ہیں اور اس کا اصل کسی چیز سے منحرف ہونے سے ہے۔ خداوند متعال نے فرمایا: جو جنگی حکمت عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیں۔ (سورۂ انفال آیت ۱۶)۔ تحریف کسی چیز کو اس کی شائستہ جگہ سے اِدھر اُدھر کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے "قلم محّرف" یعنی وہ قلم کہ جس کی نوک کج ہو گئی ہو۔ قاضی نے کہا ہے: تحریف کبھی لفظ میں ہوتی ہے اور کبھی معنی میں اور تحریف کا مفہوم لفظ کا تغیر لینا معنی کا تغیر لینے سے بہتر ہے"۔

تحریف لفظی یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی لفظ کم کر دیں یا کوئی لفظ اس میں اضافہ کر دیں یا ایک جملہ کو آگے پیچھے کر لیں' اسطرح سے کہ معنی کم یا زیادہ ہو جائیں یا معنی بدل جائیں۔ بزرگ ترین خطرہ اُن تحریفات میں ہے جو معنی کو تبدیل کر دیں۔

اس طرح کی تحریفات کتابوں اور لکھی گئی چیزوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے' حتیٰ کہ اشعار کے متن میں بھی خصوصاً وہاں پر جس کو مصحّح کی اصطلاح میں "شدر سنا" کہتے ہیں۔

مولوی نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے :

از محبت تلخہا شیرین شود　　از محبت مسہا زرّین شود

"یعنی محبت وہ چیز ہے جو کڑوے کو میٹھا بنادیتی ہے ' محبت کیمیاوی اثر رکھتی ہے جو انسانی ہستی کے تانبے کو کندن میں تبدیل کر دیتی ہے"۔ بعد میں ان کے نسخوں میں اضافے ہوتے گئے۔ مثلاً کسی نے کہا "محبت شراب کے میل کو صاف کر دیتی ہے ' درد کو شفا میں اور خار کو گل میں اور 'سرکہ کو شراب میں تبدیل کر دیتی ہے ' دار تخت بن جاتا ہے 'بار کو خوش نصیبی ' پتھر کو تیل ' غم کو خوشی ' جن کو سانپ ' مردہ کو زندہ 'اور بادشاہ کو غلام بنادیتی ہے"۔ اس شعر میں اب یہی باقی رہ گیا ہے۔ بتلایئے کیا یہاں چھت دیوار اور خربوزہ تربوز اور پیالی رکابی نہیں ہو گئی ؟۔

تحریف معنوی۔ اسکی تین مثالیں پیش خدمت ہیں :

الف۔ یاعمّار! تقتلك الفئة الباغية (اے عمار! ایک باغی گروہ آپ کو قتل کرے گا۔)

ب۔ لاحُکم الاالله (خدا کے علاوہ کسی اور کو حکم کرنے کا حق نہیں۔)

ج۔ اذاعرفت فاعمل ماشئت (جب پہچان لیا تو جو چاہو انجام دو۔)

پہلی حدیث سے معاویہ نے سوءِ استفادہ کیا اور دوسری سے خوارج نے جبکہ تیسری حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے ' اس سے شیعوں نے سوءِ استفادہ کیا ' حالانکہ ان احادیث کی توضیح صحیح طریقہ سے خود امامؑ نے کر دی تھی۔

قرآن کریم میں لفظی تحریف تو واقع نہیں ہوئی ہے لیکن معنوی تحریف اور غلط تفسیر بہت زیادہ واقع ہوئی ہے۔

اہل منطق نے باب صنعت مغالطہ میں کہا ہے۔ مغالطہ یا لفظی ہے یا معنوی اور اس کی بہت سی اقسام ذکر کی ہیں۔ یہ مقام ہمارے لئے خصوصاً عربی اور

فارسی مثالیں دینے کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے۔
قرآن کریم کی آیات میں کلمہ کی تحریف کا بہت ذکر آیا ہے اور قرآن اس کی بہت مذمت کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اسکے بہت سے مصادیق بیان ہوئے ہیں مثلاً شخصیت' حادثہ' واقعہ وغیرہ۔ اسی طرح تحریف کی بھی کئی اقسام ہیں مثلاً عبارات کی تحریف' حادثہ یا واقعہ اور تاریخچہ کی تحریف' شخصیتوں کی تحریف' (تیسری قسم کے لئے سید مرتضٰی جزائری کی تقریر جو گفتار ماہ میں ہے' اس کی طرف رجوع کریں)۔

۲۹۔ ہماری بحث دوسری قسم یعنی حادثہ کی تحریف کے بارے میں ہے۔ یہ تحریف ممکن ہے کہ تحریفِ لفظی ہو یعنی نقل میں کم وبیشی کی گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تحریف معنوی ہو یعنی جس سے حادثہ کی روح جو عبارت ہے' علل و اسباب اور اہداف و مقاصد سے' مسخ ہو جائیں۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریف کی اہمیت اس کے موضوع کی اہمیت سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ کہ آیا محرف فیہ (جسکی تحریف کی جائے) ایک عام عبارت' ایک عام حادثہ یا ایک عام شخصیت ہے' یا وہ کہ جو ایک عبارت میں' یا حادثہ یا شخصیت میں واقع ہوا ہے' کسی اجتماع کی تاریخی' اخلاقی' تربیتی اور دینی سند ہے۔ اسی لئے خدا اور رسولؐ پر جھوٹ باندھنا' جھوٹ کی بدترین اقسام میں سے ہے اور روزہ کو باطل کر دیتا ہے۔
قانونی نقطہ نظر سے بھی رسمی اسناد میں جعل اور تحریف کرنا ایک تباہ کار جرم گردانا جاتا ہے' نہ کہ گناہ صغیرہ۔

۳۰۔ واقعاً کتاب مقدس میں اخلاقی حادثے اور عظیم الٰہی نہضتیں خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لوگوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ ان کی حفاظت' انکے لحاظ اور

انکی نگہداری کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں، وگرنہ ملاک و معیار کے لحاظ سے وہ اس آیت کے مشمول ہونگے: "من فسّر القرآن بر ائِہٖ فلیتبوّأ مَقعدَہ ُمن النار"۔ "جو بھی قرآن کی اپنی رائے اور نظر کے مطابق تفسیر کرے، اس کی جگہ جہنم ہوگی"۔ (تفسیر صافی مقدمہ پنجم)

اور اس آیت کے بھی: "فبما نقضھم میثاقھم لعنّاھم وجعلنا قلوبھم قاسیة یحرّفون الکلم عن مواضعه ونسوا حظاً ممّا ذکروا به"۔ "پھر ان کی عہد شکنی کی بناپر ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت بنادیا۔ وہ ہمارے کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹادیتے ہیں اور انہوں نے ہماری یاددہانی کا اکثر حصہ فراموش کردیا ہے"۔ (سورۂ مائدہ: ۱۳)

اوراسی طرح سے اس آیت کے بھی: "فویل للّذین یکتبون الکتاب بایدھم ثم یقولون ھذامن عنداللہ یشتروا به ثمناً قلیلاً فویلٌ لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون"۔ "وائے ہوان لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑے دام میں بیچ لیں ان کے لئے اس تحریر پر بھی عذاب ہے اور اس کی کمائی پر بھی"۔ (سورۂ بقرہ: ۷۹)

۳۱۔ حادثۂ عاشورا میں تحریف لفظی بھی ہوئی ہے اور تحریف معنوی بھی۔ اس میں بہت سے بند و بیل اور کم وزیادہ داخل ہوئے ہیں۔ بہت کم حادثے ایسے ہیں جن میں اس قدر تحریف کا سروسامان پیدا ہوا ہے۔ بقول شاعر:

بس کہ بستند بر او برگ و ساز   گر تو بینی نشناسیش باز

(اس پر اسقدر سروسامان باندھ دیا کہ اگر دوبارہ دیکھے تو اس کو نہ پہچانے)

ایسے دوستوں، اصحاب، دشمنوں، فرزندوں، جملوں کاموں اور سخن کی نسبت

امام سے دی گئی ہیں کہ اگر خود امامؑ سن لیں تو تمیز نہ کر پائیں گے کہ یہ باتیں آپؑ کے بارے میں ہو رہی ہیں۔ بعض افراد کے وہم کے بر خلاف حادثۂ عاشورا تاریخی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ روشن اور ابہامات سے خالی ہے۔ بہت کم ہی ایسے تاریخی واقعات ہیں کہ جن کے اسناد اس حادثہ کی طرح صحیح اور درست حالت میں موجود ہوں۔ ایسا اس حادثہ کی اہمیت کی وجہ سے ہے اور خصوصاً اہل البیتؑ نے اس واقعہ کے جزئیات تک کو آشکار کیا ہے [۱]۔

۳۲۔ تحریف کے اسباب

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کلی طور پر تحریف کے دو عامل ہیں: ایک عداوت اور غرض اور دوسرے افسانہ سازی۔ یہاں پر ہم ایک اور عامل کا اضافہ کرتے ہیں اور وہ ہے دوستی اور اظہار میل و رغبت۔ عامل غرض کی مثال، رسول اکرمؐ سے متعلق مسیحیوں کی جعلی باتیں اور حضرت امیر المومنینؑ کے بارے میں بنو امیہ کی جعل اور تحریفات ہیں۔ اور عاملِ دوستی کی مثال وہ تمام جھوٹی باتیں ہیں جو افراد اور قومیں اپنی نیک ہستیوں کے لئے جعل کرتی ہیں۔ امامؑ کے بارے میں ایسا کرنے والوں کو اخلال گر اور تفرقہ پھیلانے والا کہنا چاہئے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

تاہم بشر میں ''افسانہ سازی'' خود ایک علیحدہ بنیادی حِس ہے جس کے بارے میں ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ جنگ خیبر میں جبرئیلؑ کے پَر زخمی ہونا، اسی طرح مرحب کا دو بالکل برابر ٹکڑوں میں تقسیم ہونا اور خود اس کو بھی کٹنے کا علم نہ ہونے کا افسانہ۔ پھر جنگ صفین میں حضرت ابی الفضلؑ کا اسّی (۸۰) آدمیوں کو ہوا میں

---

[۱]۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام تحریفات امامؑ کی قدر و منزلت کو گرانے کے لئے اور امامؑ کو ایک کم شعور اور پست فکر (العیاذ باللہ) بتانے کیلئے کی گئی ہیں جیسا کہ تیس سے زائد عمر میں آپؑ کا اپنے والد بزرگوار سے، دورانِ خطبہ پانی طلب کرنے کا قصہ، یا حضرت قاسم کی شادی کی مثال ہے۔

اسطرح سے اچھالنا سارے اسّی اوپر پھینک چکے تھے لیکن ان میں کا پہلا ابھی نیچے واپس نہیں پہنچا تھا اور نیچے پہنچتے ہی ان میں سے ہر ایک کے دو ٹکڑے کر ڈالنا۔ اسی طرح میدانِ کربلا میں چھ لاکھ افراد کا قتل کیا جانا' نیز عاشورا کا دن ۷۲ گھنٹے کا ہونا' یہ سب افسانوی قصے ہیں۔

یہ تینوں عوامل پوری دنیا میں تھے اور ہیں۔

خصوصی عامل: اولیاء دین کی طرف سے حکم ہے کہ عزائے حسینؑ قائم کریں' امامؑ کی قبر مطہر کی زیارت کریں اور ایک عظیم فداکار کی حیثیت سے ہمیشہ آپؑ کے نام کو زندہ اور پائندہ رکھیں۔ یہ موضوع تدریجاً سبب بنا کہ بعض پیشہ ور مرثیہ خوان پیدا ہو گئے اور آہستہ آہستہ ایک طرف مرثیہ خوانی نے ایک فن اور ہنر کی صورت اختیار کر لی اور دوسری طرف یہ ذریعۂ معاش بن گیا۔ ایک طرف یہ فکر پیدا ہوئی کہ ابا عبداللہ پر رلانا اجر عظیم اور ثواب جزیل رکھتا ہے اور دوسری طرف الغایات تُبّرِد المبادی (ہدف' وسیلہ کو مباح کرتا ہے) کی بناء پر اس روش نے جنم لیا کہ جو بھی وسیلہ ہو' اس سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں جھوٹ بولنا اور افسانے گھڑنا بعض لوگوں کی نظر میں مطابقِ شرع یعنی جائز ہو جاتا ہے۔

بقول حاجی (نوری) اگر ایسا ہے کہ ایک طرف مومن کے دل کو خوش کرنا مستحب ہے اور دوسری طرف ہدف وسیلہ کو مباح کر دیتا ہے تو پھر غیبت بھی کر سکتے ہیں' یہانتک کہ نامحرم کا بوسہ لینا بھی جائز ہے اور زنا سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر ہمیں سامعین کو پتھر مار کر رلانے والا ذاکر یاد آتا ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہیں پر ہمیں اس ذاکر کے خواب کو سچ سمجھنا چاہیئے کہ جو امامؑ کے بدن کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔

عجب ہے کہ پانچ سو سال پہلے ایک بو قلمون صفت آدمی جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ شیعہ ہے یا سنی (ملاّ حسین کاشفی) "روضۃ الشہداءؑ" کے نام سے ایک کتاب لکھ دیتا ہے۔ یہ آدمی واعظ ہے۔ سبزوار اور بیہق کا رہنے والا ہے جو اس وقت مرکز تشیع تھا۔ اس شخص نے جہاں تک ہو سکا بڑھا چڑھا کر لکھا' حتی کہ اصحاب اور مخالفین میں سے کچھ ایسے نام بھی اس کتاب میں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گھڑے ہوئے ہیں اور ظاہراً اس کے خود ساختہ ہیں۔ یہ کتاب چونکہ فارسی میں تھی' بعد میں مرثیہ پڑھنے والوں کے ہاتھ لگ گئی اور ان کے لئے سند اور مدرک بن گئی۔ چونکہ پڑھنے والے اس کتاب سے دیکھ کر پڑھتے تھے' اسی مناسبت سے انہیں روضہ خوان کہا جانے لگا۔ اس کتاب نے رفتہ رفتہ تمام درست کتابوں کی جگہ لے لی اور یوں یہ کے بجائے جھوٹے مصائب کا منبع اور ماخذ ہو گئی۔ یہ کتاب نویں قرن کے اواخر میں یا دسویں قرن کی ابتدا میں لکھی گئی ہے' اسلئے کہ حسین کاشفی نے ۹۱۰ھ ہجری میں وفات پائی ہے۔ اس کے بعد تیرہویں قرن کے آواخر یا چودھویں قرن کی ابتداء میں ایک اور کتاب لکھی گئی۔ یہ کتا تو اس کتاب کے لئے بھی چیلنج تھی' یہ "اسرار الشہادۃ" کے نام سے لکھی اور چھاپی گئی اور اس نے کام وہاں تک پہنچا دیا جہاں تک پہنچانا تھا۔ البتہ بہت سی دوسری کتابیں جیسے "محرق القلوب" بھی بے تاثیر نہیں رہی ہیں۔

لفظی تحریفات کی مثالیں : جنابِ لیلیٰ اور حضرتِ علی اکبرؑ کی داستان' جناب قاسم کی شادی کی داستان' حضرت ابو الفضل العباس کا بچپن میں حضرت امام حسینؑ کے لئے پانی لانا' حضرت زینب (س) کا ابا عبداللہ کے وقت احتضار انؑ کے بالین پر آنے کا قصہ' اسیران اہل بیت کا اربعین کے موقعہ پر کربلا سے گزرنا' مقتولین کی تعداد' ہاشم بن عتبہ کا ۱۸ ہاتھ لمبے نیزہ کے ساتھ آنا' عاشورا کا دن بہتر (۷۲)

گھنٹے کا ہونا' امام حسینؑ کا بادشاہوں کی سی شان اور دبدبہ کے ساتھ مکہ سے خروج کرنا' امام سجادؑ کا وقایع وحوادث سے بے خبر ہونا' حضرت زینب (س) کا ابا عبد اللہؑ کے لئے گھوڑا لانے اور آپؑ کے گلوئے پاک کو بوسہ دینے کی داستان' امام سجادؑ اور امام صادقؑ کا بے ہوش ہونا' یہ سب کے سب لفظی تحریفات ہیں۔

ان تحریفوں میں سے کچھ حادثۂ کربلا کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے کے زمانہ سے مربوط ہیں' جیسے ابو الفضلؑ کا کم سنی میں امامؑ کے لئے پانی لانا' کچھ کا تعلق دورانِ سفر سے ہے جیسے امامؑ کا مکہ سے شان وشوکت سے خروج کرنا اور کچھ روز عاشورا سے مربوط ہیں جیسے لیلیٰ کی داستان' حضرت قاسم کی شادی کا قصہ' حضرت زینب (س) کا ابا عبد اللہؑ کے احتضار کے وقت انؑ کے بالین پر آنا' حضرت زینب (س) کا امامؑ کے لئے گھوڑا حاضر کرنا' حضرت سکینہ کا گھوڑے کے سُم سے لپٹ جانا' گلے کو بوسہ دینا' ہاشم مرقال کا آنا' زعفر جِن کا آنا' مقتولین کی تعداد' وغیرہ' جبکہ کچھ کے زمانہ حادثہ کے بعد تحریفیں سے مربوط ہیں مثلاً اربعین کا واقعہ' امام سجادؑ کا بے ہوش ہونا اور امامِ صادقؑ کا عزاداروں کے جوتے رکھنے کی جگہ پر گر پڑنا' وغیرہ۔

۳۳۔ تحریف معنوی :

تحریف معنوی کسی جملہ یا حادثہ کی روح اور معنی کو منحرف کر کے' اسے اس کے اپنے اصلی راستے سے ہٹانے کو کہتے ہیں۔ چونکہ ہماری بحث وگفتگو حادثۂ کربلا کے بارے میں ہے' اس حادثہ کی معنوی تحریف یہ ہے کہ اس حادثہ اور قیام کہ جو اہداف ومقاصد ہیں' اسی طرح اس کے جو علل اور اسباب ہیں' ان کو چھوڑ کر کوئی اور بات بتانا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مثلاً آپ کسی سے ملنے کے لئے کہیں جاتے ہیں' یا کسی کو اپنے گھر یا اپنی مجلس میں دعوت دیتے ہیں تو کوئی اور آکر کہتا ہے : جانتے ہو اس آدمی کا تمہارے گھر آنے کا کیا مقصد ہے (یا اس نے تمہیں

کیوں دعوت دی ہے ؟) اسلئے کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی بیٹی تمہارے بیٹے کو دیدے جبکہ در حقیقت آپ دونوں کے مابین کوئی ایسی بات سرے ہی سے نہیں ہے۔

جملوں میں تحریف کی تین مثالوں کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ دنیا کے بہت سے تاریخی حادثات میں، تفسیر و توجیہہ کی غرض سے تحریفیں ہوئی ہیں۔ اور وہ تحریفیں یا عمداً ہے یا جہلاً، ہم ابھی اس کے بارے میں بحث نہیں کر رہے ہیں۔

عاشورا کا یہ بزرگ اور باعظمت حادثہ دوسرے جریانات اور حوادث کی طرح جہاں لفظی اور شکلی تحریفوں سے دوچار ہوا ہے، وہاں اس کی روح اور معنی اور تفسیر و توجیہہ میں بھی ایک اہم تر تحریف کا سلسلہ واقع ہوا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ امام حسینؑ نے ایک ایسا قیام کیا تھا کہ جو عظمت کی تینوں شرائط اپنے اندر لئے ہوئے تھا:

الف۔ ہدف کا مقدس ہونا اور شخصی نہ ہونا۔ یہ قیام چونکہ انسانیت کے لئے تھا، اسلئے اسکا مرکزی خیال فداکاری تھا اور ذاتی منفعت نہ تھی۔ اسی وجہ سے بشریت ایسے افراد کو کہ جنہوں نے اپنے اور دوسروں کے درمیان حدود توڑ ڈالے ہوں، جو اپنے آپ کو دوسروں کا جزء جانتے ہوں اور دوسروں کو اپنا جزء سمجھتے ہوں، امت کا فدائی اور مصلح گردانتی ہے۔

ب۔ آپؑ کا یہ قیام ایک قوی اور نافذ بصیرت کے ساتھ تھا۔ جو چیزیں دوسروں کو ظاہر بیں آنکھوں سے نظر نہیں آتی تھی، آپؑ کو وہ سب پردہ کے پیچھے سے بھی سجھائی دے رہی تھیں۔ جو چیز دوسرے آئینہ میں نہیں دیکھ رہے تھے، آپؑ کچی اینٹ میں دیکھ رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں امامؑ اپنے جامعہ سے آگے تھے۔

ج۔ قیامِ مقدسِ امام حسینؑ ایک ایسا نور ہے جو مکمل تاریکی میں درخشاں ہے، اُسی

تابانی شرح کے ساتھ جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔
دوسری طرف اولیائے دین نے لوگوں کو اس حادثہ کی آگاہی حاصل کرنے' دائمی عزاداری قائم کرنے اور آپؑ کی تربت کی زیارت کرنے کی پُر زور تاکید کی ہے۔
یہاں پر میرا سوال یہ ہے کہ امامؑ نے کیوں قیام فرمایا اور بعد میں اسلام کے پیشواؤں نے کیوں اس حادثہ کو زندہ رکھنے کی تاکید کی؟ جس تحریف نے اصل حادثہ میں سب سے زیادہ جگہ لی ہے وہ یہ ہے کہ (پہلے بتا چکے ہیں) امام حسینؑ نے امت کے گناہوں کا کفارہ دے دیا' خود گنہگاروں کی پناہ گاہ بن گئے اور معصیت کرنے والوں کا بیمہ کر دیا۔
دوسری تحریف یہ قول ہے کہ یہ حادثہ ایک خصوصی اور فردی پہلو رکھتا ہے۔ یعنی ہم نے اس واقعہ کو آسمان سے مربوط کر کے اسے ناقابل پیروی قرار دے دیا اور اسکے وجود کو مکتب مدرسہ 'اور درس گاہ ہونے سے خارج کر دیا۔ ہم نے ایک طرف وقت اور زمانے کے حالات اور اوضاع کو اور دوسری طرف اس سطح پر اسلام کے دساتیر کو سامنے نہیں رکھا کہ جس سے یہ حادثہ ہمارے لئے مکتب اور مدرسہ بن سکے اور تلقین بخش ہو سکے۔
پس ہم نے اس حادثہ کے خلاف دو کام کر ڈالے۔ اول اس کو مکتب اور درس گاہ ہونے سے (خصوصی حکم بتا کر) خارج کر دیا۔ دوم یہ کہ اسے ایک گنہگار بنانے کا مکتب ظاہر کیا اور یہ اعتقاد پیدا کیا کہ جو بھی گناہ کرے 'جم کر سینہ زنی کرنے سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔
ایک اور تحریف فلسفۂ عزاداری سے متعلق ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں کبھی یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت زہراؑ ہمیشہ بہشت بریں میں بیتاب رہتی ہیں' چودہ سو سال ہو گئے ہیں مگر انؑ کے لئے قرار و سکون نہیں ہے' لہٰذا یہ عزاداری اور

ہماری گریہ وزاری ان کے دل کی تسلّی کی خاطر ہے۔ ہمارا یہ رونا آپؑ کے دل میں سکون پیدا کرتا ہے۔ پس لوگ عزاداری کو حضرت زہراء (س) کی ایک خصوصی خدمت سمجھتے ہیں۔

فلسفۂ عزاداری کے دستور کے طور پر بعض لوگ اس واقعہ کو ایک انسان کے ضائع ہونے کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا حداکثر مقام یہ ہے کہ ایک ظالم کے ہاتھوں ہمارا امامؑ بے جرم و خطا مارا گیا۔ پس ہمیں چاہئے اس سے متأثر ہو کر امامؑ کی طرف نگاہ کریں۔ ہم نے یہ فکر نہ کی کہ وہ شخص فقط یہی نہیں کہ برباد نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنے ہر قطرۂ خون کو بے انتہا قدر و قیمت بخشی۔ وہ ایسا شخص تھا کہ جس نے ایسی لہر پیدا کی جو صدیوں تک ستمگروں کے محلوں کو لرزاتی رہی اور اب بھی لرزا رہی ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا کہ جس کا نام اور آزادی، مساوات، عدالت، توحید، خداپرستی اور خود فراموشی ایک ہو گئے ہیں۔ بھلا وہ کس طور برباد ہو گیا ہے؟۔ ہم برباد ہو گئے ہیں کہ ہم نے تمام عمر سوائے پستی اور خواری کی زندگی گزارنے کے کچھ نہیں کیا۔

امامؑ کے قیام کے ہدف اور مقصد کو خود امامؑ نے سب سے بہتر طور پر بیان کیا ہے۔ آپؑ کا ہدف وہی پیغمبر اکرمؐ کا ہدف تھا۔ امامؑ کے خطبے آپؑ کی نہضت کے ہدف کو بیان کرتے ہیں۔ امامؑ نے اپنے قیام کا ہدف امت اسلامیہ کی اصلاح قرار دیا ہے۔ آپؑ چاہتے تھے کہ اسلام کا درس عملی طور پر لوگوں کو سکھلائیں اور دنیا پر واضح کر دیں کہ پیغمبر اسلام کے اہل خاندان جو حضورؐ سے سب سے زیادہ نزدیک ہیں، وہ تمام لوگوں سے زیادہ حضورؐ کی تعلیمات پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ خود پیغمبر اکرمؐ کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ قیام عزائے حسینؑ کا فلسفہ کیا ہے؟ کیونکہ دنیا میں قیام

عزائے حسینؑ سے بالاتر اور بہتر محل نمائش موجود نہیں ہے :

اولاً : یہ قیام مطلقاً درسِ توحید ہے' جہانِ غیب پر ایمان کاملِ اور نفسِ مطمئنہ کا مظہر ہے۔ اس قیام کی روح ہی توحید تھی۔

ثانیاً : درسِ عزاداری اسلئے ہے کہ بشر کی روح حوادث کے مقابلے میں شکست قبول نہ کرے' اس کا تن تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے' تمام مال و متاع بربادی کی نذر ہو جائے' بیٹے قتل کر دیئے جائیں' اہل خاندان اسیر ہوں لیکن اس کی روح ثابت اور مستحکم رہے۔

ثالثاً : دعویٰ اور عمل میں کس قدر فرق ہے۔ آزادی کے دعویدار' آزادی خواہ' حقوقِ بشر کے علمبردار' عدالت کا نعرہ بلند کرنے والے تو بہت ہیں لیکن یہ سب بادشاہ' وزیر اور تربیت شدہ بلّی کی داستان کی مانند ہیں۔ جبکہ مردانِ الٰہی نے عملی طور پر یہ بتایا ہے کہ اگر ایک طرف حق ہو لیکن محرومیت بھی ساتھ ہو' حق ہو مگر قتل ہونے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ساتھ اور دوسری طرف مال و دولت اور تمام چیزیں ہوں مگر یہ سب حق و حقیقت کی پامالی کے ساتھ ساتھ ہوں تو اس وقت کس طرف جانا ہے۔

☆ کربلا کی جنگ میں چند چیزیں دشمن کی شکست کی علامت ہیں :

الف۔ تن بہ تن جنگ کرنے سے اجتناب کرنا۔

ب۔ تیر اندازی اور پتھر مارنا۔

ج۔ عمر سعد کا اپنے لشکر کو حکم کہ جہاںتک ممکن ہو سکے امام حسینؑ کی ذات سے جنگ کرنے سے اجتناب کرو : "ھذا ابنُ قتال العرب' واللہ نفس ابیہ بین جنبیہ"۔ "یہ عربوں کے قاتل کا بیٹا ہے' خدا کی قسم اس کے باپ کی جان اس کے دو پہلو کے درمیان ہے"۔

د۔ عمر سعد کا امام حسینؑ کے خطاب میں مانع ہونے کا حکم تاکہ لوگ آپؑ کی بات نہ سن سکیں۔ پس وہ نہ آپؑ کی شمشیر اور زورِ بازو کا مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ ہی آپ کی منطق اور سخن کے مقابلے کی تاب لا سکتا تھا۔

☆ معرکۂ کربلا میں وہ چیزیں جو امام حسینؑ سے ظہور پذیر ہوئیں :

الف۔ بدنی شجاعت

ب۔ روح و قلب کی قوت

ج۔ حق و قیامت پر ایمان کہ جسکی بدولت ہر آن آپؑ کی بشاشت بڑھتی گئی۔

د۔ صبر و تحمل

ھ۔ رضا و تسلیم

و۔ اطمینانِ قلب اور روحی طور پر ہیجان انگیز نہ ہونا۔ امامؑ سے کوئی بات ایسی نہیں سنی گئی کہ جو ان کے غیض و غضب کی حکایت کرے۔

ز۔ حماسی روح کہ ایسے پُر زور خطبات ارشاد فرمائے۔

دو چیزوں نے امامؑ کی آنکھیں روشن رکھیں :

الف۔ آپؑ کے اہلِ خاندان کی آپؑ کے ہدف سے مکمل ہم آہنگی۔

ب۔ آپؑ کے یاران کی جانفشانی : "ھٰھنا مناخ رکّاب ومصارع عشاق"۔

"یہی سواروں کے اترنے اور عاشقوں کے قتل ہونے کی جگہ ہے"۔

آپؑ کے اہل خاندان اور اصحاب نے یہ بتادیا کہ وہ عاشقانہ طور پر عمل کرتے ہیں۔

پس واقعۂ کربلا کا بے نظیر ہونا اور حاملِ درس و عبرت ہونا ہی عزاداری کی اصلی علت اور اسکا حقیقی فلسفہ ہے۔

۴۳۔ ہمارا وظیفہ :

یہ وظیفہ دو حصوں میں بیان ہونا چاہیئے : علماء کا وظیفہ اور عوام کا وظیفہ یا عصر حاضر کی اصطلاح کے مطابق رسالتِ خواص (علماء کی رسالت) اور رسالت تودہ (عوام کی رسالت)۔ عام طور پر علماء ان انحرافات کو عوام کی گردن پر ڈالتے ہیں اور اسے عوام کی تقصیر اور لوگوں کی جہالت گردانتے ہیں جبکہ انکے مقابل عوام یہ کہتے ہیں کہ اس میں علماء کی تقصیر ہے کہ وہ نہیں بتاتے کیونکہ ماہی از سر گندہ گردد نی زدُم (مچھلی سر سے خراب ہونا شروع ہوتی ہے' نہ کہ دُم سے)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں خواص بھی مسؤل ہیں اور عوام بھی علماء بھی مسئول ہیں اور عام لوگ بھی' یہ مچھلی سر سے بھی خراب ہوئی ہے اور دُم سے بھی' سر اور دُم دونوں ہی اس خرابی کے مشترکہ طور پر مسؤل ہیں۔

اس سلسلے میں خواص اور عوام کے وظیفہ کے بیان سے پہلے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تقصیر کس سے سرزد ہوئی ہے۔ یہاں پر وظیفہ کس کا ہے' یہ ایک موضوع ہے' اور تقصیر کس سے ہوئی ہے' یہ دوسرا موضوع ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ تقصیر میں دونوں شریک ہیں اور یہ مچھلی سر کی طرف سے بھی سڑی ہے اور دُم کی طرف سے بھی' اسی طرح وظیفہ کے لحاظ سے بھی ہم آگے بیان کریں گے کہ دونوں طبقے مسؤل ہیں۔ نہ گناہ کسی ایک طبقہ کا گناہ ہے اور نہ ہی وظیفہ بالخصوص کسی ایک طبقہ کا وظیفہ ہے۔

اس سے قبل کہ وظیفہ بیان ہو' اس وظیفہ کی اہمیت کو درک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تحریف کے خطرات بیان کیئے جائیں۔

کلّی طور پر دنیا کی تمام چیزیں کسی نہ کسی آفت سے دوچار ہیں۔ جماد' نبات اور حیوان سے لے کر انسان تک سبھی آفت میں مبتلا ہیں مثلاً کتاب کی آفت کیڑا ہے

اور لکڑی کی آفت گھن فصل اور سبزہ کیلئے سونڈی' ٹڈی آفت ہیں اور بعض جراثیم حیوانوں یا انسانوں کیلئے آفت ہیں۔ اسی طرح سے خود دین کیلئے بھی کچھ آفات ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : "آفۃالدین ثلاثۃ :فقیہٌ فاجرٌ وامام جائرٌ ومجتھد جاھلٌ"۔ "تین چیزیں آفتِ دین ہیں : فاجر فقیہ 'ستمگار پیشوا اور جاہل مجتہد"۔

یہ بات آشکار ہے کہ ہر چیز کیلئے ایک خاص آفت ہوتی ہے جو خود اسی سے نسبت رکھتی ہے۔ کبھی بھی کانٹے دار کیڑے دین کیلئے آفت نہیں ہوتے' سونڈی اور ٹڈی بھی ہرگز دین کو نہیں کھاتے۔ جذام اور سرطان بھی دین کو نہیں مٹا سکتے۔

تحریف' قلب اور بدعت دین کیلئے عظیم آفتیں ہیں ؁۱۔ تحریف اس کے حقیقی چہرہ کو تبدیل کر دیتی ہے' اس کی اصلی خاصیت کو ختم کر دیتی ہے' ہدایت کی جگہ گمراہی لے کر آتی ہے۔ اچھے کاموں کی طرف تشویق دینے کے بجائے معصیت اور گناہ کا شوق دلاتی ہے۔ فلاح کی جگہ شقاوت لے آتی ہے۔ تحریف' پیٹھ میں چھرا گھونپتی ہے۔ یہ وہ ٹیڑھی ضربت ہے کہ جو سیدھی ضربت سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہودی جو دنیا کی تاریخ میں تحریف کے چیرہ دست ہیں' ہمیشہ ٹیڑھی ضربت لگاتے ہیں۔ علیؑ کو دوستانہ تحریف کے ذریعے بہت کاری ضرب لگائی گئی جبکہ دشمنی کے راستے سے ایسا نہیں کر سکے۔ قطعی طور پر حضرت علیؑ کے ناداں دوستوں کی طرف سے آپؑ پر جو ضربتیں لگیں' وہ دشمنوں کی مار سے کہیں زیادہ کاری اور تیز کاٹ والی تھیں۔

تحریف' عکس العمل کے بغیر کا مبارزہ ہے۔ تحریف' خود اپنی قوت کے ذریعہ مبارزہ کرتی ہے۔

؁۱۔ حدیث : اذا عرفت فاعمل ماشئت کی داستان ایک اچھی مثال ہے۔ تحریف کے نتیجہ الٹ دینے سے متعلق یہ داستان استاد شہید کی کتاب "حق وباطل" میں باب "احیای تفکر اسلام" میں موجود ہے۔

تحریف ہی سبب ہوتا ہے اس بات کا کسی شخص کا چہرہ کلی طور پر تبدیل ہو جائے ' مثلاً علیؑ کو ایک ہیبت ناک ' بد شکل اور بڑی مونچھ والے پہلوان کی صورت پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت کہ کبھی بھی باور نہ کر سکیں کہ یہ وہی مرد محراب و منبر ' صاحبِ حکمت و قضاوت ' صاحبِ زہد و تقویٰ اور خدا سے ڈرنے والا شخص ہے۔

تحریف ہی کے ذریعہ سے امام سجادؑ کو ہمارے درمیان بیمار امام کے نام سے معروف کیا گیا ہے۔ تنہا فارسی بولنے والوں ہی نے یہ نام ان حضرتؑ کو دیا ہوا ہے۔ بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ ہم جب کبھی یہ بتانا چاہیں کہ فلاں شخص نے اپنے آپ کو ضعف اور زبونی میں ڈالا ہے ' تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے خود کو امام زین العابدینؑ بیمار کی طرح بنا دیا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ شہرت محض اس وجہ سے ہے کہ امامؑ فقط ایام عاشورا میں بیمار رہے ' نہ یہ کہ تمام عمر بخار میں مبتلا رہے اور نہ ہی امامؑ کمر خمیدہ چلتے تھے۔

مرحوم آیتی نے "راہ ورسم تبلیغ" کے عنوان سے جو تقریر انجمن ماہانہ دینی میں فرمائی تھی وہ نشر ہو چکی ہے (جلد ۲ ص ۱۶۰)۔ اس میں اسی موضوع کو عنوان قرار دیکر آپؒ فرماتے ہیں: چند دن پہلے ایک شخص نے مجلۂ اطلاعات میں وضعِ حکومت اور حکومتی اہلکاروں پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ لوگ اکثر یا دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہیں یا نالائق ' خائن اور ناپاک ہیں جبکہ ہم ایسے افراد کے نیاز مند ہیں کہ جو لائق بھی ہوں اور پاک بھی۔ اس مطلب کو یوں لکھا تھا: "ہمارے اکثر اہلکار یا شمر ہیں یا امام زین العابدینؑ بیمار ' آج ہمارے ملک کی صورتحال یہ ہے کہ ہمیں ہر زمانہ سے زیادہ حضرت عباسؑ جیسوں کی ضرورت ہے یعنی ایسے افراد جو پاک بھی ہوں اور کام کرنے والے بھی ہوں"۔ مطلب یہ ہے کہ شمر کام کرنے والا تھا لیکن ناپاک جبکہ امام زین العابدینؑ پاک تھے مگر کام نہیں

کر سکتے تھے۔ ان دونوں کے بر خلاف حضرت عباسؑ اچھے تھے کیونکہ وہ پاک وپاکیزہ بھی تھے اور کام کرنے والے بھی ہے۱۔

یہ جو کہتے ہیں عارفاً بحقہ، یعنی ''امامؑ کی معرفت لازم ہے'' تو اس لئے ہے کہ امامت کا فلسفہ پیشوائی کرنا ہے' امامؑ کی ذات نمونہ اور سر مشق ہوتی ہے۔ امامؑ سب پر فوقیت رکھنے والا انسان ہوتا ہے' نہ کہ مافوق انسان۔ اسی بناء پر وہ ہمارا سر مشق ہو سکتا ہے۔ اگر امامؑ مافوق انسان ہو تو وہ کسی طرح بھی نمونہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب ہم شخصیتوں کو مافوق انسانی پہلو دے دیتے ہیں یا حادثات کو معجزہ گردانتے ہیں تو ہم ان سے درس لینے یا انہیں رہبر تسلیم کرنے سے خارج کر دیتے ہیں۔ سر مشق ہونے اور نمونہ بننے کیلئے صحیح اطلاع لازم ہے۔ غلط اور تحریف شدہ اطلاعات الٹا نتیجہ دیتے ہیں اور پھر کسی بھی صورت وہ اچھے کاموں کیلئے الہام دینے والے اور تاریخ کو صحیح سمت کی طرف حرکت دینے والے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ بنیادی طور پر کوئی قوت ہی نہیں ہوتے۔ امام زین العابدینؑ کو بیمار کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی جو شخص زیادہ آہ و فغاں کرتا ہے' لوگ اُسکی تقدیس کرتے ہیں کہ یہ آقا بیمار امام کی شبیہ ہے۔

یہاں تک ہم تحریف کے خطرات سے واقف ہوئے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ مقصّر (قصوروار) کون ہیں؟ خواص یعنی علماء بھی مقصر

ہے۱۔ مرحوم شمس واعظ کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ قبل ہمیں مشہد میں کسی گھر میں دعوت دی گئی۔ ہم نہیں جانتے تھے اور ہمارا خیال یہ تھا کہ کوئی رسمی دعوت ہوگی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ لوگ بھی زیادہ تھے۔ کھانے میں آش پیش کیا گیا۔ اس آش کا کیا کہنا۔ کیا آش تھا وہ۔ توانائی کے لحاظ سے اسقدر ثقیل تھا کہ ہاتھ ہی میں نہ آتا تھا' جہاں ہاتھ لگاؤ پھسل جاتا تھا۔ صاحبِ خانہ سے کہا کہ خدا آپ کے باپ کو بخشے' خلق خدا کے گلے میں ڈالنے کیلئے یہ کیا چیز پیش کی ہے۔ انہوں نے جواب دیا: آقا ایسی بات کیوں کرتے ہیں' یہ آش امام زین العابدینؑ بیمار کی نذر ہے۔ انہوں نے جواب دیا یقیناً آپ ٹھیک کہتے ہیں' اسی آش نے امام کو بیمار کیا ہوگا۔

ہیں اور عوام یعنی غیر علماء بھی۔ علماء اس لحاظ سے مقصر ہیں کہ شریعت ختمیّہ کے اس دور میں ان کو چاہئے کہ تحریف کے مانع بھی ہوں اور تحریف کو رفع اور زائل کرنے کی بھی سعی کریں۔ حدیث میں ہے کہ: "اذا ظهرتِ البدع فعلی العالم ان یظهر علمه والاّ فعلیه لعنة الله"۔ اور "کافی" کی یہ حدیث بھی وانّ لنا فی کلّ خلف عدولاً ینفون عنّا تحریف الغالین و انتحال المبطلین (دونوں احادیث کا ترجمہ پہلے ذکر ہو چکا ہے)

علماء کا اولین وظیفہ یہ ہے کہ لوگوں کے نقوص، عیوب اور سست روی سے مبارزہ کریں، نہ یہ کہ ان کی کمزوریوں سے استفادہ کریں، مثلاً آج کل مجالس عزاداری میں لوگوں میں دو کمزور نکات پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ لوگ بڑی شدت سے چاہتے ہیں کہ مجالس میں بہت زیادہ اجتماع اور ازدحام ہو اور دوسرے وہ یہ چاہتے ہیں کہ گریہ کے لحاظ سے مجلس زور پکڑے اور رونے کا شور بپا ہو گویا مجلس کربلا ہو جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر ایک خطیب دوراہے پر ہوتا ہے کہ لوگوں کا ازدحام پیدا کرے، خوب مجمع لگائے اور مجلس کو کربلا کر دے یا حقائق کہے اگرچہ نہ ازدحام ہو اور نہ ہی شور وواویلا بپا ہو۔

علماء کو چاہئے کہ تحریفات پیدا کرنے والے اسباب و عوامل سے مبارزہ کریں۔ دشمنوں کی تبلیغات کی لگام کو تھام لیں۔ دشمنوں کے ہاتھوں کو کوتاہ کریں، افسانہ سازی کرنے والوں سے مبارزہ کریں۔ مثلاً حاجی نوری کی کتاب "لؤلؤ مرجان" اپنے وظیفہ پر ایک شائستہ قسم کا قیام ہے کہ جو اس مرد بزرگ نے کیا ہے اور ہم آج اُن کے کام کے نتیجے سے استفادہ کر رہے ہیں۔ علماء کو چاہئے کہ وہ جھوٹ بولنے والوں کی رسوائی اور ذلت کو ظاہر کریں۔ (لہٰذا کہتے ہیں کہ غیبت کے جائز ہونے والے موارد میں سے ایک راویٔ حدیث پر جرح کرنا ہے)۔ علماء کا

فرض ہے کہ وہ سچی اور معتبر احادیث کے متن کو، بزرگ ہستیوں کے حقیقی چہرے کو اور تاریخی واقعات کے حقیقی متن کو لوگوں کے حوالے کریں اور جھوٹ کے جھوٹ ہونے کی طرف اشارہ اور تصریح کریں۔

بزرگ شخصیتوں کے بارے میں جو تحریف ہوئی ہے اس کو سمجھنے کیلئے آج کل کی زبان حال پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ کچھ زبانِ حال ہیں جو واقعاً شخصیتِ امامؑ کا آئینہ ہیں جیسے علامہ اقبالؒ کے اشعار اور حجۃ الاسلام تبریزی کے کچھ اچھے اشعار لیکن کچھ زبان حال ایسے بھی ہیں کہ جو شخصیت کی تحریف کرتے ہیں جیسے :

افسوس کہ مادری ندارم......ای خاک کربلا تو بہ من مادری نما......

یہ چیز امام حسینؑ کی عظیم اور بے نظیر شخصیت کی زبان حال نہیں ہو سکتی بلکہ یہ تو بنیادی طور پر کسی بھی ستاون (۵۷) سالہ شخص کی زبان حال نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی بھی اس عمر میں ماں کی آغوش نہیں ڈھونڈتا۔ اسکے برعکس یہ عمر تو وہ ہوتی ہے کہ جب ماں اپنے فرزند کی پناہ میں آتی ہے۔ امام حسینؑ نے اگر اپنی مادر گرامی کو یاد فرمایا ہے تو حماسہ اور افتخار کی صورت میں : "انا ابن علی الطهر من آل هاشم ...... وفاطم امّی ...... یابی الله ذلك لنا ورسوله وحجور طابت وطهرت ونفوس ابية وانوفٌ حميّة"۔ اسی طرح کی دوسری مثالیں بھی ہیں۔

عوام کی تقصیر اور ان کا وظیفہ :

سب سے پہلے ہم ایک کلی اصول جس کا حاجی نوری نے لؤلؤ مرجان میں ذکر کیا ہے، یہاں ذکر کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے : وہ چیز جس کا بولنا حرام ہو (عام طور پر یا غالبًا) اس کا سننا بھی حرام ہے مثلاً غیبت، تہمت، مومن یا اولیاء کے لئے گالی گلوچ اور ان کی سب و شتم کرنا، بے ہودہ آواز سے غنا یعنی گانا وغیرہ۔ پس اگر مجالس اور ذکر مصائب میں جھوٹ بولنا حرام ہے تو اس کا سننا بھی حرام ہے۔

ثانیاً خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے :

"واجتنبوا قول الزور"۔ "اور لغو اور مہمل باتوں سے اجتناب کرتے رہو" (سورۂ حج آیت ۳۰)۔ "والذین لا یشھدون الزور"۔ "اور وہ لوگ جھوٹ اور فریب کے پاس حاضر بھی نہیں ہوئے ہیں" (سورۂ فرقان آیت ۷۲)۔ "سمّاعون للکذب سمّاعون لقوم آخرین"۔ "جھوٹی باتیں سنتے ہیں اور دوسری قوم کے لوگ جو آپ کے پاس حاضر نہیں ہوتے" (سورۂ مائدہ آیت ۴۱)۔ "سمّاعون للکذب اکّالون للسّحت"۔ "یہ جھوٹ کے سننے والے اور حرام کے کھانے والے ہیں" (سورۂ مائدہ آیت ۴۲)۔ "وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفربھا ویستھزءُ بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا من حدیث غیرہ انکم اذاً مثلھم"۔ "اور اس نے کتاب میں یہ بات نازل کردی ہے کہ جب آیات الٰہی کے بارے میں یہ سنو کہ ان کا انکار اور استھزاء ہو رہا ہے تو خبردار ان کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا جب تک وہ دوسری باتوں میں مصروف نہ ہو جائیں" (سورۂ نساء ۱۴۰)۔

کلی طور پر عوام اس چیز (تحریفات) کا تصرف کرنے والے ہیں۔ عوام ان تحریفات کو، جن کے بارے میں غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ ملاوٹی اور بدلی ہوئی چیزیں ہیں، اگر استعمال نہ کریں تو اس کی نمائش کرنے والے اور اسے پیش کرنے والے بھی ہمت نہ کریں گے۔ لیکن اس قضیہ کا عیب یہ ہے کہ اس کے دل بستہ یا شوق دلانے والے بھی عوام ہی میں سے ہیں۔

عام لوگ تحریفات سے جنگ کیلئے اٹھ کھڑے ہونے کے بجائے ان کی حمایت کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ کیا اشکال ہے کہ قاسم کی شادی بھی درست ہو؟ ہم یہ جواب دیں گے کہ اولاً کوئی بھی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ ثانیاً

ایسی کوئی چیز کسی معتبر یا نیم معتبر مدرک قدیم میں اگر ہوتی کہ جو اصلی مدارک ہیں‘ تب تو یہ بحث ہو سکتی تھی کہ آیا ایسا ہونے میں کوئی بات مانع ہے یا نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی جگہ پر بھی یہ واقعہ نقل نہیں ہوا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ صبح عاشورا اصحاب اور اہل بیتؑ نے ایک گھنٹہ کوئی کھیل کھیلنے میں گزارا تو اس میں کیا مانع ہے؟ لیکن آیا ایسا کوئی کام کیا ہے یا نہیں؟

رشدِ اجتماعی

اس مقام پر رشدِ اجتماعی کے بارے میں بحث ہونا چاہئے‘ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ’رشدِ اجتماع‘ پر بحث کریں‘ نہ کہ ’رشدِ اجتماعی‘ پر۔ اجتماع کا رشد فرد کی رشد کی طرح ہے۔ خود رشد کیا ہے؟ رشد یعنی انسان اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں فکری اور عقلی پختگی رکھتا ہو۔ مثلاً ایک پہلو ازدواج ہے۔ رشدِ ازدواج یہ ہے کہ انسان ازدواج کے معاملہ میں اس قدر فکر اور عقل رکھتا ہو کہ وہ شریک حیات کے انتخاب میں اپنی صلاح کو اور خانوادی زندگی سے متعلق مسائل کو درک کر سکتا ہو۔ بالفاظ دیگر یہ سمجھ سکتا ہو کہ ازدواجی زندگی کے بارے میں کیا چیزیں لازم ہیں اور کیا چیز لازم نہیں‘ کونسی چیزیں اہم ہیں اور کونسی چیزیں اہم نہیں‘ کونسی چیزیں ترجیحات میں پہلے درجہ کی اہمیت رکھتی ہے اور کونسی دوسرے اور تیسرے درجہ کی اہمیت۔ دوسرے الفاظ میں اتنا رشد رکھتا ہو کہ اپنے فائدہ اور نقصان اور ان کے عوامل کو تشخیص دے سکے۔ اسے ازدواج میں معتبر رشد ہونا کہیں گے۔ ازدواج (کہ جو ایک واحدِ اجتماع ہے) کے لئے محض جسمی اور جنسی رشد کافی نہیں ہے۔

رشدِ اقتصادی یہ ہے کہ انسان اس حد تک پہنچے کہ مال کی حفاظت اور نگہداری کر سکتا ہو‘ بلکہ اسے زیادہ کرنے اور نفع بخش بنانے کے لازمی عوامل اور اپنی مصالح کو سمجھ سکتا ہو۔ اگر یہ شرائط اس میں موجود نہ ہوں تو وہ رشید نہیں اگر

کوئی شخص رُشد کی عمر سے گزر گیا ہو مگر رشید نہ ہوا ہو تو اسے ''سفیہ'' کہتے ہیں۔ لیکن اگر ابھی رشد کی حد تک ہی نہیں پہنچا ہے اور کمسن ہے 'اسلئے رشید نہیں ہے' تو ایسے کو سفیہ نہیں کہا جاتا۔ ''وابتلوا الیتامیٰ حتی اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشداً فادفعوا الیھم اموالھم''۔ ''اور یتیموں کا امتحان لو اور جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں تو اگر ان میں رشید (بالغ) ہونے کا احساس کرو تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو'' (سورۂ نساء آیت ٦)۔

پس رشید (بالغ) کسی بھی جہت میں وہ شخص ہے جو اس موضوع کے بارے میں فائدہ اور نقصان کو درک کر سکتا ہو اور اس سے مربوط موضوعات کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتا ہو۔ جب تک وہ اس قدر و قیمت کو نہ سمجھے 'اسکے لئے حفظ و نگہداری کا کام کرنا اور انجام وظیفہ پر قدرت رکھنا ممکن نہیں۔ ازدواج میں رشید (بالغ) وہ لڑکا یا لڑکی ہے جو خانوادہ تشکیل دینے کی ضروری چیزوں کو درک کر سکے۔ پس وہ لڑکا جو کسی لڑکی کی خوبصورتی یا اس کے سرخ ہونٹ یا اُس کے چلنے کے انداز پر شیفتہ ہو جائے اور اس بنا پر اس سے شادی کرنا چاہے' وہ رشید نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ سعادتمندانہ زندگی گزارنے کیلئے سینکڑوں عوامل ضروری ہیں اور سرخ لب ان میں شامل نہیں۔ اس نے سعادتمندانہ زندگی کے عوامل کی قدر و قیمت کو درک نہیں کیا ہے۔ اسی طرح جو شخص سرمایہ سے مربوط لازم چیزوں کو نہیں سمجھ پاتا وہ معاملہ کی بات طے کرنا نہیں جانتا' خائن اور خادم افراد کو نہیں پہچانتا۔ وہ نہیں جانتا کہ کن افراد سے نزدیکی اختیار کرے اور کن افراد سے دور رہے۔ ایسا شخص رشید نہیں ہے۔

رُشدِ اجتماع:

بہتر یہ ہے کہ 'رُشد اجتماعی' کی جگہ جو فرد کی صفت ہے ''رشد اجتماع' کو کہ جو

جامعہ (معاشرہ) کی صفت ہے' موضوع بحث و گفتگو قرار دیں۔ جامعہ بھی کبھی رشید (بالغ) ہوتا ہے اور کبھی سفیہ یا حداکثر نابالغ۔ وہ جامعہ (معاشرہ) جو خود کو ایک واحد درک نہ کرے' اپنے سرمایوں کی قدر نہ کرے' اپنی تاریخی شخصیتوں اور تاریخی واقعات کو نہ سمجھے' ایسا جامعہ رشید نہیں۔

جامعہ کے سرمایوں میں سے ایک اسکی گزشتہ شخصیتیں ہے۔ اسی طرح ہنر' علم' صنعت' ادب کے گزشتہ آثار' سب جامعہ کا سرمایہ ہیں۔

ایک اور سرمایہ اسکی گزشتہ تاریخ ہے' وہ تاریخ جو پُر افتخار' درس دینے والی اور سعادت بخش ہو۔ گزشتہ تاریخی واقعات آئندہ نسلوں کے لئے اخلاقی اور تربیتی سند ہوتے ہیں۔

کبھی کسی ایک ملت کے اندر ہنری یا صنعتی آثار پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ان کے بعد آنے والے اس کی قدر و قیمت کو درک نہیں کرتے اور اس کو خراب کر دیتے ہیں۔ ایسا بہت ہوا ہے کہ کسی نادر کتاب کا نفیس خطی نسخہ کسی دوکاندار کے ہاتھوں لگ جاتا ہے اور وہ اس کو پھاڑ کر چائے کی پڑیا بنا کر کام میں لاتا ہے۔ کچھ ہنری اور صنعتی آثار' جیسے بہت سے محراب کاشی کاری اور بہت سی نقاشیاں غیر صالح افراد کے ہاتھ لگ گئے اور بچوں کے کھلونوں کے طور پر استعمال ہوئے۔

اسی طرح سے تاریخ بھی ہے۔ کبھی ملت کا کوئی فرد تاریخ میں بلند مقام حاصل کرتا ہے' وہ حماسہ' افتخار' زیبائی' عظمت اور الہام بخشی سے پُر ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح سے جب ایک نفیس اور منقش طغرا بچوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ قلم کے ذریعے اس کو خراب کر دیتے ہیں' اسی طرح سے یہ لوگ بھی اپنی طرف سے اس قدر افسانے اور خرافات اور اپنے وہم اس شخصیت کے ساتھ ملحق کر دیتے ہیں کہ کلی طور پر اس کی عظمت' بزرگی' خوبروئی' الہام بخشی' حماسہ' نجات بخشی اور افتخار

کو کھودیتے اور نابود کردیتے ہیں۔ نتیجتاً اس کی الہام بخش، پُر عظمت، حماسہ گر اور سلح شور روح سے متحرک ہونے کے بجائے بے چارگی اور بدبختی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حوادث کے مقابلہ میں ان کا سر تسلیم جھک جاتا ہے۔

کربلا کا تاریخی واقعہ اس نوع کے حوادث میں سے ہے کہ اجتماع کے عدم رشد یعنی کم عقلی کی وجہ سے مسخ اور اُلٹا ہو گیا ہے۔ اس کی تمام عظمتیں اور خوبصورتی فراموش ہو گئی ہیں، اس کا حماسہ، شور اور افتخار محو ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ بے چارگی، ضعف، جہالت اور نادانی نے لے لی ہے۔

یہ سب اس ملت کی عدم رشد (کم عقلی) کی علامت ہے کہ یہ اپنی پُر عظمت اور پُر افتخار تاریخ کی حفاظت اور نگہداری نہیں کر سکی۔

میں تمام ملت کے حوالہ سے لیکن بالخصوص عوام کے طبقہ کے لحاظ سے یہ بتانا چاہوں گا کہ گزشتہ پُر افتخار تاریخ کے تحفظ اور نگہداری کی مسئولیت فقط علماء سے مخصوص نہیں۔ ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مسئول جانے۔ جس طرح ان حوادث و واقعات پر جھوٹ باندھنا، جھوٹ بولنے کی طرح حرام ہے، اسی طرح جھوٹ کا سننا اور جھوٹ کو مصرف میں لانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ پر حکم ہے: "واجتنبوا قول الزور"۔ "جھوٹی سے بات اجتناب کرو" (سورۂ حج آیت ۳۰)۔ ایک اور جگہ پر حکم ہے: "والذین لایشھدون الزور واذا مرّوا باللّغو مرّو کراماً"۔ "اور وہ لوگ جو باطل (جھوٹ اور فریب) کی مجالس میں شرکت نہیں کرتے ہیں اور جب لغو کاموں کے قریب سے گزر ہو جائے تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں"۔

تفسیر کشاف میں مندرجہ بالا پہلی آیت کے ذیل میں "زور" کے معنی باطل اور جھوٹا قول ذکر ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں: "وجُمع الشرك وقول الزور فی قِران

واحد وذلك ان الشرك من باب الزور لانّ المشرك زاعم انّ الوثن تحق له العبادةُ ،فكانّه قال : فاجتنبوا عبادة الاوثان الّتی هی رأس الزور"۔ "شرک اور قول زور ایک ہی ردیف میں ذکر ہوئے ہیں۔ شرک، خود زور سے ہے کیونکہ مشرک یہ سمجھتے ہیں کہ بُت پرستی لائق اور سزاوار ہے۔ گویا اس آیہ میں فرمایا ہے کہ بتوں کی پرستش کرنے سے پرہیز کرو کہ یہ تمام زور اور جھوٹ وباطل کی ابتداء ہے......" یہاں تک لکھا ہے کہ :الزور من الزورَ والا زورار وھو الا نحراف۔ "زور، زَوَر اور وِزار سے لیا گیا ہے جو انحراف کے معنی میں ہے"۔

دوسری آیہ کی تفسیر میں کہتے ہیں :

"یحتمل انهم ینفرون عن مجالس الکذّابین ومجالس الخطّائین فلا یحضرونها ولا یقربونها تنزّها عن مخالطة الشرّ واهله، وصیانةً لدینهم عمّا یثلِمُهُ ،لانّ مشاهد الباطل شرکه فیه۔ ولذلك قیل فی النظارة الی کلّ مالم تسوّغهُ الشریعة:هم شرکاء فاعلیه فی الاثم، لانّ حضورهم ونظرهم دلیل الرضا به وسبب وجوده ، لان الّذی سلّط علی فعله هو استحسانُ النظارة ورغبتهم فی النظر الیه، وفی مواعظ عیسیؑ: ایاکم ومجالسة الخطّائین"۔

"ممکن ہے اس آیت کے معنی یہ ہوں کہ وہ لوگ جھوٹے اور خطاکاروں کی مجالس سے دوری اختیار کرتے ہیں، ان میں شریک نہیں ہوتے ہیں، ان کے نزدیک نہیں ہوتے ہیں تاکہ بُری باتوں اور بُرے لوگوں سے نہ ملیں اور ان سے منزہ رہ جائیں اور اپنے دین کو رخنہ سے محفوظ رکھیں کیونکہ باطل کے پاس حاضری دینا ان کے ساتھ شریک ہونے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کے بارے میں کہ جو شریعت میں

جائز نہ ہونے والی چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ : یہ لوگ ان تمام بُرے کام کرنیوالوں کے سارے گناہ میں شریک ہیں کیونکہ وہاں پر حاضر ہونا اور نظارہ گر رہنا اس کام پر اپنی رضایت دینے اور اس کے وجود پر راضی ہونے کی دلیل ہے' کیونکہ فاعل کا عمل دیکھنے والوں کو اس عمل کی تشویق دلانا ہے اور اس کے دیکھنے سے دوسروں میں اسکے لئے رغبت پیدا کرتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کی نصیحتوں میں سے ایک میں آیا ہے : خطاکاروں کی ہمنشینی سے پرہیز کرو"۔

پس پہلی آیت فقط جھوٹی اور پُر فریب باتوں سے پرہیز کرنے کو کہتی ہے جس میں بولنا اور سننا دونوں شامل ہیں۔ البتہ بولنا اس کا مصداق جلی ہے۔ لیکن دوسری آیت رسمی طور پر باطل مجالس میں شرکت سے منع فرماتی ہے۔ خواہ باطل کو سننے کیلئے شریک ہوں یا باطل کو دیکھنے کیلئے' یہ آیت در حقیقت گناہ کی کسی بھی طور سے اعانت کرنے کو منع کرتی ہے۔

ایک اور آیت ہے :"وقدنزّل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا ویستھزءُ بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ"۔ "اور اس نے کتاب میں یہ بات نازل کر دی کہ جب آیات الٰہی کے بارے میں یہ سنو کہ ان کا انکار اور استہزاء ہو رہا ہے تو خبردار ان لوگوں کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا جب تک وہ دوسری باتوں میں مصروف نہ ہو جائیں"۔(سورۂ نساء : ۱۴۰)

تفسیر صافی میں ہے امام صادقؑ نے فرمایا :"وفرض اللہ علی السمع ان یتنزہ عن الاستِماع الی ماحرّم اللہ ' وان یعرض عمّا لا یحلُّ لہ مما نھی اللہ عنہ والاصغاء الی ماasخط اللہ' فقال فی ذلک: وقد نزّل علیکم......"
"خداوند عالم نے کان پر یہ واجب کیا ہے کہ جو چیزیں حرام ہیں ان کے سننے سے

پرہیز کرے اور جو چیز اس کے لئے حلال نہیں ہے، جن سے خدا نے منع فرمایا ہے اور جن کا سننا خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے، ان سے دوری اختیار کر لے۔ اور اس بارے میں اپنی کتاب میں فرمایا ہے: اور تم پر اپنی کتاب......"۔

تفسیر صافی میں ہے: القمّی :آیات الله هم الائمة علیهم السلام ۔ "آئمہ علیہم السلام خدا کی نشانیاں ہیں"۔

ظاہراً یہاں آیات سے مراد "ائمہ" ہے۔ یہاں آیات سے مراد آیاتِ تدوینی بھی ہے اور آیاتِ تکوینی الٰہی بھی۔ ائمہ یعنی وہ شخصیتیں جیسے آئمہؑ یا وہ تاریخی حوادث جیسے حادثۂ کربلا، کہ یہ آیات تکوینی الٰہی ہوتے ہیں۔ ایسی تواریخ جو روح ایمان کا مظہر اور جلا بخش ہوں، وہ آیات الٰہی کا جزء ہیں۔

"واذا رأیت الّذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره......"۔ "اور جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری نشانیوں کے بارے میں بے ربط بحث کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مصروف ہو جائیں"۔......(سورۂ انعام: ۶۸)

تفسیر صافی میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے: "العیاشی: عن الباقرؑ فی هذه الایة قال :الکلام فی الله والجدال فی القرآن ـ قال : منه القُصّاص"۔ "امام باقرؑ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: اس آیت میں گفتگو خود خدا کی ذات کے بارے میں ہے جبکہ اختلاف قرآن سے متعلق ہے۔ ان ہی باطل باتوں میں سے ایک سازی ہے"۔

تفسیر صافی میں اسی آیت کے ذیل میں یہ بھی ہے "فی العلل، عن السجادؑ: لیس لك ان تقعدمع من شئت لان الله تبارك وتعالیٰ یقول: واذا رأیت الذین یخوضون"۔ "امام سجادؑ نے فرمایا: یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ جس کے

ساتھ چاہو نشست و برخاست کرو کیونکہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات کے تمسخر اور تکذیب پر اتر آئے ہیں......۔"

عوام کے وظیفہ پر بحث کا خلاصہ :

الف۔ ایک اسلامی اور اخلاقی بحث تو یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا بولنا حرام ہے' اس کا سننا بھی حرام ہے۔ وظیفہ کے لحاظ سے کان اور زبان ایک قسم کا اشتراک رکھتے ہیں۔ چونکہ کان زبان کی چیزوں کا مصرف ہے' اسلئے اگر مصرف ہی نہ ہو' یعنی سننے والے کان ہی نہوں' تو زبان بنائے گی بھی نہیں۔ اگر کان والے اکاذیب' جھوٹی اور جعلی باتوں' غیبتوں' گالی گلوچ اور کفر آمیز باتوں کا مصرف نہ کرتے تو اہل زبان انہیں نہ تخلیق کرتے اسی طرح آنکھ اور زبان' قلموں اور فلموں کے آثار کا مصرف ہیں' اگر یہ دونوں مصرف نہ کریں گے تو وہ دونوں تولید ہی نہ ہوں گے۔

ب۔ اس بارے میں آیات قرآنی

ج۔ بحث اجتماعی: جس طرح کوئی شخص کبھی رشید ہوتا ہے اور کبھی غیر رشید اور جس طرح رشد' ازدواج کے صحیح ہونے کی شرط ہے' اور جس طرح مال و ثروت کسی کے ہاتھ میں دینا اسی وقت جائز ہے کہ جب وہ رشید ہو' جامعہ' معاشرہ یا اجتماع بھی اسی طرح ہے۔ کبھی ایک اجتماع رشید ہوتا ہے اور کبھی سفیہ۔

رُشد کے معنی' قدر و قیمت کا احساس کرنا' سرمایوں کا درک کرنا' اُن سے صحیح طور پر استفادہ کرنا اور نفع اُٹھانا ہے۔ ازدواج کے لئے رشد یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ خانوادی زندگی کے لئے کیا چیزیں لازم ہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک کی قدر و قیمت کیا ہے؟ مثلاً یہ کہ لڑکی ایک معروف گھرانے سے ہو' اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ازدواج کے لئے کتنا مفید ہے۔ اسی طرح سے

کسی شخص کا مال و ثروت اپنے اختیار میں لینے کیلئے رشید ہوتا ہے۔

رُشد اجتماع یہ ہے کہ سب سے پہلے اجتماع خود کو ایک اکائی کی صورت میں درک کرے۔ اس کے وہ سرمائے کہ جو عمومی اور ملی سرمایہ شمار ہوتے ہیں' ان کو پہچانے۔ اس کے بعد انکی حفظ و نگہداری کیلئے کوشش کرے یہ ملّی سرمائے یا تو شخصیتیں ہیں یعنی تاریخی شخصیتیں' یا علمی، فلسفی، ہنری، صنعتی اور ادبی آثار ہیں یا ملت کی پُر افتخار تاریخ ہے۔

وہ جامعہ کہ جو حسینؑ بن علیؑ کی مانند تاریخ رکھتا ہے' وہ تاریخ کہ جو افتخار' حماسہ، عظمت' زیبائی اور الہام بخشی سے بھری ہوئی ہے' آج ہم نے اس کو ''روضۃ الشہداء'' اور ''اسرار الشہادۃ'' نامی کتب کے احمقانہ افسانوں سے پُر کر دیا ہے' ایسا کرنے والے در حقیقت کم عقل لوگوں کا ٹولہ ہے' نہ کہ جامعۂ رشید۔ آج ہم جس طرح اپنے تاریخی اور ملی آثار کی حفاظت کرتے ہیں' اسی طرح سے ہمیں خود اپنی تاریخ کی حفاظت کے لئے بھی کوشش کرنا چاہئے۔

یادداشت

۱۔ قرآن میں تحریف کا بیان اور قرآن کی توجیہ و تفسیر: جیسے تفسیر صافی اور علی بن ابراہیم۔

۲۔ شخصیت علیؑ میں تحریف جیسے کربلا: میں شیر کی داستان کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حضرت علیؑ تھے کہ جو دریا سے نمودار ہوئے تھے!۔

۳۔ تاریخ اسلام میں تحریف: جسے یہ قول کہ اسلام حضرت خدیجہ کی ثروت اور علیؑ کی تلوار سے پھیلا ہے۔

۴۔ شقی شخصیتوں میں تحریف: یہ بھی ایک قسم کا انحراف ہے جو عبرت پکڑنے

میں مانع ہوتا ہے۔ مثلاً غالباً معاویہ کو سات افراد سے ہونیوالا ولدالزنا متعارف کرایا جاتا ہے اور نتیجتاً لوگ کبھی بھی چودہ سو سالہ پہلے کے معاویہ سے عبرت نہیں لیتے۔ اسی طرح مثلاً کہتے ہیں کہ کتیا کی طرح شمر کے سات پستان تھے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا نام شیخ عبداللہ تھا۔

چھٹا باب

کتاب "حسینؑ وارث آدمؑ" پر ایک تنقید

حسینؑ وارث آدمؑ

یہ کتاب ڈاکٹر علی شریعتی کی تالیف ہے۔ سنہ ۵۱ ہجری شمسی کے ۲۶ سے ۳۰ آذر ماہ کو جب میں ایک سفر میں مشہد گیا تھا تو اس کتاب کا ایک نسخہ انتشارات طوس نے مجھے دیا جسے میں نے واپسی پر تہران آتے ہوئے دورانِ سفر پڑھا۔ اس کتابچہ کے ہدف کے بارے میں چند مطالب ہاتھ آئے جو لفافے کے نیچے بیان ہوئے ہیں خود کتابچہ لکھنے والے نے اپنے تمام عقدوں اور عقیدوں کو اس کتابچہ میں بیان کر دیا ہے"۔ وہ یہ ہے :

۱۔ یہ کتابچہ ایک طرح سے تاریخ کی توجیہ ہے مگر مادّی مارکسیسی بنیاد پر۔ یہ امام حسینؑ کے واقعہ کو مارکسیسی نوعیت کا گلشن بتلاتا ہے جو تازگی رکھتا ہے۔

اس کتابچہ کے مطابق تاریخ بشریت کا آغاز اشتراکیت اور مساوات سے ہوا۔ بعد میں جب طبقہ بندی (ضدِ مساوات) نے رواج پایا تو حق و باطل تخلیق ہوئے یعنی مالکیت کا آغاز ہوا اور یہاں سے جامعۂ بشر کے دو حصے ہو گئے۔ جس طرح دجلہ اور فرات ایک ہی چشمہ سے نکل کر آتے ہیں مگر بعد میں دو حصوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں' اسی طرح سے انسان کے بھی دو حصے یعنی دو طبقہ ہیں' ایک کامیاب اور فائدہ اٹھانے والا طبقہ یعنی استحصال کرنے والا گروہ اور دوسرا محروم طبقہ یعنی استحصال شدہ گروہ۔ کامیاب اور فائدہ اٹھانے والے گروہ کے تین چہرے ہیں : سیاست' اقتصاد اور مذہب۔ یا یوں کہیں مال و دولت رکھنے والے' طاقت و قدرت رکھنے والے اور مکرو فریب کرنے والے۔ پہلے گروہ کا کام غلام بنانا ہے' دوسرے گروہ کا کام غارت گری اور تیسرے گروہ کا کام فریب دینا ہے۔ گویا محل' دکان اور معبد ایک ایجنسی کے تین شعبے ہیں' تیغ' طلا اور تسبیح ایک کام کرتے ہیں۔

تاریخ پر حاکم نظام ہمیشہ اسی طرح رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا' وہ محکوم نہضتیں تھیں' ایسے قیام اور انقلاب تھے جو دلسوز اور مذبوحانہ تھے کیونکہ ان کی بنیاد خراب اور کمزور تھی ۔ ایسی تمام نہضتوں کا نتیجہ اُلٹا ہوا جو ابراہیموں' یہودیوں' مسیحیوں' مسلمانوں' علویوں اور حسینیوں کے وسیلہ سے اٹھی تھیں۔ جو چیز انسان کیلئے دال' روٹی کی بناء بنکر آئی' وہی اسکے لئے جان کی بلا اور اس کے ہاتھ پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

امت موسیٰ کی آزادی بے دوام تھی (ص ۲۲) 'امام حسینؑ کی نوا بھی خاموش تھی' لیکن سامری کے گوسالہ کی بانگ ہمیشہ سے بلند ہے (ص ۲۴)۔ تمام وراثانِ آدم کی حتمی سرنوشت اسیری اور گرفتاری ہے (ص ۲۸)۔ آزادی' عدالت اور بیداری تاریخ کی محکوم نہضتوں کی وراثت ہے 'غلامی' بے انصافی اور خیالی مذہب تاریخ پر حاکم رہا ہے (ص ۳۹)۔ امام حسینؑ آدم کی شکست کا مظہر ہیں (۴۷)۔

اس کتابچہ میں دو دریاؤں کے درمیان کی سرزمین اور تمام زمین کا نمونہ بتلایا گیا ہے اور اس زمین کی تاریخ کو تمام زمین کی تاریخ کا نمونہ گردانا گیا ہے۔ دجلہ اور فرات کے دور دریاؤں کو بشر کے دو متضاد گروہ کی علامت قرار دیا ہے کہ دونوں جدا ہوئے اور بغداد کے قرب میں پھر سے جھوٹ جھوٹ باہم پیوند ہو گئے' بالکل ویسے ہی جیسے دور خلافت اسلامی میں وقتی طور پر جھوٹی وحدت پیدا ہوئی تھی (ص ۹' ۲۹' ۳۹) اور پھر دوبارہ زیادہ دردناک شکل میں جنایت واقع ہو جاتی ہے۔ دنیا کے تمام جنایتکار خلافت اسلامی کے تین قسم کے چہروں (یعنی بنوامیہ' بنو عباس اور خلافت عثمانیہ) میں سے کسی ایک روپ میں ظہور اور حلول کرتے ہیں اور بدبختی یہ شروع ہو جاتی ہے کہ دنیا میں اس سے پہلے اسکی کوئی مثال نہیں ہے (ص ۱۵' ۲۷' ۲۸' ۳۵)۔ تمام برے لوگوں میں جو کچھ بُرائیاں ہیں وہ تنہا

ان تین ادوار میں موجود رہی ہیں۔

دجلہ اور فرات کی تقدیر یہ ہے کہ انجام کار سمندر میں جاگرے اور آرام پائے۔ بشریت کی سرنوشت اور بشر کی تاریخ کا سرانجام بھی اشتراکیت اور سوشلزم ہے اور بشر فقط اس وقت ہی مالکیت اور طبقاتی نظام کی قید سے نجات پائے گا جب طبقاتی نظام کی بنیاد میں خرابی آئے گی اور واقعی بنیاد پر عدل وانصاف کا نظام درست ہو جائیگا۔

تاریخ کے انقلابیوں کی طبقاتی بنیاد پر کوششیں دل سوز رہی ہیں گلا تو کٹوادیا مگر انجام بے نتیجہ رہا ہے۔ فقط طبقات کو محو کر کے ہی جامعہ اپنی سعادت واقعی تک پہنچ سکتا ہے (ص ۹) الا بالاشتراکیة تطمئن القلوب۔

امام حسینؑ تنہا اور ناامید مرگ کی طرف دوڑتے ہیں (ص ۲۳)۔ آپؑ شکست آدم کا ایک مظہر ہیں اور ایک بے سود تعصب خراج میں دیتے ہیں (ص ۴۷)۔

اس کتابچہ میں کلی طور پر لفظ آدم یا لفظِ انسان کی علامت اشتراکی انسان کو قرار دیا گیا ہے ہے اس میں اشتراکیت کو توحید جہان' توحید کی توضیح اور جامعہ کی وحدت قرار دیا گیا ہے بالکل ویسے ہی جیسے شرک اعتقادی' شرک وثنویّت حیات کا ایک سایہ ہے۔ اس بیان سے دوبارہ سے مارکسیسی جہت کی ایک قسم روشن ہوتی ہے کہ انسان کے وجدان (نفس اور قوائے باطنی) کو اس کے وضع اجتماعی کا مولود اور اس کا انعکاس سمجھا گیا ہے۔ اور یہ بیان "دورکایم" (۱۸۵۸-۱۹۱۷ع) کے نظریہ کا عکاس ہے' نہ کہ کارل مارکس کا نظریہ۔

اس کتابچہ میں جو چیز نظر نہیں آتی وہ شخصیت امام حسینؑ ہے اور آپؑ کی نہضت کے آثار ہیں۔ اس کتابچہ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ طبقاتی جامعہ میں تمام کوششیں لاحاصل ہوتی ہیں۔ تاریخ کے انقلابی لوگ اور حضرت آدمؑ کے وارث' اشتراکی انسان تھے اور ان کا قیام حق کیلئے تھا۔ حق یعنی عدالت' برابری یعنی اشتراکیت۔

اس کتابچہ کے مطابق امام حسینؑ وہی ذاکرین کے مظلوم اور محکوم امام حسینؑ ہیں کہ جن کا تاریخ میں کوئی نقش نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذاکرین نے کم از کم امام حسینؑ پر رونے کا دستر خوان بچھایا ہے تاکہ یہ آخرت کا توشہ بن جائے لیکن اس کتابچہ کے امام حسینؑ تو محکوم طبقہ کو دبانے کیلئے۔ (رونے اور مصائب کے ذریعے) حاکم طبقہ کے ہاتھ کا آلۂ کار ہیں۔

اس کتابچہ میں معبد (عبادت گاہ) ہمیشہ قصر اور دکان کے پہلو میں اور روحانی ہمیشہ حاکم اور سرمایہ داروں کے پہلو میں قرار دیئے گئے ہیں۔ البتہ معبد کو ایک طرف ڈال رکھا ہے' نہ تنہا کلیسا' یا دیر وصومعہ (راہب کی عبادت گاہ' یا آتشکدہ یا بتخانہ) کو کیونکہ مسجد بھی معبد ہی میں شامل ہے۔ ایسی صورتحال میں طبیعی طور پر روحانی کی ذمہ داری بھی روشن اور واضح ہے۔

ساتواں باب

حماسہ حسینیؑ کی یادداشت

حماسۂ حسینیؑ

۱۔ حماسۂ حسینی کا مفہوم واضح ہونے کے لئے لازم ہے کہ پہلے کلمۂ حماسہ کی تفسیر اور معنی بیان کئے جائیں "نہایۃ" (ج ۱) میں ابن اثیر کہتے ہیں :

"الحُمس جمع الاحمس وهم قريش ومن ولدت قريش، وكنانة ، و جديلة قيس۔ سُمّوا حمساً لانّهم تحمّسوا فى دينهم اى تشدّدوا ۔ والحماسة الشجاعةُ ،كانوا يقفون بمزدلفة ولا يقفون بعرفة، ويقولون : نحن اهل الله فلا نخرج من الحرم وكانوا لا يدخلون البيوت من ابوابها وهم محرمون"۔

"حُمُس جمع ہے اَحمَس کی۔ یہ قریش کا طائفہ اور ان کی اولاد اور کنانہ کا طائفہ اور جدیلۃ قیس ہیں۔ ان کا نام یوں حُمس پڑ گیا کہ وہ اپنے دین میں تَحَمّس یعنی شدت اور استواری اپناتے تھے۔ حماسہ کے معنی شجاعت کے ہیں۔ ان لوگوں کی عادت یہ تھی کہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور عرفات میں وقوف نہیں کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ : ہم اہل اللہ ہیں ' اسلئے حرم سے باہر نہیں نکلتے۔ نیز حالت احرام میں یہ لوگ اپنے گھروں میں دروازہ سے داخل نہیں ہوتے تھے"۔

قاموس میں ہے : "حَمِسَ ۔ كفرحَ :اشتدّ وصَلُب فى الدين والقتال فهو حَمِسَ وأحمَسُ"۔ "حَمِسَ بروزن فَرِحَ ہے۔ اسکے معنی دین اور میدان کارزار میں سخت اور محکم ہونا ہے۔ اسی فعل سے لفظِ حَمِس اور اَحمَس ہیں"۔

اصطلاحی طور پر بعض اشعار کے لئے کلمۂ "حماسہ" کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہت سی کتابیں "حماسہ" کے نام سے تالیف ہوئی ہیں اور اسی لئے کہ ان کتابوں میں ایسے اشعار کی تضمین ہیں۔

نظموں اور اشعار کو عام طور پر مندرجہ ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے :
حماسی، رثائی، مدحی، غنائی، وعظ اور نصیحتی نظمیں اور اشعار۔ البتہ اور بھی اقسام ہیں۔

حماسی شعر وہ شعر ہوتا ہے جو غیرت، شجاعت، شدت اور مردانگی کی روح کو ابھارتا ہے، خواہ خود شعر کا مضمون حماسی ہو یا اس میں کسی پہلوان یا قہرمان کی سرگزشت پر مضمون باندھا گیا ہو۔ بشر قہرمان دوست اور قہرمان پرست ہے۔ حماسی شعر کی ایک مثال یہ شعر ہے :

تن مردہ و گریۂ دوستان   بہ از زندہ و خندہ دشمنان

"زندہ رہ کر دشمنوں کو ہنسانے سے بہتر ہے مر جائے اور دستوں کو رلائے۔"

حماسی داستانوں کی مثال ایران کے قدیم افسانے اور تاریخ اسلام کی اور ایران کی واقعی داستانیں ہیں مثلاً حضرت علیؑ اور عمرو ابن عبدود کے مبارزہ کی داستان یا جلال الدین خوارزمشاہ کا تاریخچہ۔ غنائی شعر کی مثال حافظ اور سعدی کی غزلیں ہیں مثلاً : "فکر بلبل ہمہ آن است ......"۔ اور "صبا بہ لطف بگو ......" اور "آنچہ تو داری قیامت است نہ قامت"۔

رثائی شعر کی مثال سلطان محمود غزنوی کی رثاء میں کہے گئے اشعار ہیں۔ "شہر غزنین نہ ہمان است"۔ یا وہ اشعار جو غزنوی کے فتنہ سے متعلق کہے گئے ہیں۔

"آن نیل مکرمت کہ تو دیدی سراب شد"۔ ...... یا وہ اشعار جو پیغمبر اکرمؐ کے اہل البیتؑ کے مصائب پر کہے گئے۔

چاپلوسی اور مدح کے اشعار تو الی ماشاء اللہ بہت ہیں۔ لیکن اشعار موعظہ مثلاً :
"ایہا الناس جہان جائے تن آسانی نیست ......" کم ملتے ہیں۔

مصیبت پر بھی شعر ہیں مثلاً : بلبلی خون دلی خورد......(حافظ)

مدح اور چاپلوسی کے اشعار کی ایک مثال یہ ہے :

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیرپای   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان زند

• یہ حماسہ اشعار تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ڈھنگ ہمیں نثر میں بھی نظر آتا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں :"قداستطعمو کم القتال" ۔"یہ لوگ تم سے جنگ کے طالب ہیں"(نہج البلاغہ خ ۵۱)۔اسی طرح طارق بن زیاد کا خطبہ بھی حماسی نثر کی عمدہ مثال ہے۔

نیز"والعادیات ضبحاً......" حماسی نثر ہے۔اسی طرح واقعات اور تاریخچہ بھی یا حماسی ہوتے ہیں یا غنائی یا رثائی......

تاریخ اسلام ایک حماسہ سے بھرپور تاریخ ہے' مثلاً جناب ابوذرؓ کے مکہ میں شعار۔ موعظی داستان اور غنائی داستانیں بھی بہت زیادہ ہیں۔اسی طرح سے کبھی شخصیتیں بھی حماسی ہوتی ہیں۔ ~۱

اب ہم اپنے اصل موضوع یعنی شخصیت حسینی' تاریخی حادثہ کربلا اور حسینؑ کے حماسی شعاروں کے سراغ میں چلتے ہیں۔

حسینؑ ایک حماسی شخصیت ہیں' واقعہ کربلا ایک حماسی داستان اور حسینؑ کا شعار حماسی شعار ہے۔

۲۔ شب تیرہویں سنہ ۸۸ھ۔ش کو"حسینیہ ارشاد" میں کی جانے والی تقریر کا خلاصہ (جو حماسۂ حسینی کے عنوان سے تھا) کچھ اسطرح سے ہے :

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جس طرح نظمیں' حماسی' غنائی' رثائی یا نصیحتی وغیرہ

~۱۔ "سوکارنو" کی یادداشت میں نے "اطلاعات" میں پڑھی ہے۔ کہتا تھا میں ایک عظیم عاشق ہوں اور اس نے اپنی عشق بازیوں کا ذکر کیا تھا۔ بنابراین وہ ایک غنائی شخصیت تھا نہ کہ سیاسی۔

ہوتی ہیں' اسی طرح سے نثر بھی ہے بلکہ وقایع اور تاریخ بھی اسی طرح ہیں اور خود شخصیتیں اور روحیں اور شعار بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے بتایا تھا کہ ہمیں حادثۂ کربلا کا مطالعہ کرنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے آیا یہ ایک غنائی حادثہ ہے یا رثائی یا حماسی یا نصیحتی یا اسکے بر خلاف۔

یہ بھی پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ حادثہ دو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک صفحہ سیاہ اور تاریک ہے۔ اس صفحہ کے لحاظ سے کربلا کی داستان ایک جنایتی اور رثائی داستان ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک بے نظیر ٹریجڈی (المیہ) ہے۔ (حداقل مشرقی خطۂ زمین پر بلکہ مغرب کی سرزمین پر تو اس سے بھی بالاتر جرم و جنایت بہت زیادہ تھے اور اب بھی ہیں جن کے نمونہ صلیبی جنگوں اور اندلس کی جنگوں میں دیکھے جا سکتے ہیں) جنایت سے بھرپور اس المیہ کو ٹریجک ڈرامہ کے ڈائرکٹر یزید' ابن زیاد اور ابن سعد وغیرہ جیسے جنایتکار ہیں۔

اسکا دوسرا صفحہ سفید اور نورانی ہے اور اس صفحہ کے لحاظ سے یہ ایک حماسی داستان ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اور اس صفحہ میں اسکے ڈائرکٹر بدل جاتے ہیں۔ اسکے ڈائرکٹر عبارت ہیں حسینؑ سے لیکر زینب' عباس بن علیؑ' علی ابن الحسینؑ' قاسم بن الحسنؑ' مسلم بن عقیلؓ' زہیر ابن قینؓ' بریر بن خضیرؓ' ہلال بن نافعؓ اور حبیب بن مظاہرؓ سے۔

سیاہ صفحہ کے لحاظ سے یہ واقعہ بشریت کے ظلم و جنایت کی ایک ایسی نمایشگاہ ہے کہ جو انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیتا ہے اور اس آیت کا مصداق ہے:

"اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدماء"۔ "فرشتوں نے پوچھا اے پروردگار! کیا تو ایسے کو (خلیفہ) بنانے والا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے"۔ (سورۂ بقرہ: ۳۰)

جبکہ نظر دوم سے یعنی سفید صفحہ کے لحاظ سے ہم اس واقعہ اس آیت کا مصداق پاتے ہیں :"انی جاعلٌ فی الارض خلیفه"۔"میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں" اور اس آیت کا بھی :"انی اعلم مالا تعلمون "۔ "ہم وہ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے"۔(سورۂبقرہ : ۳۰)

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہم نے اب تک سکہ کے ایک چہرہ اور ورق کے ایک صفحہ کا مطالعہ کیا ہے۔ہم نے اس لحاظ سے مطالعہ کیا ہے کہ حادثہ کربلا ایک جنایتی داستان ہے۔اب ہم یہاں پر دوسری طرف کا مطالعہ کرنا چاہیں گے۔ہم نے بتایا تھا کہ بعض مثلاً "محمود مسعود" جیسے لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ مسیحیوں کی روش ہماری روش پر فوقیت رکھتی ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیحؑ کی شہادت اور فداکاری پر جشن مناتے ہیں لیکن ہم (شہادت امام حسینؑ پر) عزاداری کرتے یعنی سوگ مناتے ہیں ۔ وہ لوگ شہادت کو کامیابی اور ہم شکست جانتے ہیں۔یہ لوگ اس مسئلہ میں اشتباہ کرتے ہیں' وہ یہ نہیں جانتے کہ مسیحی جو جشن مناتے ہیں تو اسلئے کہ وہ مسئلہ کو شخصی نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ اسلام اسکو اجتماعی نظر سے دیکھتا ہے۔

شخصی اعتبار سے تو ہم بھی اسے کامیابی جانتے ہیں۔اسکے علاوہ وہ اس لئے بھی جشن مناتے ہیں کہ وہ شہادت کو گناہوں کا فدیہ سمجھتے ہیں۔وہ جشن مناتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ شہید ہوئے اور ان کی شہادت سے ان لوگوں کے سر سے سنگین گناہوں کا بوجھ ہٹ گیا جبکہ مسلمانِ واقعی ایسی فکر نہیں رکھتا۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ حسینؑ کی شخصیت کس طرح سے ایک حماسی شخصیت ہے' کس طرح سے ان کے کلمات حماسی کلمات ہیں اور کیسے کربلا کا حادثہ ایک حماسی حادثہ ہے ؟

پہلے یہ عرض کرتے چلیں کہ اس حادثہ میں کہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں' تحمل ہے' صلابت ہے' غیرت ہے' مسلک اور فکر کا دفاع ہے' فداکاری ہے' شہادت ہے۔ اور ان خصوصیات کے لحاظ سے یہ حماسہ باقی تمام حماسوں سے امتیاز رکھتا ہے۔

یہ ایک مقدس اور ایک مطلق حماسہ ہے۔ مطلق اس لحاظ سے کہ یہ خاص طور پر کسی ایک قوم یا ملت کیلئے نہیں ہے بلکہ انسانیت کیلئے ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ خدا کی راہ میں ہے' اس راہ میں ہے جو خلقت کے تمام اہداف سے ہم آہنگ ہے یعنی یہ کہ یہ رضائے خدا کی راہ میں ہے' وگرنہ خداوند شخصی طور پر اور اپنے لئے کوئی چیز نہیں چاہتا کہ رضایت اور عدم رضایت کے لحاظ سے کوئی مقصد رکھتا ہو۔ دوسری بات ہم نے یہ کہی کہ یہ ایک مقدس حماسہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک فرد کی نگاہ سے یہ کسی شخصی جاہ اور مقام کے حصول کیلئے نہیں بلکہ بشریت کے مقدسات کے لئے ہے۔ یہ در حقیقت توحید کی راہ میں انسان پرستی سے جنگ ہے اور عدل' آزادی اور مظلوموں کی حمایت کیلئے مبارزہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک الٰہی حماسہ ہے' ایک جہانی حماسہ ہے' ایک انسانی حماسہ ہے۔

ایک ایسا قومی ہیرو جو محض اپنی قوم کیلئے کام کرتا ہے' ممکن ہے وہ دوسری قوم کے نقطۂ نظر سے عظیم جنایت کار ہو۔ 'اسکندر' یونانیوں کی نظر میں عظیم ہیرو ہے لیکن مغلوب قوموں کے نقطۂ نظر سے ایک جنایتکار ہے۔ اس کے بر خلاف جس شخص کا ہدف حق' حقیقت' عدالت' حریّت اور خدا ہو' وہ سب کے لئے ہیرو ہوتا ہے۔

جس شخص کا ہدف پامال شدہ مادی حقوق کی بحالی ہو' اقتصادی برابری کا

حصول ہو' جب قیام کا فلسفہ مادّی ہو' اسکی فکری بنیاد کی اصل اقتصاد ہو اور اس کا اصلی محرک خواہ نخواہ انفرادی منافع ہو' ایسے قیام مقدس معروف نہیں ہوتے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر پروین اعتصامی کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں)

۴۔ ہم اس سے قبل مقدس قیام اور عظیم انسانوں کی تشریح کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ سارے مقدس قیام چار خصوصیات رکھتے ہیں۔ خلاصہ کے طور پر یہاں پھر تکرار کئے دیتے ہیں :

اول۔ عمومیت' اس لحاظ سے کچھ مادی نوعیت کی اجتماعی نہضتیں بھی اسمیں شریک ہیں۔

دوم۔ قادسیت : یعنی فردی منفعت اور خود خواہی سے منزّہ ہونا۔ اسکندر' نپولین' نادر شاہ' شاہ اسماعیل عظیم شخصیتیں تھیں لیکن......

سوئم۔ اس کی حیثیت گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شعلہ کی سی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حرکت ہوتی ہے جو سکون میں خلل پیدا کر دیتی ہے۔ یہ موت کے طاری سکوت میں ایک تحریک ہے۔ اسی وجہ سے اس طرح کے قیام عقلائے قوم قبول نہیں کرتے......

چہارم۔ قوی بصیرت۔

۵۔ امام حسینؑ کے خطبے غیرت الٰہی کی حکایت کرتے ہیں اور خود ان کی شخصیت کے عکاس ہیں :

الف۔ امامؑ سے کوئی کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی کوئی ایسی حدیث سنائیں جو خود آپؑ نے انؐ سے سنی ہو۔ آپؑ فرماتے ہیں : "اِن الله یُحبُّ معالی الامور و یُبغض سفسافھا"۔ "خداوند عالم اعلیٰ اور گرامی کام کو پسند کرتا ہے اور پست اور چھوٹے کاموں سے نفرت کرتا ہے"۔

ب۔"الانوار البھیّة"ص ۴۵...... "عن الحسین ؑ :انّ جمیع ما طلعت علیه الشمس فی مشارق الارض ومغاربها' بحرها وبرّها سلهلها وجبلها عند ولیّ من اولیاء الله واهل المعرفة بحقّ الله کفئ الضلال ۔ثم قال: الا حرٌّ یدع هذه اللّماظة لاهلها۔ لیس لانفسکم ثمن الا الجنةُ فلا تبیعوها بغیرها ۔فانّ من رضی من الله بالدنیا فقد رضی بالخسیس "ے۱۔

ج۔ "الناس عبیدالدنیا والدین لعق علی السنتهم......"۔"لوگ دنیا کے بندے ہیں اور دین اُن کی زبان پر ہے"۔

د۔ "موت فی عزّ خیر من حیاة فی ذلّ"۔"عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"۔

ھ۔ ابوذر غفاریؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:"فاسألِ الله الصبر والنَّصر واُستَعِذ به من الجشع والجزع فانّ الصبر من الدین والکرم"۔"پس خداوند عالم سے صبر اور مدد طلب کرو اور لالچ اور بے تابی سے اس کی درگاہ میں پناہ مانگو کہ صبر دین اور کرم سے ہے"۔

و۔ "الصّدق عزّ ' والکذب عَجزٌ ' والشُّح فقر' والسخاء غِنّی"۔"سچائی عزت ہے اور جھوٹ زبون حالی' کنجوسی فقر ہے اور سخاوت دولت......"۔

ز۔ "سبقت العالمین الی المعالی"......ے۲

یہ وہ جملے ہیں کہ جو آپؑ سے نقل ہوئے ہیں مگر عاشورا سے مربوط نہیں۔ اس وقت کی پابندی کی وجہ سے آپؑ سے کم احادیث نقل ہوئی ہیں اور جو باقی رہ گئی ہیں' وہ اس طرح کی احادیث ہیں۔ مگر حادثۂ عاشورا کے خطبے صفحات

ے۱۔ اس روایت کا ترجمہ پہلے ذکر ہو چکا ہے

ے۲۔ اس کا ترجمہ پہلے ہو چکا ہے۔

تاریخ پر جلی طور پر موجود ہیں :

ح۔ ''سامضی ومافی الموت عارٌ علی الفتیٰ......''۔ ''بہت جلد چلا جاؤں گا اور موت جوانمرد کے لئے عار نہیں ہے''......۔

ط۔ ''الاترون انّ الحقّ لایعمل به...... انی لااری الموت الاّ سعادةً......''۔ ''کیا دیکھتے نہیں کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے...... میں موت میں بجز سعادت کچھ نہیں دیکھتا......''۔

اور روزِ عاشورا کے بھی :

ی۔ الموت اولی من رکوب العار......

یا۔ أن لم یکن لکم دین......

یب۔الا وانّ الدّعی ابن الدّعی......

یج۔ لااعطیکم بیدی اعطاء......

۶۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کربلا کی جنگ عقیدہ اور فکر کی جنگ تھی' نہ کہ اشخاص کی جنگ۔

۷۔ اس پر بھی توجہ رہے کہ ان کا حماسہ اُن کی حق پرستی ہے کہ ''علامةُ الایمان ان تؤثر الصدق حیث یضرّك''۔ ''ایمان کی علامت یہ ہے کہ سچ بولیں اگر چہ کہ ضرر رساں بھی ہو''۔ مکر وفریب اور حیلہ سازی سے پرہیز اور کرامت نفس پر تکیہ کرنا حسینیوں کا حماسہ ہے۔

۸۔ جو چیز وجود رکھتی ہے وہ حسینؑ کا واقعی جاذبہ ہے۔ پیسہ خرچ کرنے والے ......''انّ لِقتل الحسینؑ حرارةً فی قلوب للمومنین لا تبردُ ابداً''۔ ''قتل حسینؑ مومنین کے دلوں میں ایسی حرارت ہے جو ہرگز سرد نہیں ہوتی''۔

(مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۱۷)

۹۔ مکتب حسینی سے مکتب حیات اسلام کی تجدید ہونا چاہیے۔ 'یا مظلوم!'، 'اے غریب'، 'اے بے پدر'! ایسی چیزوں کو حذف ہونا چاہیے۔

۱۰۔ مسئلۂ شہید پر بات ہونا چاہیے' شہید کی قدر و قیمت' خون شہید کی ارزش اور یہ کہ ہر شہادت اجتماع میں نورانیت کو وجود میں لاتی ہے' ان موضوعات پر گفتگو ہونا چاہیے۔

۱۱۔ شخصیت کی کلید۔

۱۲۔ آپؑ نے کبھی بھی زمانہ کی شکایت نہیں کی۔

۱۳۔ تربیت کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کی روح میں حماسہ کو وجود میں لایا جائے' تاہم الٰہی حماسہ ہونا چاہیے' نہ کہ ملّی اور نژادی حماسہ' یعنی ایسا حماسہ جسکی نسبت خیر اور نیکی سے ہو اور جسکی نسبت اجتماع کے سالم سنن سے ہو۔ اور قطعی طور پر شہید حماسہ آفرین ہے۔ (وان کان الا فلیکن تعصبکم فی محامد الخصال)۔

نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ (قاصعہ) میں یہ جملہ یوں ہے:

"فان کان لابدّمن العصبیة فلیکن تعصبکم لمکارم الخصال و محامد الافعال......"

"اب اگر تمہیں فخر کرنا ہی ہے تو چاہیے کہ پاکیزہ اخلاق اور 'قابل تحسین اعمال پر کرو فخر و ناز"۔

۱۴۔ اجتماع اس وقت اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے جب افراد کی روح میں حماسہ اور احساس تشخص موجود ہو' زندگی کے بارے میں ایک مستقل فلسفہ ہو اور وہ اس پر ایمان رکھتے اور تکیہ کرتے ہوں۔

۱۵۔ انسان اور حیوان میں اگر مکر و حیلہ ہو تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس میں ضعف و

ناتوانی اور کمزوری موجود ہے اور اگر اس میں کرامت نفس ہو تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس میں قوت اور نیرومندی کا وجود ہے۔

۱۶۔ انحطاط اور پستی کے شعار کو حسینی اور روح حسینی کے شعار سے حذف ہو جانا چاہئے۔ جیسے اس طرح کے شعار : 'یا مظلوم!'، 'یا غریب'، 'اے بے مادر!' 'اے بے پدر!' اور اس طرح کے اشعار :

ای خاک کربلا توبہ من یاوری نما	چون نیست مادری توبہ من مادری نما
افسوس کہ مادری ندارم	فرزند وبرادری ندارم
از تشنگی فتادہ بہ جانم شرارہ ای	ای قوم بی حقوق بہ حالم نظارہ ای

۱۷۔ حماسی سخن ' حماسی تاریخچہ اور حماسی شخصیت وہ ہے جو روح میں غیرت ' شجاعت ' حمیت پیدا کرے اور جنگ کے لئے متحرک کرے 'جو بدن کی رگوں میں خون کو جوش دلائے 'جو بدن کو قوت ' حرارت ' چستی اور چالاکی بخشے اور جو حقیقت میں بدن کو حیات تازہ دے۔ دوسرے الفاظ میں جو انقلاب اور شورش کی لہر پیدا کرے اور جو ظلم اور ظالم کے مقابلہ میں ڈٹ جانے اور پائیداری کی حس کو وجود میں لائے۔

۱۸۔ اسلام کے اخلاقی اصولوں اور اجتماعی تجدید حیات کے لحاظ سے امام حسینؑ اسلام ایک بے نظیر شخصیت ہیں۔ آپؑ انقلابی اور حماسی احساسات کو محترک کرنے اور اسلامی شخصیت بنانے کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہیں۔

۱۹۔ اجتماعی اور روحی حماسہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فرد یا اجتماع کو کسی دوسرے فرد یا اجتماع میں جذب ہونے نہیں دیتی کیونکہ اسکی شخصیت خود استقلال اور ہمت کا پیکر ہوتی ہے۔

۲۰۔ کسی قوم کی کوئی اور چیز اگر منہدم ہو جائے تو وہ قابل جبران ہو سکتی ہے اور

اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے لیکن اگر قومی حماسہ اور روحِ ملّی ہاتھ سے چلی جائے تو پھر وہ قابل جبران نہیں رہتی۔ امام حسینؑ نے حماسہ اسلامی کو زندہ کیا اور اس عنوان سے اسلام کو نئی حیات بخشی۔

کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اسلام کو زندہ کیا' اسلام کی تجدید حیات کی' اپنے خون سے اسے قوت بخشی اور اسکی آبیاری کی۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس طرح سے اور کس ڈھنگ سے ؟

آپؑ نے اسلام کے حماسہ کو زندہ کیا' مسلمانوں کی روح کو شخصیت' حریت' غیرت اور ہدف عنایت کیا' ان کے خون کو جوش دلایا' بدن سے سستی اور بے حسی کو نکال باہر کیا اور روح کو حرکت میں لائے' کفر اور ظلم و ستم سے مبارزہ کرنے کے حماسہ کو زندہ کیا۔

۲۱۔ اسلام کی طرف دعوت "قولو لااله الا اللہ تفلحوا" سے شروع ہوئی یہ دعوت ایک عجیب حسن رکھتی ہے۔ خود یہ جملہ اختصار کے باوجود' چونکہ خالق کل کے علاوہ تمام معبودوں سے بشر کی آزادی کا اعلان ہے اور انسان کے مقابلہ میں ہر معبود کی تحقیر ہے' اس نے بشر میں ایک نوع کا حماسہ اور احساس شخصیت کو وجود دیا : "کیا میں بت کے آگے' ایک بشر کے آگے' ایک آسمانی ستارے کے آگے اور دنیا و مافیھا کے آگے سر جھکاؤں ؟! کبھی بھی ایسا نہیں ہو سکتا' میں فقط اپنے خالق اللہ کی درگاہ میں جھک سکتا ہوں"۔

یہ بات قطعی ہے کہ اسلام نے عربوں میں احساس شخصیت کو وجود بخشا' قومی شخصیت اور عربی شخصیت کو نہیں' بلکہ بلند ترین احساسات یعنی توحیدی اور انسانی شخصیت کو۔ اسلام نے ان کی نظر میں عبادت اور اطاعت کے مقابل ہر چیز حقیر بنادی اور خدا کی اطاعت کو آئیڈیل قرار دیکر استوار کیا۔

۲۲۔عالم اور حماسی شخصیت میں فرق ہے۔(اس اصفہانی عالم کا قصہ کہ قم کے استاتذہ میں سے کسی سے ایک مفت کتاب کی درخواست کی تھی)۔

۲۳۔مسئلہ مروت پر بھی بحث ہونا چاہئے کہ یہ عدالت کی شرائط میں سے ایک ہے۔

۲۴۔برطانیہ میں ایک سفید فام عورت کا سیاہ فام مرد سے شادی کرنا[۱] (کہ جس نے شور بپا کر دیا تھا)' یہ شخصیت کے ہار جانے کی ایک علامت ہے (اس بارے میں کتاب "زن و آزادی" ص ۹ پر رجوع کریں)۔ یہ شعار کہ ایرانیوں کو جسمی اور روحی' ظاہری اور باطنی طور پر فرنگی ہو جانا چاہئے' نیز یہ آوازیں اور وضع قطع بھی اب تبدیل ہونا چاہئے کہ لباس بدل دیں' نام بدل دیں' بیگانوں کی طرح "بائی بائی" یا "گڈ بائی" بولنا' بیگانوں کی طرح کھانا کھانا' حتیٰ کہ ان کی طرز پر ڈکار لینا' بیگانوں کی عید کو اپنی عید سے زیادہ اہم جاننا' یہ سب خود باختگی اور شکست خوردگی کی علامات ہیں۔

۲۵۔استقلال فکری یعنی انسان کا اپنی زندگی کے بارے میں کچھ اپنے اصول رکھنا' اُن پر کامل ایمان اور اعتماد رکھنا اور اس کی روح میں ان کی نسبت ایک قسم کا حماسہ موجود ہونا۔ اس کو ملّی غرور اور اجتماعی غرور وغیرہ کہتے ہیں۔

حماسہ رکھنے کے علامات میں سے ایک علامت تمام سنتوں اور قوانین کا احترام ہے۔ اپنی وضع قطع بدلنا' لباس میں تغیر' نام رکھنے میں دوسروں کی پیروی کرنا اور زولا' یا روزی جیسے نام رکھنا' فرنگی ماڈلوں کے لباس اپنانا' بیگانوں کے الفاظ استعمال کرنا' ٹیبلو کو ان کے نام پر رکھنا' بے گانوں کی عیدِ جنوری کو اپنی ملّی اور مذہبی عیدوں پر مقدم رکھنا "بائی بائی" کہنا "گڈ بائی" کہنا۔ بالآخر بیگانوں کے شعار اپنانا' روحی استقلال کے فقدان اور حماسہ کے

---

[۱] یہ واقعہ اس کتاب کی پہلی جلد کے دوسرے باب میں نقل ہوا ہے۔

ناپید ہونے کی دلیل ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ "ہمارا مٹی کا کوزہ خود ہمارے اپنے ہاتھوں سے بننا چاہئے' نہ کہ دوسروں کے ہاتھوں سے"۔ اقبالؒ ہی کے بقول "ہمیں خود فولاد ہونا چاہئے تاکہ روٹی ہمارے ہاتھ میں ہو"، نہ کہ بقولِ موسولینی: "ہمارے پاس فولاد ہونا چاہئے تاکہ ہمارے پاس روٹی ہو"۔ دوسرے لفظوں میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ ہمیں صلابت اور حماسہ رکھنا چاہئے' جبکہ موسولینی کہتا ہے کہ ہمیں طاقتور ہونا چاہئے۔

۲۶۔ جس نے بھی کہا ہے' سچ کہا ہے کہ:

کہن جامۂ خویش پیراستن　　　به از جامه عاریت خواستن

"اپنا پھٹا پرانا لباس پہننا بہتر ہے' اس سے کہ دوسروں سے مانگ کر پہنیں"۔

۲۷۔ فکری استقلال اور حماسہ رکھنا ضروری ہے' تاہم دوسروں کی علمی' فنی اور ہنری خوبیوں اور اچھے نکات کو اپنانا منع نہیں ہے۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ کہ دوسروں کو ہضم کرلیں' نہ کہ خود دوسروں کے ہاضمہ کی نذر ہو جائیں۔

۲۸۔ ہم ایرانیوں میں یہ عیب ہے کہ تمام قوموں سے زیادہ ہم لوگ بیگانوں کے کھوکھلے شعار کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ حقائق کی نسبت تعصب نہیں رکھتے' بیگانوں کے کھوکھلے شعاروں کو بھی بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔

ہندوستان کا درجہ اول کا دانشمند بھی اپنے قومی لباس کی حفاظت کرتا ہے (تاریخ علوم' پی۔ یروسو)۔ سیاستمدار "نہرو" بھی ہندی لباس کی حفاظت کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ میں ہندی ہوں۔ ہندوستانی کو ہندوستانی رہنا چاہئے' نہ کہ مغرب زدہ ہو کر یورپی شعار میں ہضم ہو جائے۔ لیکن اگر ہم میں سے کوئی دیکھے کہ کسی اہلِ مغرب نے ایک زنار پہنا ہے تو ہم ایک کے

بدلے دو زنّار پہن لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہم استعماری فکر کیلئے کلی طور پر آمادہ ہیں۔ استعمار فکری بہت زیادہ خطرناک ہے اسلئے کہ (اس قسم کے استعمار میں) انسان دشمن کی طرح فکر کرتا ہے اور خود یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ استعمار زدہ ہے۔

ہمارے ہاں استعمار فکری سے بھی بڑھ کر ایک اور فکر موجود ہے اور وہ استسباع (درندہ) فکری ہے۔ یعنی ہم ایک حیوان کی مثل اس کی طرف دوڑ کر جارہے ہیں، جو ہمیں چیر پھاڑ ڈالے گا۔

۲۹۔ فکری استقلال کی قدر، اپنے فلسفۂ زندگی پر اعتماد اور اپنی شریعت اور اپنے قوانین و نظام کا احترام، علم سے بھی بہت زیادہ اہم ہیں۔ ایک پڑھی لکھی قوم ممکن ہے کہ کسی دوسری قوم میں تحلیل ہو جائے، لیکن وہ قوم و ملت جو تشخص اور استقلال کا احساس رکھتی ہو، اسکے لئے کسی دوسرے میں تحلیل ہونا ممکن نہیں ہے۔ الجزائری، ویت کانگ نے کسی علمی دلیل کے تحت فرانسیسی اور امریکی استعمار سے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ اس حماسۂ روحی کی خاطر جنگیں لڑی تھیں کہ جو انہیں موجود تھی۔

۳۰۔ کتاب ''اقبال شناسی'' ص ۶۹ پر ہے کہ اقبال کے عقیدہ میں چند چیزیں قومی شخصیت کو تقویت دیتی ہیں اور چند چیزیں شخصیت کو کمزور کرتی ہے۔

تقویتِ شخصیت کے عوامل :

الف۔ عشق اور آئیڈیل (نمونۂ کامل)۔ البتہ انسانیت کے عالی اصول سے عشق، نہ فردی و نژادی عشق اور، نہ ہی قوم و قبیلہ کا عشق۔

ب۔ فقر (استغناء) استغن عمن شئت......

ج۔ غیرت

د۔ تحمل اور بردباری

ہ۔ کسب حلال

و۔ اخلاقی تربیتی پروگراموں میں شرکت۔[1]

تضعیفِ شخصیت کے عوامل:

الف۔ ترس۔

ب۔ گدائی اور سوال (کسی بھی شکل وصورت میں دوسروں پر بوجھ بن کر رہنا)۔ ہر وہ کامیابی جو بغیر کوشش کے حاصل ہو' وہ گدائی ہے (اقبال شناسی ص ۷۰)۔

ج۔ کسی بھی شکل وصورت میں غلامی اور ذلت' خواہ وہ غلامی اور ذلت اجتماعی ہو یا سیاسی' اقتصادی ہو یا اخلاقی۔

د۔ غرور نژادی یا نسب پرستی۔ نسلی غرور اور اپنے خاندان پر فخر ومباہات کرنا انسانوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرتا ہے۔ یہ عمل ذاتی اقدار میں اختلاف کرتا ہے۔ اس کو محو اور نابود ہونا چاہئے۔ (اقبال شناسی ص ۷۴)

۱۳۔ اقبالؒ کہتے ہیں: ''وہ جامعہ جو سعادت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے' اسے چاہئے کہ ''خودی'' (یعنی مجتمع گروہ اور اس کی اجتماعی حالات) کی ہدایت کرے اور اس کو کامل مرحلہ تک پہنچائے۔ اس ہدف کا حصول اپنی روایات کی حفاظت اور پاسبانی کے سایہ میں ہی ممکن ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی زندگیوں میں ایک مہم کی صورت اپنی روایات یعنی سنن' نظام اور مراسم کا ایفا کریں تو قوم یہود کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہ چھوٹا سا ٹولہ گزشتہ صدیوں میں تمام ممالک میں فشار کی زندگی گزارتا رہا اور کچھ ایسے مواقع بھی آئے کہ یہ نابود ہونے والے تھے۔ لیکن قوم یہود ان طوفانوں سے جان بچا لے گئی اور اس نے اپنی بقا کی حفاظت کی۔ ان کے باقی رہ جانے کی علت یہ ہے کہ وہ تمام

مصائب و آلام اور مشکلات کے باوجود اپنے قوانین و ضوابط و سنن کے وفادار رہے ۔ ہر فرقہ اور جمعیت اپنی سعادت اور کامیابی کے دور میں کچھ مسلّم روایات ایجاد کرتے ہیں اور تیرہ و تاریک ایام میں جب مصیبت اور بدبختی سے دوچار ہوتے ہیں ' اسوقت اُن کیلئے نجات حاصل کرنے کا تنہا راستہ یہ ہوتا ہے کہ ان روایات کے مطابق عمل کرے تاوقتیکہ آسائش اور فرج کا دن آجائے "۔ (اقبال شناسی ص ۸۰)

۳۲۔ شخصیت ' در حقیقت طبیعت کا احساس ہے۔ یہ دراصل کسی دینی ' قومی یا کسی مسلک کی شخصیت سے وابستگی کا اعلان ہے۔

شخصیت کے تحفظ کی ایک شرط دینی اور قومی شعار کی تعظیم ہے۔

"جسمی ' روحی ' ظاہری اور باطنی طور پر مغرب زدہ ہونا چاہئے "۔ ایسا شعار بیگانوں میں تحلیل اور فنا ہو جانے کا فتویٰ ہے۔

استعمار کا ہدف فقط شخصیت اور روحی و فکری استقلال کو ختم اور نابود کرنا ہے ' نہ جاہل رہنا ' نہ عالی شان مکانات نہ رکھنا ' نہ ظاہری طور پر زرق و برق نہ ہونا ' یہ سب ان کے اہداف نہیں ہیں۔

کہاوت ہے : " دوسرے کا مردہ گدھا اس کی نظر میں خچر ہے "۔

دو چیزیں کسی کے اندازے کو درہم برہم کرتی ہیں۔

ا۔ عشق اور محبت ۲۔ مرعوبیت ۔ نقصانوں میں سب سے عظیم نقصان شخصیت کا تباہ ہونا ہے۔ افسوس اس ملت کی حالت پر کہ جس کا افتخار بیگانوں کی زبان میں بولنا ہو اور ان کے آداب کو اپنانا ہو۔

۳۳۔ جرمن کہتے ہیں ہم دوسری جنگ عظیم میں سب کچھ ہار گئے ' سوائے اپنے تشخص کے۔

خلاصہ :

الف۔ ہم کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنے اس قیام اور مبارزہ سے ظلم کے محل کی بنیاد ہلادی، اسلام کو نئی زندگی بخشی اور دین کے شجر کی آبیاری کی۔ یہ کس طرح اور کیسے کیا؟

یہ اسطرح سے ہوا کہ آپؑ نے مسلمانوں کی معنوی شخصیت کو بیدار کیا اور ان کے مردہ حماسہ کو زندہ کیا۔ (ہم نے شخصیت سے متعلق اور مستقل زندگی گزارنے کیلئے فلسفۂ ملّی رکھنے اور دینی شعائر کا احترام اور تعظیم کرنے کہ جو عظیم ترین سرمایہ ہے، حتیٰ کہ علم سے بھی بڑھکر ہے، اس کے بارے میں کچھ بحث و گفتگو کی)۔ پیغمبر اکرمؐ نے عرب کو کیا دیا؟ شخصیت دی (شخصیت کی خاصیت یہ ہے کہ پھر وہ کسی دوسرے میں جذب ہونے میں مانع ہوتا ہے۔ جو بھی کم و کسر ہو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، مگر شخصیت کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا)۔ آپؐ نے شخصیت کس راستہ سے دی؟ اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے کے راستے سے کہ یہ طبیعی طور پر شخصیت آفرین ہے۔

شخصیت کا نقصان عظیم ترین نقصانوں میں سے ہیں۔ ڈرنا، عاجز ہونا، بیچارہ ہونا، خوار و ذلیل ہونا، غلام بننا، تملق کرنا، اور باقی تمام پست صفات شخصیت کے کھو بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

امام حسینؑ نے ملت اسلام میں حماسہ اور غیرت ایجاد کی۔ ان میں حمیّت، شجاعت اور سلحشوری کو وجود بخشا۔ خون کو جوش میں لائے۔ (امام حسینؑ اب بھی بے نظیر سرمایہ ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے)۔ امام حسینؑ کی شہادت ایسی نہ تھی کہ اس سے مرعوبیت کو وجود ملے، بلکہ اس کے برعکس......

مرعوبیت کی خاصیت فکری استحصال اور استسباع (درندگی) ہے۔ لندن میں

سفید فام عورت کا سیاہ فام مرد سے شادی کرنا مرعوبیت کی ایک علامت ہے۔ (یہ واقعہ حماسۂ حسینی کی جلد ا کے دوسرے باب میں نقل ہوا ہے)۔

شخصیت کی تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ عشق، استغناء، غیرت، تحمل اور بردباری کو وجود میں لائیں اور خوف، غلام صفتی، گدا صفتی اور نسلی و ملّی غرور کو درمیان سے ختم کردیں۔ یہ سب چیزیں حماسۂ حسینی میں وجود رکھتی تھیں۔

حماسہ سید الشہداءؑ

۱۔ "اخلاق اسلامی کے محور میں کرامت نفس" سے متعلق بیان میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے زمانہ میں ایک اصطلاح ہے کہ بعض ارواح حماسہ سے خالی ہوتی ہیں اور بعض حماسہ کی مالک اور یہ بھی بتایا تھا کہ بعض حماسہ دوسروں کے مقابل ایک قسم کا احساس شخصیت رکھتے ہیں۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حماسہ سے خالی اور عاری ہیں۔ وہ اپنے آپ میں تمام تر احساس حقارت، تبعیت اور شکست خوردگی پاتے ہیں۔ ان کی روح میں دفاع کے قابل کسی بھی فکر اور عقیدہ کا وجود نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ دفاع کرتے ہیں تو صرف اپنے مال اور جان کا دفاع کرتے ہیں، کوئی دوسری چیز نہ تعلق کے قابل دیکھتے ہیں اور نہ دفاع کے قابل۔ ان میں وطنیت، قومیت، نسل وخاندان، زبان، دین، آئین، حریت اور کرامت ذاتی کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی باتوں سے کسی طرح کی شخصیت آشکار نہیں ہوتی۔ وہ اس حیوان کی طرح ہوتے ہیں جو بولتا ہو۔ ان کے برخلاف بعض لوگ اپنے آپ میں احساس شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کی روح میں ایک قسم کا حماسہ ہوتا ہے۔ جرمن قوم میں حماسہ (جرمن سب سے برتر ہے) موجود تھا۔ عرب میں بھی غیر عرب پر فوقیت کی خو موجود تھی اور اسلام نے اس سے مبارزہ ومقابلہ کیا۔ کم وبیش ہر قوم میں ایک قسم کا حماسہ موجود ہوتا ہے اور اسلام کی نظر میں تمام قومی حماسے قابل مذمت ہے۔

لیکن ایک اور قسم کا حماسہ بھی ہے اور وہ حماسۂ انسانی ہے۔ اگر اس کو تعصب کہا جائے تو یہ قابل مدح وستائش تعصب ہے۔ وہ حماسہ کرامت نفس، آزاد منش اور عزت نفس کے ہونے اور ذلت کی زندگی قابل تحمل نہ ہونے کا حماسہ ہے۔

۲۔ قرآن کریم میں حماسی آیات موجود ہیں۔ مثلاً؟ آیۂ "ولله العزة ولرسوله و

للمومنین ۔ ”ساری عزت اللہ، رسول اور صاحبان ایمان کیلئے ہے“۔(سورۂ منافقون ۸) اور یہ آیت کریمہ: ”لن یجعل اللہ الکافرین علی المومنین سبیلا“۔ ”اور خدا کفار کو صاحبان ایمان پر کوئی غلبہ (تسلط) ہرگز نہیں دے گا“۔(سورۂ نساء ۱۴۱)

حماسہ در حقیقت معنوی زندگی کی کیفیت پر ایک قسم کی توجہ ہے۔ لیکن کچھ کیفیتیں موہوم اور بے اساس ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ ”جرمنوں کو یا ختم ہو جانا چاہئے یا وہ دنیا پر حکمرانی کریں“۔

اسی طرح کے دوسرے حماسے بھی ہیں جو برتری کی طلب اور تقدم جوئی کے لئے ہیں۔ لیکن حماسہ کی ایک اور قسم وہ کیفیت ہے جو واقعیت رکھتی ہے اور وہ ایک شخص یا ملت کی حیات کا حماسہ ہے جسکی بدولت انسان دوسروں کا محکوم نہیں ہوتا۔ انسان آزاد خلق کیا گیا ہے۔ حضرت علیؑ نے امام حسنؑ سے فرمایا ”ولا تکن عبد غیرك وقد جعلك الله حرّاً“۔ ”دوسرے کے غلام مت ہو کیونکہ خدا نے تمہیں آزاد خلق کیا ہے“ (نہج البلاغہ نامہ ۳۱)۔ یا یہ کہ انسان اپنے آپ کو جھوٹ، دوسروں کی غیبت اور دوسروں سے خیانت میں آلودہ نہیں کرتا ہے۔

۳۔ نفس المہموم ص ۱۸۷ پر حضرتِ سید الشہداءؑ کے یہ اشعار نقل ہیں:

وان تکن الدنیا تعدّ نفیسةً　　فدار ثواب الله اعلیٰ وانبل

”اگرچہ دنیا کو نفیس اور گراں بہا شمار کریں لیکن خانۂ جزائے الٰہی (آخرت) کہیں زیادہ نفیس اور برتر ہے“۔

آٹھواں باب

نہضت حسینی میں تبلیغی عنصر کی یادداشت

نہضت حسینی میں تبلیغی عنصر

۱۔ نہضت حسینی' ایک متشابہ نہضت ہے یعنی اس کے بیک وقت کئی رُخ' کئی پہلو' کئی دَور' کئی تہ ہیں اور اس میں بڑی گہرائیاں ہیں۔ اس کا ایک پہلو تبلیغ ہے۔ یہ تحریک بیعت سے انکار کے حوالے سے امتناع ہے' اسکے علاوہ تمرد بھی ہے' عصیان بھی اور سرپیچی بھی۔ یہ تحریک جہاد بھی ہے اور امر بہ معروف اور نہی از منکر بھی' اتمام حجت بھی ہے (اہل کوفہ کی دعوت کے حوالے سے) اور تبلیغ بھی۔ نیز دنیا اور دنیا والوں کیلئے پیام اسلام اور ندائے اسلام کا ابلاغ بھی ہے۔

۲۔ عصر جدید میں پیغام اسلام کو پہنچانے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں کیونکہ ہزاروں مراکز سے (شہوانی' جنسی اور اقتصادی مراکز سے لے کر فکری اور سیاسی مراکز تک) ہزاروں پیغام لوگوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

۳۔ عصرِ حاضر کی تبلیغاتی جنگ میں فوج کی ہم آہنگی' مہارت اور تکنیک کی' مورچہ سنبھالنے کی' ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے کی' حاکم کی' اور نظم و انضباط کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ تبلیغاتی جنگ چونکہ خود اصل جنگ کی شکل اختیار کرلیتی ہے' اسلئے آیت "واعدّوا لهم مااستطعتم" بھی یہاں پر حکمفرما ہے۔ البتہ 'تبلیغ' لوگوں کے حوالہ سے اور پیام دینے والوں کے حوالہ سے فقط ایک دوستانہ ابلاغ ہے' جبکہ کسی دوسرے کے کاموں کو زائل کرنے اور مخالف تبلیغ کرنے کے حوالہ سے یہ جنگ ہے۔

۵۔ ایک پیام کی موفقیت اور کامیابی کی چار شرائط ہیں :

الف۔ پیام کو غنا (بے نیاز) اور محتویٰ ہونا چاہئے (غنائے منطقی' غنائے احساسی' غنائے عملی)۔ دوسرے الفاظ میں پیام ایسا ہونا چاہئے جو عقل و دل کے لئے

جاذب ہو اور جو زندگی کی مشکلات حل کرنیکی قدرت رکھتا ہو۔ یہاں سے ہمیں تبلیغ کے وسائل و آلات نہ رکھتے ہوئے بھی اسلام کی پیشرفت کا اصلی راز معلوم ہوتا ہے' جب کہ اس کے بر خلاف دوسرے اکثریتی مذاہب' جیسے میسیحیت اور اقلیتی فرقے' جیسے یہود اور بہائی' اس قدر پیشرفت نہیں کر سکے۔

ب۔ تبلیغ کے آلات و وسائل کے لحاظ سے امکانات کا فراہم ہونا۔ اسکے علاوہ اجتماعی احاطہ کی دوسرے شرائط کا موجود ہونا۔

ج۔ تبلیغ کا طرز اور کیفیت بہ مقابل تحقیق کا طرز' تعلیم کا طرز (علمی مسائل کی تعلیم تبلیغ' اجتماعی اور معنوی اہداف سے مربوط ہو) یادگیری (حفظ کرنا) اور بہرہ گیری (استفادہ کرنا) کی طرز' کتابداری (کتاب شناسی) کی طرز' مدیریت کا طرز اور ڈھنگ۔

د۔ پیام پہنچانے والے کی اخلاقی اور فنی صلاحیت۔

۶۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نہضت حسینی میں ہم عنصر تبلیغ کے وجود کو فقط اسی صورت میں بیان کر سکتے ہیں کہ جب ہم اس نہضت کا عامل فقط بیعت سے انکار کو نہ جانیں۔ بلکہ در حقیقت تبلیغ کا عامل دوسرے دو عاملوں یعنی کوفہ کے لوگوں کی (زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کی) دعوت قبول کرنے اور امر بہ معروف و نہی از منکر کے عوامل سے بھی موافقت رکھتا ہے۔ البتہ کوفہ کے سقوط کے بعد سے عنصر تبلیغ سے جو کچھ استفادہ ہوا ہے' وہ امر بہ معروف اور نہی از منکر سے مختص ہے۔

امامؑ کا مدینہ سے مکہ کی طرف خروج کرنا اور شعبان سے لے کر ذی الحجہ تک کہ جو عمرہ کے ایام تھے مکہ میں قیام پذیر ہونا جس کے بعد حج کے ایام شروع ہوئے' ہم نہیں سمجھتے اس لئے تھا کہ دشمن اس وقت تک حرم الٰہی کی

حرمت کی حفاظت کر رہا تھا۔ بلکہ ہمارے خیال میں آپؑ کے مکہ میں قیام کی دیگر تین علتیں ہو سکتی ہیں: پہلی یہ کہ خود ہجرت تبلیغاتی ارزش و قیمت رکھتی ہے۔ اس ہجرت نے ارباب اقتدار کو تکان پہنچایا، اسکے ذریعہ امامؑ اپنی ندا کو بہتر طریقہ سے آگے پہنچا سکے اور یہ ہجرت مخالفت و امتناع کا پہلا اقدام اور مہم کا آغاز تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مکہ وہ سرزمین ہے جہاں دنیا کے گوشہ و کنار سے لوگ آتے ہیں اور امامؑ کیلئے لوگوں سے ملاقات کرنے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ تیسری علت یہ ہے کہ مکہ کو اپنے قیام کے لئے انتخاب کرنا اس بات کا اعلان تھا کہ آپؑ کے لئے امن نہیں ہے، اگرچہ کہ بعد میں مکہ بھی آپؑ کے لئے جائے امن نہ رہا۔

۷۔ امامؑ کا روز ترویہ، یعنی آٹھویں ذی الحجہ کو کہ جو منیٰ اور عرفات کی طرف حرکت کرنے کا دن ہے، مکہ سے خروج کرنا مکہ میں اقامت سے کہیں زیادہ جھنجھوڑنے والا عمل تھا اس عمل کی مکہ میں قیام سے کہیں زیادہ تبلیغی ارزش تھی اور پیام اسلام پہنچانے میں یہ بہت زیادہ مؤثر تھا۔ امامؑ کا بنو امیہ کے تسخیر شدہ کعبہ کی طرف پشت کرنا جبکہ امور حج یزید کی حکومت چلا رہی تھی اور حج ایسا حج تھا کہ جس کا ظاہر اسلام اور باطن جاہلیت تھا، آپؑ کا یہ عمل اعلان کر رہا ہے کہ اسلام کی یہ خالی صورت نہیں ہے کہ لوگ آرام سے آسودہ خاطر بیٹھے رہیں، بلکہ حج معنیٰ و حقیقت رکھتا ہے اور آج اس کو بھی خطرہ لاحق ہے۔

۸۔ آپؑ کی تبلیغات کی تیسری تکنیک یا تدبیر یہ تھی کہ آپؑ اپنے اہل بیتؑ اور بچوں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔ اس طرح سے گویا آپؑ نے دشمن کو بغیر آگاہی کے اپنا نوکر بنالیا۔ یوں امام حسینؑ یزید اور یزیدی اسلام کے خلاف حسینؑ کے اسلام کے مبلغین کو لے کر شہر شہر گئے اور یہ حکمت عملی نہضت

حسینی کے اہم ترین تبلیغی عناصر میں سے ایک ہے۔

۹۔ اباعبداللہؑ کی چوتھی تبلیغی تکنیک سفر کی مختلف منزلوں سے لیکر دسویں محرم تک، تمام تر قیام کے دوران مروت اور انسانیت کے اصلوں کا احترام ہے، جس کی مثال دشمن کو پانی پلانا اور جنگ کا آغاز نہ کرنا، وغیرہ ہیں۔

۱۰۔ امامؑ کی پانچویں تبلیغی تکنیک اپنے پیام کو بہتر طریقہ سے پہنچانے کے لئے نمایشگاہ ایجاد کرنا اور اس میں رنگ آمیزی کرنا ہے۔ اس ضمن میں شیر خوار بچے کے خون کو آسمان کی طرف پھینکنا کہ "عندالله احتَسِبهُ" ("اس کو میں خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں)، اپنے سر اور چہرہ کو خون سے خضاب کرنا کہ میں خدا سے اسی حالت میں ملاقات کروں گا، قاسم سے گلوگیر ہونے کا منظر اور حبیب بن مظاہر کا قصہ بیان کیا جاسکتا ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ یہ طبیعی نمائشگاہ، مصنوعی شکل رکھنے کے باوجود اپنے اندر آیات قرآنی کی طرح سے قبول کروانے کی استعداد رکھتی ہے۔

۱۱۔ جو چیز آجکل ہمیں الہام بخشتی ہے، وہ ان لوگوں کے قلم نہیں جنہوں نے اسلام کو کاغذ پر بیان کیا ہے بلکہ ان لوگوں کے قلم ہیں جنہوں نے اسلام کے برجستہ خطوط کو اپنے خون سے اپنے جسموں پر، اپنی پیشانیوں پر اور اپنے شگافتہ سروں پر لکھا ہے: "وقُتل فی محرا به لِشِدة عَدلِه"۔ "اور وہ اپنی محراب عبادت میں شدت عدالت کی خاطر قتل کردیئے گئے"۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مقدس محاسن اپنے ایک ایک بال پر، اپنے سینوں اور قلبوں پر، اپنی شکستہ پیشانیوں پر، اپنے شکستہ دندان پر اور اپنی گردنوں کی رگوں پر لکھ گئے ہیں۔

ہم آج کس قدر اشتباہ کرتے ہیں کہ "مِدادُ العلماءِ افضلُ من دِماءِ الشُّهداء" (علمائے کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے (افضل ہے)، کے

جملے سے شہید اور شہادت کی قدر و قیمت کو کم کرتے ہیں۔

ہاں! آج ہمارے لئے جو چیز الہام بخش ہے، وہ قلم نہیں بلکہ وہ تاریخی جانبازیاں ہیں، زمین پر بہے ہوئے خون ہیں اور نورانی سرگزشت ہیں۔ اسلام کے پیام کو جہادوں، ہجرتوں، فداکاریوں اور جانبازیوں نے تمام دنیا تک پہنچادیا ہے۔

۱۲۔ اباعبداللہؑ اپنی نہضت کو خون آلود بنانے اور سرخ رنگ دینے کا مصمم قصد رکھتے تھے، (آقای مرحوم آیتی کے بقول) کیونکہ سرخ رنگ سب سے زیادہ قائم رہنے والا رنگ ہے اور حداقل سب سے زیادہ نمایاں رنگ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عاشورا میں ایک نوع کی رنگ آمیزی کا عمل نظر آتا ہے۔

موافق حالات نہ پانے اور اپنے قیام میں مایوس ہونے کے بعد امامؑ کے آتش بیان خطبوں کا ایک مقصد ہے جبکہ اپنے خاندان کے لوگوں کو، ان مایوس کن حالات کے باوجود وہاں سے واپس جانے کا حکم نہ دینا بلکہ ان میں شوق شہادت ابھارنا، اسکا ایک اور مقصد ہے۔ شہادت کیلئے امامؑ کے حضور اصحاب و اعوان کا نصرت طلب کرنا، اسکا اور مقصد ہے اور اسی طرح حُر کو مرنے کی اجازت دینے، اور شب عاشورا حبیب بن مظاہر کو بنو اسد کے پاس بھیجنے کا اور مقصد ہے۔

۱۳۔ اباعبداللہ کے عجیب کام اور آپؑ کا اپنی نہضت کو خون کے رنگ میں رنگنا:

الف۔ کتاب ابصار العین ص ۱۵ پر ہے: امامؑ کے استغاثہ کے بعد جب زنان اہل حرم کی آہ و فغان اور گریہ وزاری کی آواز بلند ہوئی تو امامؑ ان کو خاموش کرنے کیلئے آئے۔ اسی اثناء میں: "وَأخذ طفلاً له من يد اخته زينب فرماه حرملة اوعقبة بسهم فوقع فى نحره (نحرالطفل)۔ كماسيأتى فى ترجمته۔ فتلقى الدّم بكفّه ورمىٰ به نحوالسماء وقال: هوّن علىّ ما نزل بى انه بعين الله"۔ "اپنے ایک بچہ کو اپنی بہن زینب کی گود سے لیا، حرملہ یا عقبہ نے

ایک تیر اس کی طرف پھینکا جو بچہ کے گلے میں جالگا۔ حضرتؑ نے بچہ کے خون کو اپنے چلو میں لیا، آسمان کی طرف پھینکا اور فرمایا: جو مصیبت بھی میرے سر پر آئے، وہ میرے لئے آسان ہے چونکہ خدا دیکھ رہا ہے"۔

ب۔ ابصار العین ص ۱۵ پر ہے: "ثم جرّد سیفه فجعل ینقف الهام ویوطئ الاجسام، ورماه رجل من بنی دارم بسهم فاثبته فی حنکه الشریف فانتزعه وبسط یدیه تحت حنکه، فلمّا امتلاتادماً رمیٰ به نحو السماء وقال: اللهم انی اشکوالیك مایفعل بابن بنت نبیك"۔ "اس کے بعد (حضرتؑ نے) تلوار کھینچ لی جسے کوفہ والوں کے سروں پر مارتے تھے اور ان کے بدنوں کو زیر پا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بنو دارم کے ایک شخص نے انؑ کی طرف ایک تیر پھینکا جو حضرت کے گلوئے پاک میں جالگا۔ حضرت نے تیر کو باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو گلوئے پاک کے نیچے رکھا۔ جب چلو خون سے بھر گیا تو اسے آسمان کی طرف پھینکا اور فرمایا: پروردگارا! میں تجھ سے شکایت کرتا ہوں کہ تیرے نبیؐ کے نواسے کے ساتھ یہ اس طرح پیش آرہے ہیں"۔

ج۔ ابصار العین ص ۱۶: "وجعل ینوءُ برقبته (برکبته) ویکبو فطعنه سنان فی ترقوته، ثم انتزع السنان فطعنه فی بوانی صدره، ورماه سنان ایضاً بسهم فوقع فی نحره، فجلس قاعداً ونزع السهم وقرن کفیّه جمیعاً حتی امتلاتا من دمائه فخضب بهما رأسه ولحیته وهو یقول: هکذا القی الله مخضباً بدمی مغصوباً علی حقی"۔ "اور (حضرتؑ) بہت مشکل سے اٹھ پاتے تھے اور دوبارہ سینہ کے بل زمین پر گر جاتے تھے۔ سنان نے ایک نیزہ آپؑ کی ہنسلی اور گردن کے درمیان پیوست کیا۔ پھر وہاں سے

نکالا اور آپؑ کی پسلیوں میں گھونپ دیا اور اسی سنان نے ایک تیر پھینکا (نوٹ :بعید نہیں کہ یہاں سنان اشتباہ ہو اور وہ دارمی ہی ہو) جو حضرتؑ کے گلوئے پاک میں لگا۔ آپؑ زمین پر بیٹھے' تیر کو حلق سے نکالا اور اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو گردن کے نیچے رکھ کر خون سے چلو بھرا' اسی سے اپنے سر اور ڈاڑھی کا خضاب کیا اور فرمایا: میں اسی طرح اللہ کا دیدار کروں گا کہ اپنے خون میں آلودہ ہوں اور میرا حق غصب کیا گیا ہے"۔

۱۴۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ قرآن کریم میں شاعری نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس میں آہنگ (نغمگی) ہے۔ اور آہنگ بھی مختلف ہیں' ہر آہنگ آیات سے اور ان کے معانی سے متناسب۔ طٰہٰ حسین نے کتاب مرآۃ الاسلام (آئینۂ اسلام۔ ترجمۂ فارسی' مرحوم آیتی) میں بیان کیا ہے کہ حادثہ کربلا بھی شبیہ پذیر یا نمایش پذیر ہے۔ مباحثت اس میں بہت سے موضوعات اور مباحث ہیں یہ درحقیقت ایک واقعی اور طبیعی حادثہ ہے لیکن اس نے ایسی صورت اختیار کی کہ آپ کہیں گے جیسے کوئی نمایش نامہ تیار کیا ہوا ہے۔ ہم بتلاتے ہیں کہ اس حادثہ کا شبیہ پذیر ہونا اور اسکا مختلف موضوعات کا حامل ہونا کیوں اور کیسے ہے؟ وہ اسلئے ہے کہ حادثہ کربلا کی یہ بناء رہی ہے کہ اسلام کے تمام ابعاد اور تمام زاویئے متجلّی ہو جائیں۔ دوسرے الفاظ میں اس حادثہ میں عملی اور واقعی طور پر (نہ کہ فقط ظاہری طور پر اور دوسروں کو دکھانے کیلئے تماشا بن کر) اسلام کے تمام زاویوں کو تجسم دیا گیا ہے تاکہ عمل کے مرحلہ میں کامیاب ہو جائے۔

فکر کو تجسم دینا یا جامۂ عمل پہنانا کبھی صرف نقش ہوتا ہے' ایک نمائش کی طرح سے اسکی فقط شکل و صورت ہوتی ہے' اس میں روح نہیں ہوتی۔ یہ

در حقیقت خیال کے ساتھ کھیلنا ہے۔ جیسا کہ آقای راشد نے نقل کیا تھا کہ کسی باہر کے ملک کے میوزیم (عجائب خانہ) میں ایک بہت خوبصورت عورت کا مجسمہ ایک تختہ پر اس طرح بنا ہوا تھا کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی جوان مرد پہلے اس عورت سے ہم آغوش ہوا تھا۔ تصویر میں وہ جوانمرد ایک پاؤں نیچے رکھ کر منہ پھیرے ہوئے تھا یعنی فرار کی حالت میں تھا اور وہ جوان بھی بہت خوبصورت تھا۔ آرٹسٹ نے بتلانا یہ چاہا تھا کہ یہ افلاطون کی ایک فکر کا تجسم ہے کہ ہر عشق اپنے آخری مرحلہ پر بیزاری میں تبدیل ہو جاتا ہے اور معشوق وصال کی وجہ سے مورد نفرین ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تجسم ایک بے روح تجسم ہے۔ اسکے بر خلاف اسلام میں زندہ، جاندار، ذی روح اور واقعی تجسمے ہیں۔

حادثۂ کربلا ہر پہلو سے اسلام کا ایک تجسم ہے لیکن جاندار اور ذی روح۔

حادثۂ امام حسینؑ کو آپ خواہ ایک حماسی اور نصیحتی حادثہ کہئے، جنگی حادثہ اور ٹریجڈی (المیہ) کہئے، یا عشق الٰہی، مساوات اسلامی اور عواطف انسانی کی نمائش کہئے، یہ سب کے سب کو کمال بلندی تک مختلف قہرمانون، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، آزاد، غلام، بالغ اور بچوں سے مل کر وجود میں آیا ہے اور اسلام کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ توحید، عرفان، عشق الٰہی، تسلیم و رضا، حق کے ساتھ محبت اور خدا کے ساتھ پاکبازی کو بھی دکھاتا ہے، اس میں اعتراض کا پہلو بھی ہے اور محرومین سے ہمدردی کا پہلو بھی، اخلاقی اور انسانی حماسہ بھی ہے اور وعظ و نصیحت کا پہلو بھی۔ اس میں شجاعت، تحرک اور تحمس کا درس بھی ہے، اسلامی عدل و مساوات بھی عیاں ہے اور یہ اخلاقی عواطف کی اعلیٰ ترین تجلی بھی ہے، مثلاً ایثار (حضرت ابو الفضل العباسؑ کی داستان) فداکاری اور اس میں سبقت لینا۔ یہ ہے امام حسینؑ کے قیام کے جامع ہونے کے معنی۔

یہ قیام ہدف، مقصد، فکر اور نظر کے لحاظ سے اسلام کے تمام اصلی تصورات (آئیڈیولوجی) کا حامل ہے، محض کسی ایک خاص پہلو کا نہیں۔ اور اپنے وجود میں لانے والوں اور عہد کرنیوالوں کی نگاہ سے بھی یہ تمام کا تمام اسلامی ہے۔

میں محتشم جیسے شعراء کی کلی طور پر نفی نہیں کرتا ہوں، جس طرح عمان سامانی اور صفی علی شاہ کی نہیں کرتا ہوں۔ محتشم نے اس واقعہ کے المناک اور دل پگھلانے والے زاویئے پر زور دیا ہے جبکہ دوسرے دونوں نے اس تحریک سے عرفانی اور عشق الٰہی کے پہلو نکالے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس واقعہ کے اجتماعی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس قیام، تحریک اور نہضت (یہ تمام کلمات اس واقعہ کو بیان کرنے سے قاصر ہیں) میں یہ تمام پہلو موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس حادثہ کے زاویوں میں سے ایک زاویہ اور اس کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ البتہ یہ ایک کامل توحیدی اور تمام مراتب کا جامع حادثہ ہے۔

توحیدی اور عرفانی پہلو:

☆۔ رضی اللہ رضانا اھل البیتؑ"۔ "جو خدا کی پسند ہے وہ ہم اہل البیتؑ کی پسند ہے"۔

☆۔ "رضاً بقضائك و تسليماً لامرك، لامعبود سواك يا غياث المستغيثين" "تیرے قضا و قدر پر راضی ہوں اور تیرے حکم پر سر تسلیم کئے ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اے فریاد کرنے والوں کے فریادرس!"۔

☆۔ آخری لحظات میں آپ کے چہرہ پر رونق ہونا۔

☆۔ کچھ اصحاب کے بارے میں امام سجادؑ کی حدیث۔

☆۔ شب عاشور اکا زمزمہ یا معراج حسینی۔

☆۔ روز عاشورا کی نماز۔

☆۔ تمام شدائد و مصائب میں "عندالله احتسب"۔

درشتی اور غصہ کا پہلو:

☆۔ "الا وانَّ الدَّعی ......"۔

حماسہ آفرینی، مردانگی اور شرافت کے پہلو:

☆۔ "الموت اولی من رکوب العار۔" "ذلیل و خوار ہونے سے مرنا بہتر ہے"۔

☆۔ "هیهات منّا لذلّة"۔ "ذلت ہم سے دور ہے"۔

☆۔ ابن ابی الحدید کہتا ہے: سید اهل الاباء اِباة الضیم ۔یعنی ظلم و ستم اور قوت کے آگے سر نہ جھکانے والوں کے سردار۔

☆۔ "لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل و لا افرّ فرار العبید"۔ "نہ میں ذلت کے ساتھ بیعت کیلئے تمہارے آگے ہاتھ بڑھاؤں گا اور نہ ہی غلاموں کی طرح فرار ختیار کرونگا"۔

☆۔ "ویلکم یا شیعة آل ابی سفیان ان لم یکن لکم دین فکونوا احراراً فی دنیاکم"۔ "وائے ہو تم پر اے آل ابی سفیان کے گروہ! اگر تمہارے پاس دین نہیں تو کم از کم تم اس دنیا میں آزاد لوگوں کی سی زندگی ہی گزارو"۔

☆۔ "لااری الموت الا سعادت والحیاة مع الظالمین الا برما"۔
"میں موت کو سعادت اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنے کو ذلت سمجھتا ہوں"۔

حادثہ کا اخلاقی پہلو:

الف۔ مروّت

درشجاعت شیر ربّانیستی   درمروت خودکہ داندکیستی

"شجاعت میں آپؑ خدا کے شیر ہیں، مروت میں کوئی کیا جانے کہ آپ کیا ہیں"۔

☆۔ حر کے لشکر کو پانی دینا۔

☆۔ حر کی توبہ کو قبول کرنا۔

☆۔ تیر اندازی میں پہل کرنے پر راضی نہ ہونا۔

☆۔ جنگ شروع ہونے سے قبل شمر کی طرف تیر پھینکنے پر راضی نہ ہونا۔

☆۔ جسطرح خود آپ کے پدر بزرگوار علیؑ نے ابن ملجم کے ساتھ کیا تھا۔

یہ سب مروّت کے نمونے ہیں۔

ب۔ ایثار

☆۔ جنگ موتہ میں تین یا دس افراد کی داستان یا اس کے علاوہ دوسری داستانیں۔

☆۔ اہل بیتؑ کا ایثار۔

☆۔ سورۂ دہر۔

☆۔ ابو الفضل کا ایثار۔

ج۔ صداقت اور سچائی۔

د۔ وفا:

☆۔ عمرو بن قرظہ کا وقتِ شہادت امام حسینؑ کی خدمت میں عرض کرنا:
"أوَفَيت"؟ "کیا میں نے اپنے عہد پر وفا کی ہے؟" (نفس المہموم ص ۱۴۰)

موعظی اور نصیحتی پہلو:

الف۔ خود ابا عبداللہؑ کی نصیحتیں:

☆ "الناس عبيد الدنيا والدّين لعق على السنتهم"۔
"لوگ دنیا کے بندے ہیں اور دین فقط زبانوں پر ہے"۔

☆ آپ کے خطبوں میں نصیحتیں

☆ جناب زہیر کے مواعظ

☆ اباعبداللہ کا جملہ کہ تم نے نصیحت کو کمال پر پہنچادیا

☆ حنظلۂ شبامی کا موعظہ۔

اصول اجتماعی اور مساوات اسلامی :

☆ جناب ابوذر غفاریؓ کے غلام جون کی داستان (نفس المہموم ص ۱۵۵) :

☆ "فوقف علیه الحسین علیه السلام وقال:اللهم بیض وجهه وطیّب ریحه، واحشرهُ مع الابرار، وعرّف بینه وبین محمد وآله"۔

"امام حسینؑ نے (جون کے پاس) توقف کیا اور فرمایا: خداوندا اس کا چہرہ منور فرمادے اور اس کی بُو کو مہکادے اور اسے نیکوکاروں کے ساتھ محشور فرما اور اس کے اور آل محمدؐ کے درمیان شناسائی برقرار رکھ"۔

☆ ترکی کے جوان کی داستان۔ (نفس المہموم ص ۱۵۶)

۱۵۔ تبلیغ کا میدان طبیعی طور پر شہادت کے بعد فاجعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد کینہ پروروں اور طمع کاروں کے احساسات فرو ہونے اور ان کی جگہ رقت انگیز احساسات کے پیدا ہونے کے بعد، مظلومیت کا پہلو رونما ہونے اور حق کے ثابت ہونے کے بعد ہی زیادہ وسیع طور پر فراہم ہوتا ہے۔ اباعبداللہؑ کی شہادت کے بعد آپ کے اہلِ بیتؑ مکرم کے ذمہ ایک طرف بہرہ داری کا مرحلہ تھا اور دوسری طرف حادثہ کی حقیقت سے شناسائی کرانا اور جھوٹی تبلیغات کے پیدا کردہ تاریک پردہ کو چاک کرنا تھا۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: "اِنَّ الفِتَنَ اذا اقبلت شبهت واذا اَدبَرَت نبّهت"۔ "یاد رکھو فتنے جب کھڑے ہوتے ہیں تو لوگوں کے ذہنوں میں حق کے بارے میں شبہات ڈال دیتے ہیں اور جب برطرف ہو جاتے ہیں تو ہوشیار کر جاتے اور حق کو

روشن کر جاتے ہیں"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۹۳)

دراصل اہل بیتؑ اور امام حسینؑ کی حقیقی شناسائی نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ فتنے کے شور و غل کے وقت انسان اس میں غرق رہتا ہے اور جب ایسے موقعوں پر خود بھی واقعہ میں شامل رہتا ہے تب تو صحیح نقطۂ نظر سے بالکل بھی آگاہ نہیں ہو پاتا' جبکہ کنارے پر ایک طرف بیٹھ کر دیکھنے والا انسان بہتر طریقہ سے واقعہ کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے اذہان کو طبیعی طور پر جریانات اور واقعات کے ختم ہونے کے بعد ہی روشن کیا جا سکتا ہے۔اسی لئے تبلیغات کو بہتر انداز میں پیش کرنا اسیرانِ اہل بیتؑ کی اہم ترین ذمہ داری تھی۔ یہاں پر دو مقدموں کا ذکر لازمی ہے :

الف۔روایات کی منطق کے پیش نظر اور ہمارے اُس خاص اعتقاد کے مطابق کہ امامؑ اور عالمِ مافوقِ بشری یعنی عالم غیب میں اتصال وارتباط ہے' امام حسینؑ کے تمام امور کسی پروگرام اور پیش بینی کے تحت تھے اور ان امور میں کوئی اشتباہ ہونا یا انکا تصادفی واتفاقی ہونا ممکن نہیں ہے۔امامؑ کا خواتین اور بچوں کو ایسے پر خطر سفر میں اپنے ساتھ لے جانا اس وقت کے ان عقلاء کو کہ جن کا محور فکری اباعبداللہ اور اہل بیتؑ کی جان بچانا تھا' سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ اسے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ امامؑ کا حتیٰ حضرت مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملنے اور اپنی سرنوشت کے مسلّم اور قطعی ہو جانے کے بعد بھی اہل بیتؑ کو مدینہ واپس نہ بھیجنا یہ بتاتا ہے کہ یہ ایک پروگرام کے تحت ہونے والے امور تھے۔

روایات میں بھی ذکر ہوا ہے کہ عالم رویا میں پیغمبر اکرمؐ نے امام حسینؑ سے فرمایا: "انّ اللہ شاء ان یراك قتیلاً وان اللہ شاء ان یراھنّ سبایا"۔ "خداوند عالم آپکو شہید اور آپکے خاندان کو اسیر ہوتے دیکھنا چاہتا ہے"۔البتہ

اس حدیث سے جو مقصود ہے وہ ارادہ تشریعی تھا' نہ کہ ارادۂ تکوینی۔ ارادۂ تکوینی سے مراد حتمی الٰہی قضاء و قدر ہے جبکہ ارادۂ تشریعی سے مراد مصلحت اور رضائے الٰہی ہے جیسے یہ آیت کریمہ ہے: "یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر"۔ "خدا تمھارے بارے میں آسانی چاہتا ہے' زحمت نہیں چاہتا"۔ (سورۂ بقرہ: ۱۸۵)

خلاصہ یہ ہے کہ روایات کی منطق کے مطابق' امامؑ کا خواتین اور بچوں کو ساتھ لے کر جانا مصلحت کی بنیاد پر تھا جسے ابن عباس جیسے درک نہیں کر سکتے تھے۔

ب۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ عورت تاریخ سازی میں تین قسم کے کردار رکھتی ہے یا رکھ سکتی ہے۔ پہلا یہ ہے کہ عورت ایک بہت گراں بہا چیز ہے اور نیتجتاً محض ناقص اور کسی کردار کے لائق نہیں ہے۔ چونکہ گراں بہا شے ہے' اسلئے بے کردار ہے۔ یہ وہی منطق ہے کہ جسکے سبب عورت کو بس گھر کے کونے میں بٹھانے' مرد کی خدمت کرانے' بچے جننے اور دودھ پلانے ہی کے لائق سمجھا جاتا ہے' بر خلاف اسکے کہ وہ بچہ کی روحی استعداد کو ترقی اور بالیدگی دے' اس کی تعلیم و تربیت واقعی پر توجہ دے اور اسکی شخصیت تیار کرے۔

اس منطق کے مطابق عورت کے جس قدر ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہوں وہ اتنی ہی بہتر اور گراں بہا ہے' جتنی زیادہ بے زبان ہو اتنی ہی بہتر اور زیادہ گراں بہا ہے' جتنی زیادہ بے خبر ہو اتنی ہی زیادہ بہتر اور زیادہ گراں بہا ہے' جتنی زیادہ بے ارادہ ہو بہتر' جتنی زیادہ ناآگاہ ہو بہتر' جتنی زیادہ اسیر اور مسلوب الارادہ ہو بہتر اور جتنی زیادہ بے ہنر اور اثر پذیر ہو اتنی ہی بہتر ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی انسانی شخصیت کو تین اصول تشکیل دیتے ہیں: آگاہی' آزادی اور اخلاق' ان تینوں چیزوں کا عورت میں جسقدر فقدان ہو' وہ اسی قدر

بہتر۔ اس صورت میں عورت ایک مرد کا کھلونا ہوتی ہے' البتہ تمام جامعہ کے مردوں کا کھلونا بہر حال نہیں بن جاتی۔

عورت کا تاریخ سازی میں دوسرا کردار یہ ہے کہ ہم کلی طور پر مرد اور عورت کے درمیان تفاوت اور فرق کو ختم کرلیں۔ ان تمام حدود کو کہ جن سے عورت محترم ہوتی ہے' ختم کردیں اور عورت کو ایک کلی طور پر مورد استفادہ اور بہرہ برداری کے قابل چیز قرار دے دیں۔ یعنی مرد اور عورت کے درمیان فاصلہ اور حریم کو کلی طور پر ختم کردیں۔ اس نظریہ کے تحت عورت ایک شخصیت تو ہے اور تاریخ ساز بھی ہے لیکن اس کی کوئی قدرو قیمت نہیں اور اس کا کردار زیادہ تر تاریخ کو فاسد کرنے کی جہت میں ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عورت پہلے نظریہ کے مطابق کچھ حد تک عزیز' محبوب اور قدرو قیمت کی حامل تھی لیکن ضعیف' کمزور اور ایک گراں بہا چیز تھی۔ لیکن اس دوسرے نظریہ کے مطابق وہ ایک شخصیت تو ہے لیکن بے ارزش اور بے قدرو قیمت شخصیت۔

تیسرا کردار وہ ہے کہ جسکی مکتبِ اسلام حمایت کرتا ہے' یعنی یہ کہ عورت ایک گراں بہا شخصیت ہے اور اسکی یہ قدرو قیمت دو چیزوں سے وابستہ ہے:
ایک تو خاص انسانی استعداد سے یعنی یہ کہ وہ علم' ارادہ' قدرت' افکار اور اخلاق سے بہرہ مند ہو اور دوسرے یہ کہ وہ ابتذال سے دور اور مرد کی مورد مفاد بننے سے دور رہے۔ پس مکتبِ اسلام عورت کی حرمت کی نگہداری کے ساتھ ساتھ اس میں استعداد پیدا کرتے اور اسکے کمالات میں نمو اور بالیدگی کا حامل ہے۔ اسلام میں عورت کا حریم ہونا نہ تو محبوسیت ہے یعنی بالکل الگ تھلک ہو کر گھر میں محبوس رہے اور نہ ہی اختلاط ہے یعنی مردوں کے ساتھ

شیر و شکر ہو کر رہے۔

ان مطالب کے رو سے تاریخ کبھی فقط مذکر محض اور کبھی مختلط یعنی مرد عورت کا خلط ملط اور اس بے راہ دو میل جول ہی کی وجہ سے وہ تاریخ پلید ہوتی ہے۔ لیکن ایک اور تاریخ بھی ہے جو مذکر و مؤنث تو ہے مگر اس طرح سے کہ مرد اپنے دائرہ میں اور عورت اپنے دائرہ میں رہ کر کردار ادا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کبھی عورت تاریخ سازی میں مؤثر عامل نہیں ہوا کرتی ہے، کبھی عامل ہوتی ہے مگر مختلط اور در حقیقت مرد کا کھلونا بن کر، اور کبھی تاریخ سازی میں عامل ہوتی ہے مگر اپنے دائرہ میں رہ کر۔

اسلامی تاریخ میں عورت قرآن کریم کے فرمان کے مطابق ایک مؤثر عامل ہے یعنی از روئے قرآن مذہبی تاریخ مذکر و مؤنث ہے (یعنی انسانی ہے)۔ اس میں مرد و عورت، ہر ایک اپنے خاص مدار کو محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی تاریخ "مذنّث" ہے "زوج" ہے۔

ہم نے "زن در قرآن" کے اوراق میں اس کے بارے میں بحث کی ہے۔

حادثہ کربلا بھی ایک "انسانی" تاریخ ہے، یعنی تاریخ زوج ہے، نہ تاریخ فرد، مذنّث ہے، نہ فقط مذکر، مذکر اور مؤنث ہے، نہ مذکر محض۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق عورت جب تک محض عشق بازی کا اور مردوں کی ہوسِ نظر کا وسیلہ رہتی ہے اور اپنی آرائش و زیبائش کے ذریعہ مردوں (اور وہ بھی عمومی مردوں) کی محفل سجانے اور گرم رکھنے میں مصروف رہتی ہے، وہ کبھی بھی تاریخ میں مستقل اور مؤثر نقش نہیں رکھتی۔ تاہم، ہم تاریخ میں عورت کے غیر مستقیم بنیادی تاثیر کے منکر نہیں۔ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی تربیت کرتی اور مرد کو بناتی ہے۔ اس بات کو سب جانتے ہیں کہ عورت نے بہت

سے فرزندوں اور شوہروں کے ذریعہ سے تاریخ تشکیل دی ہے۔ ہمارا موضوع گفتگو یہاں عورت کے مستقیم کردار کے بارے میں ہے۔

قرآن کریم جہاں صدیق اور طاہر مردوں کی بات کرتا ہے' وہاں صدیقہ اور طاہرہ عورتوں کو بھی یاد کرتا ہے کہ یہ مردان صدیق کی حد تک بلکہ ان سے بھی بالاتر ملکوتی مقام رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا' حضرت مریم کی قدرومنزلت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کی ہمسر (حواؑ)' سارہ' ہاجرہ' آسیہ' مادرِ موسیٰؑ' خواہرِ موسیٰؑ' حضرت مریم اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا (کوثر)' قرآن کی طاہرہ عورتیں ہیں۔ حضرت خدیجہ خود تاریخ اسلام کی طاہرہ ہیں۔

قرآن کریم نے مومن مرد اور مومن عورتوں' مہاجر مرد اور مہاجر عورتوں' اطاعت گزار اور مرد اطاعت گزار عورتوں' صادق مرد اور صادقہ عورتوں اور صالح مرد اور صالحہ عورتوں کو یاد کیا ہے۔

دنیا کے کچھ قوانین میں عورت کو فقط فریب اور گناہ کا عنصر تصور کیا جاتا ہے۔ اس تصور نے یہاں سے جنم لیا ہے کہ شیطان حواؑ کے ذریعہ آدم پر مسلط ہوا اور یہ فلسفہ آج تک چلا آرہا ہے کہ شیطان عورت کو فریب دیتا ہے اور عورت مرد کو' لیکن قرآن اس منطق کو قبول نہیں کرتا۔

۱۶۔ حضرت زینب (س) کے خطبے مجموعی طور پر چند حصوں میں منقسم ہیں۔

الف۔ ملامت اور سرزنش:

"یااهل الکوفة' یا اهل الختل والغدر والخذل! الا فلا رقأت العَبرَة ولا هدأت الزفرة' انّما مثلکم ......هل فیکم الا الصَّلَفُ و العجبُ ؟"

"کوفہ والو! اے مکار ودغاباز لوگو! اے بے غیرت لوگو! خدا کرے کہ

تمہارے آنسو خشک نہ ہوں اور تمہاری آہیں سرد نہ ہوں۔ تم اس داستان میں کسی کے ساتھ رہے ہو...... آیا بجز چاپلوسی' خودبینی و...... تمہارے پاس کوئی چیز ہے ؟"

ب۔ اشتباہ سے آگاہی :

"فابکوا فانکم احریاءُ بالبکاء' فقد ابلیتم بعارھا ومنیتم بشنارھا 'ولن ترحضوھاابداً' وانّی ترحضون قتل سلیل خاتم النبوۃ ومعدن الرسالۃ وسیّدشباب اھل الجنۃ وملاذ حربکم ومعاذ حزبکم ومقرّ سلمکم وآسی کلمکم ومفزع نازلتکم والمرجع الیہ عند مقاتلتکم ومدرۃ حججکم ومنار محجّتکم"۔ "پس روؤ کہ تم اسی کے لائق وسزاوار ہو...... تمہارے دامن پر ذلت کی گرد بیٹھ چکی ہے۔ یہ بدنامی کا داغ تمہارے دامن پر ہمیشہ رہے گا اور تم اسے ہرگز نہ چھڑا سکو گے۔ اور اس دھبے کو تم کیسے چھڑا سکتے ہو کہ تم نے جنت کے جوانوں کے سردار اور فرزندِ رسولؐ کو قتل کیا ہے' جو جنگ میں تمہاری پناہ گاہ اور صلح کے زمانے میں تمہارے آرام وسکون کا باعث تھا۔ جو تمہارے زخموں کا طبیب تھا' جو مشکلات کے وقت تمہاری پناہ گاہ تھا' جو تمہیں حج کے بارے میں بیان کرنے والا اور تمہاری راہ کا روشن مینار تھا' تم نے اسے ڈھادیا"۔

ج۔ ضمیر کو جھنجھوڑنا' عواطف کو حرکت میں لانا

"ویلکم اتدرون ایّ کبد لرسول اللہ فریّتم 'وایّ عھدنکثتم 'وایّ کریمۃ لہ ابرزتُم 'وایّ حرمۃ لہ ھتکتم ' وایّ دم لہ سفکتم"۔ "وائے ہو تم لوگوں پر! کیا تم جانتے ہو کہ تم نے رسولؐ اللہ کا کونسا جگر کاٹا ہے ؟ کیسا پیمان توڑا ہے ؟ ان کی بیٹیوں کو بے پردہ کر کے کس کی حرمت کی ہتک کی

ہے ؟اور کس کس کا خون بہایا ہے ؟"۔

"لقد جئتم شيئاً ادّا تكاد السموات يتفطرن منه......"۔ "سچ تو یہ ہے کہ تم نے بہت برا کام کیا ہے' نزدیک ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑے"۔

د۔ انتقام الٰہی :

"فلا يستخفنكم المهل فانّه عزّوجلّ لا يحفزه البدارُ ولا يُخشىٰ عليه فوت الثار، كلّا انّ ربّك لنا ولهم لبالمرصاد"۔ "اس مہلت سے تمہیں مغرور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خدا کسی کام میں عجلت کرنے سے منزہ ہے۔ بے گناہ خون کو پامال کرنے سے ڈرو کہ وہ انتقام لینے والا ہے اور ہم سب کو دیکھ رہا ہے"۔

۱۷۔ ہم نے تبلیغ کے موضوع پر گفتگو میں بتایا تھا کہ ایک پیام کے موفقیت اور کامیابی کی چند شرائط ہیں :

(۱) پیام کا حق ہونا اور پیام کے مطالب سے آشنائی۔

(۲) جائز امکانات اور وسائل بروئے کار لانا اور غیر مشروع وسائل سے استفادہ کرنے سے پرہیز کرنا۔

(۳) صحیح طریقہ اور اسلوب اختیار کرنا۔

(۴) خود پیام پہنچانے والے کی شخصیت۔

یہاں ہمارا موضوع بحث دو مطالب ہیں : ایک بحث کلی ہے اور وہ پیام پہنچانے والے کی شرائط کے بارے میں ہے۔ دوسری بحث جو جزئی ہے' وہ اہل بیتؑ کی شخصیت کی تاثیر اور انکی تبلیغ کے اثر سے متعلق ہے۔ اہلبیتؑ کی تبلیغ کے دو پہلو تھے۔

ایک پہلو اسلام کو پہچنوانا اور دوسرا لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا تھا۔

دوسرے پہلو کے بارے میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں نے کیا زمینہ

بنایا ہوا تھا' اوضاع واحوال پر کس طرح کا پردہ ڈالا ہوا تھا' وہ کیا چاہتے تھے اور اہل بیتؑ نے کس طرح سے اس پردۂ نفاق کو چاک کیا۔ ابن زیاد اپنی مجلس میں حضرت زینب (س) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"الحمدلله الّذی قتلکم وفضحکم واکذب احدوثتکم"۔ "اس خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا' شرمندہ کیا' اور تمہاری باتوں کو جھٹلایا۔ جملہ الکذب احدوثتکم سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے تم نے دیکھا! حقیقی طور پر حکومت ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہئے اور تمہاری باتیں ناحق تھیں' اسی لئے خدا نے تمہیں مغلوب کیا۔ یہ منطق ان لوگوں کی منطق ہے جو ہمیشہ موجود نظام ہی کو بہترین نظام سمجھتے ہیں اور حالات بہتر اور موافق ہونے کو خدا کے راضی ہونے کی دلیل بتلاتے ہیں کہ اگر یہ حکومت صحیح نہ ہوتی تو خدا خود اس کو درمیان سے ہٹا کر ختم کر دیتا۔ لیکن اب چونکہ یہ حکومت ہے اور درست بھی ہے' اسلئے اسے ہونا بھی چاہئے۔ یہاں "ہے اور ہونا چاہئے" کے درمیان ایک رابطہ ہے' چونکہ یہ حکومت موجود ہے' اسلئے اسے ہونا بھی چاہئے اور یہ صحیح بھی ہے (یہ منطق مذہبِ جبریہ کے معتقدین کی منطق ہے جو جبر کو عین عدل بتلاتے ہیں۔ منطق مرجیہ ہے) جیسا کہ دور جاہلیت میں کہا جاتا تھا: "انطعم من لو یشاء اللہ اطعمه"۔ "ہم انہیں کیوں کھلائیں' خدا اگر چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا"۔

(سورۂ یٰس ۴۷)

یا جیسا کہ یہ آیت کریمہ ہے: "تؤتی الملك من تشاء و تنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء و تذلّ من تشاء"۔ "خدا جس کو چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلب کر لیتا ہے جس کو چاہتا ہے' عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے"۔ (سورۂ آل عمران ۲۶)۔ آیت کی اس طرح سے تفسیر اور

تعبیر ایک عظیم مغالطہ ہے۔

مگر حضرت زینب سلام اللہ علیہا جواب دیتی ہیں :"الحمدلله الّذی اکرمنا بنبیه محمد وطهرنا من الرجس تطهیراً ' انما یفتضح الفاسق ویکذب الفاجر وهو غیرنا والحمدلله"۔ "حمد و ستائش ہے اس خدا کے لئے جس نے ہمیں اپنے رسول محمدؐ کے ذریعہ عزت بخشی اور کثافتوں سے ہمیں پاک رکھا۔ ذلیل تو فاسق ہوتا ہے اور نابکار جھوٹ بولتا ہے اور الحمد للہ ہم تو ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمارا غیر ایسا ہے"۔

ابن زیاد نے کہا :"کیف رایت صنع الله باخیك 'قالت :کتب اللهِ علیهم القتل فبرزوا الیٰ مضاجعهم 'وسیجمع الله بینك وبینهم ' فانظر لمن یکون الفلج ' هبلتك اُمُّكَ یابن مرجانه ......فغضب ابن زیاد واستشاط......"۔"دیکھا خدا نے تمہارے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟ (حضرت زینب (س) نے) فرمایا : یہ ایک جماعت تھی جس کے لئے خدا نے شہادت لکھ دی تھی' چنانچہ وہ ابدی قیام گاہ میں جاکر محو آرام ہوگئے ہیں۔ قیامت کے دن خدا ان کے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور تجھ سے خون کا قصاص لے گا' اس روز تجھے معلوم ہو جائے گا کہ کامیاب کون ہے ؟ ابن مرجانہ ! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ یہ جملہ سنکر عبید اللہ بن زیاد کو غصہ آگیا......"

جب ابن زیاد علی بن الحسینؑ ابن زیاد کے پاس پہنچا' اس نے کہا :

من انت؟ :فقال انا علی بن الحسینؑ ۔فقال:الیس قد قتل الله علی بن الحسینؑ ' فقال له علیؑ :قد کان لی اخی یسمّٰی علیّا' قتله الناس ' فقال له ابن زیاد: بل الله قتله ۔ فقال علی ابن الحسینؑ :

الله يتوفّى الانفس حين موتها ...... فغضب ابن زياد فقال : وبك جرأةٌ لجوابي وفيك بقيّة لردّ عليّ! اذهبوا به فاضربوا عنقهُ......

"تم کون ہو ؟ فرمایا : میں علی ابن الحسینؑ ہوں۔

ابن زیاد نے کہا : کیا خدا نے علی بن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟

علی بن الحسینؑ نے فرمایا : میرے ایک بھائی کا نام بھی علی ابن الحسینؑ تھا جنہیں لوگوں نے قتل کر دیا۔

ابن زیاد نے کہا : اسے خدا نے قتل کیا ہے۔

علی بن الحسینؑ نے فرمایا : خدا موت کے وقت روح قبض کرتا ہے......

ابن زیاد غضبناک ہو کر بولا : مجھے جسارت کے ساتھ جواب دیتے ہو' اس کو لے جاؤ اور اسکی گردن مار دو!"

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابن زیاد منطق جبریہ کو اپنے کام کے لئے تائید بنانا چاہتا تھا۔ جو بھی واقعہ اور حادثہ ہو وہ بالآخر اپنی حمایت کیلئے کسی فلسفہ کا محتاج مند ہوتا ہے۔ تبلیغاتی جنگ وہیں ہوتی ہے کہ جہاں فلسفے آپس میں ٹکرائیں۔

اہل بیتِ پیغمبرؐ کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے دشمن کے اقناعی (خود کو قادر و توانا جاننا) فلسفہ کو مستحکم ہونے نہیں دیا۔

ان ذوات مقدسہ کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے خود دشمن ہی کے ذریعہ نزدیک سے عوام الناس سے رابطہ قائم کیا' جبکہ صورت یہ تھی کہ اس سے پہلے لوگ رابطہ کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ خود حضرت زینب (س) نے دشمن کے اسٹیج سے استفادہ کیا۔ دشمن کے اسٹیج سے استفادہ کرنے کا مطلب جنگ کو دشمن کے گھر کھینچ کر لیجانا تھا۔

اہل بیتؑ کے اس طرح سے موقع سے فائدہ اٹھا کر حقیقت شناسائی کرانے

کے عمل نے کوفہ کو انقلاب کی ایک چھاونی میں تبدیل کر دیا۔ ایسی کوفہ کے لوگ کہتے تھے: "کھو لھم خیرالکھول وشبابھم ......"۔ "ان کے بوڑھے بہترین بوڑھے ہیں اور ان کے جوان......"۔

خلاصہ یہ کہ کوفہ و شام اور بین راہ کے حالات اہل بیتِ حرمؑ کے جانے سے پہلے اور جانے کے بعد مختلف تھے۔ کوفہ میں ایسا انقلاب آیا جو توابین کو وجود میں لایا اور بعد میں اسی کوفہ نے شام اور ابن زیاد کے خلاف قیام کیا۔ ابن زیاد کوفہ والوں ہی سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا اور شام میں اس انقلاب کا اثر وہی ہے جو مسجد اموی میں ظہور پذیر ہوا۔

یزید کا آخری ایام میں اپنی روش کو تبدیل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مغلوب ہو گیا تھا اور اس کا یہ حکم دینا کہ اہل بیتِ امامؑ کو عزت واحترام کے ساتھ مدینہ واپس لے جایا جائے' اسی جہت سے تھا۔ اسی طرح اس کا قیام حرّہ میں یہ حکم دینا کہ خصوصاً علی بن الحسینؑ سے نہ ٹکرانا' یہ بھی اس کے مغلوب ہونے ہی کی علامت تھی۔

نواں باب

متفرق یادداشت

متفرق یادداشتیں

آیاامام حسینؑ کے لئے کوئی خصوصی حکم تھا؟

مرحوم آیتی کتاب ”بررسی تاریخ عاشورا“ کے مقدمہ میں کہتے ہیں: ”کتاب کافی میں ایک صحیح حدیث ہے جسے ضُریس کنانی کی بہت معتبر سند کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ: ”حُمران بن اعین شیبانی نے امام باقرؑ سے عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں، امیر المومنینؑ اور حسنینؑ کی زندگی میں واقعات جو گزرے ہیں، ان کا ذکر فرمائیے۔ خروج اور قیام سے لے کر جہاد فی سبیل اللہ تک ان تمام باتوں کے بارے میں کہ جن میں وہ حضرات گرفتار ہوئے، ظالموں کے ہاتھوں شہید ہونے سے لے کر مغلوبیّت تک، جو کچھ ان پر گزری، ان سب کے متعلق کچھ بیان فرمائیے۔ آپؑ نے فرمایا: جوواقعہ پیش آیا، اگرچہ کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسے انکے لئے مقدّر کیا تھا، یہ خود اسکے حکم سے تھااور، اس پر خود اس نے امضاء کیا تھا۔ خود خدا نے اس کو حتمی بنایا تھااوراس کے بعد اس کا اجراء کیا تھا۔ علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے قیام ”فبتقدُّم علم ذلك اِلیھم مِن رسول الله“۔ تھے۔ یہ حضرات پہلے سے اس کے بارے میں جانتے تھے۔ انہیں پہلے سے اس کا حکم ہو چکا تھااور یہ حکم رسولِ خدا کے ذریعہ ان تک پہنچا تھا۔ اور اسی طرح جس امامؑ نے سکوت و خاموشی اختیار کی، وہ بھی علم کے مطابق اور حکم کے تحت ہی تھی“۔

متذکرہ بالا آخری سطر کے لئے خصوصاً اصل حدیث کی طرف مراجعہ کرنا چاہئے۔

واقعہ کربلا۔۔۔۔ خون سے لکھا گیا پیام

۱۔ مرحوم آیتی اپنی کتاب ”بررسی تاریخ عاشوار“ (ص ۱۷۹، نویں تقریر) میں واقعۂ کربلا کی ناقابلِ تسخیر تاریخ اور اس کی امانت کی قوت وقدرت سے

متعلق بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد ابن زیاد کے اس سراپا جعل کو نقل کرتے ہیں جو اس نے اہلِ کوفہ کو دھوکہ دینے کیلئے کیا۔ وہ کوفہ کی مسجد اعظم کے منبر پر گیا اور بولا: "الحمدلله الّذی اظهر الحقّ و اهله ' و نصر امیرالمومنین یزید وحزبه 'وقتل الکذّاب ابن الکذّاب الحسین و شیعتهُ"۔ "شکر ہے اس خدا کا جس نے حق و اہلِ حق والوں کو کامیاب کیا' امیر المومنین یزید اور اُن کے پیروں کی مدد کی اور کذاب ابن کذاب' حسینؑ اور انکے شیعوں کو قتل کیا"۔

یہاں پر عبداللہ بن عفیف ازدی غامدی جو نابینا تھے 'کھڑے ہو گئے اور بولے: "اے مرجانہ کے بیٹے! کذاب ابن کذاب تو ہے اور تیرا باپ ہے اور وہ ہے جس نے تجھے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا ہے"۔ آخر کار ابن عفیف شہید ہوئے۔

مرحوم آیتی کہتے ہیں: "اس مرد بزرگوار نے جان پر کھیل کر یہ بات کہی۔ بالآخر ابن زیاد کے حکم پر شہید کر دیئے گئے اور سولی پر لٹکا دیئے گئے۔ لیکن یہ مجاہدِ بزرگ تاریخ کے ایک صفحہ کو روشن کر گیا اور اس نے تاریخ عاشورا کا ایک صفحہ اپنے خون سے رقم کیا"۔

درحقیقت یہ تمام جملے مثلاً: "الاترون ان الحق لایعمل به وان الباطل لایتناهی عنه......"۔ "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے روکا نہیں جارہا"۔

"ایهاالناس ! من رأی سلطانا جائراً......"۔

"الا وانّ الدّعی ابن الدّعی......"۔

"هیهات منّا الذلّة"۔

"ان لم یکن لکم دین......"۔

"الموت اولیٰ من رکوب العار......"۔

"رضاً بقضائك...... لامعبود سواك"۔

"خُطّ الموت علی ولد آدم......"۔

اور اس طرح کے دوسرے بہت سے جملے' سب کے سب خون سے لکھے گئے ہیں اور خون کا رنگِ قرمز اور سرخ رنگ پختہ ترین اور نمایاں ترین رنگ ہے۔

عاشورا کے حوادث و وقائع ایسے واقعات ہیں کہ جو خون سے رقم کئے گئے ہیں۔ ہم کبھی سنتے ہیں کہ کچھ افراد جب کسی فاجعہ یا حادثہ میں مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو مرتے وقت چونکہ قلم اور کاغذ مہیا نہیں ہوتا اسلئے اپنی انگلی سے اور اپنے خون سے وصیت لکھ جاتے ہیں۔ یا کچھ افراد علامتِ انقلاب کے طور پر کسی صفحہ پر اپنے خون سے کوئی ایک جملہ لکھ دیتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں یہ ریت تھی کہ عہد و پیمان کرتے وقت باہم عہد کرنے والے عرب اپنے ہاتھوں کو خون سے بھرے ایک برتن میں ڈبوتے تھے اور یہ طریقہ اس عہد و پیمان پر اپنے آپ کو قربان کرنے کی علامت ہوتا تھا۔

عبداللہ رضیع یعنی جناب علی اصغر کی شہادت کا واقعہ اور امامؑ کا اس طفل شیر خوار کا خون آسمان کی طرف پھینکنا خود ایک صفحہ ہے' جو خون سے لکھا گیا تھا۔

خود اباعبداللہ نے ایک واقعہ کے بعد (ظاہراً آپؑ کی پیشانی مبارک پر ایک پتھر لگا تھا)' اپنے خون سے بھرے ہاتھوں کو اپنے چہرہ پر ملا اور فرمایا: "ھکذا حتی القیٰ جدّی"۔ "میں اسی طرح اپنے نانا کا دیدار کرنا چاہتا ہوں"۔

۲۔ امامؑ نے بالآخر کیوں بصرہ کے لوگوں کو خط لکھ کر دعوت دی؟ آیا یہ خونریزی اور انقلاب کو وسعت دینے کیلئے ایک نوع کا نقشہ نہیں تھا؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ شب عاشورا حبیب ابن مظاہر کو کیوں بنو اسد کے پاس بھیجا؟ آیا امامؑ کو یہ

احتمال تھا کہ بنو اسد مقاومت کر سکتے ہیں' اسلئے آپ نے ایسا کیا؟ کبھی بھی نہیں۔ بالآخر کیوں آپ نے اپنے اصحاب ویاران اور اپنے اعزاء کو جنگ سے نکل جانے پر مجبور نہیں کیا؟ اور کیوں ان کے شہید ہونے کی داد طلبی کو قبول کیا؟ کیا بات یہی نہیں ہے کہ امام خصوصی طور پر اس کام کو کرنا چاہتے تھے۔ امام چاہتے تھے کہ اپنے اعتراض و انتقاد کو اعلان جرم اور فریاد کو' عدالت خواہی و حقیقت خواہی کو (بالآخر پیغام اسلام کو)' اپنے اور کچھ دوسرے افراد کے خون سے لکھا جائے تا کہ پھر یہ کبھی بھی نہ مٹ سکے۔ اسی لئے تو امامؑ نے اپنے آتش بیان خطبے کو حُرؒ کے مد مقابل ہونے اور لشکرِ حُر میں گھر جانے کے بعد ایراد فرماتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ باتیں جو خون سے لکھی جاتی ہیں' کبھی بھی نہیں مٹتیں اسلئے کہ خون سے لکھا جانا صداقت' خلوص' تصمیم کی گہرائی اور ایک فکر کی حکایت کرتا ہے۔ شہید کی منطق دوسری منطقوں سے مافوق ہے۔

بہت سے سلاطین یہ چاہتے تھے کہ ان کے نام' انکی باتیں اور انکے پیغام (اگر چہ کہ اس میں انسانوں کیلئے کوئی پیغام نہیں تھا اور وہ فقط ان کی خود خواہی کا اظہار تھا) باقی رہ جائیں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے دھات پر یا پتھر کی لوح پر اپنی بات کندہ کروائیں مثلاً ''میں ہوں شاہِ شاہان'' یا ''میں بادشاہ ہوں'' یا ''میں بادشاہ کی نسل سے ہوں''!!! لیکن یہ کندہ کی ہوئی باتیں اور یہ نوشتے کبھی بھی لوگوں کے دلوں اور سینو ں پر ثبت نہ ہوئیں اور نہ اس جگہ ہی نقش رہ سکیں۔ اسکے بر عکس وہ پیام جو امام حسینؑ کے پیام کی مانند تھے' اگر چہ کہ کسی دھات' تختی یا پتھر پر کندہ نہیں کئے گئے تھے لیکن چونکہ خون سے لکھے گئے تھے اور ہوائی لہروں کے صفحات پر ثبت ہوئے تھے اسلئے لوگوں کے سینوں اور دلوں پر ثبت ہو گئے اور انبیاء کے دلوں پر وحی کی نورانی خطوط کی طرح' ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئے۔ انّ للحسین محبۃ مکنونۃ فی

قلوب المومنین ۔(امام حسینؑ کے لئے مومنین کے دلوں میں ایک محبت پنہان ہے)۔امام حسینؑ کا پیام روح کے عالی ترین مقامات اور مراکز پر ثبت ہوا یہاں تک کہ دل اس کے احساسات کی ایک جگہ بن گیااور ان کا نام لیتے ہی آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔خدا جانتا ہے کہ اس ایک ہزار تین سو سال میں کتنے آنسو بہے ہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے عرق گلاب کو گلاب کے پھول سے حاصل کیا جاتا ہے۔یہ سب کس لئے ہے؟ اس لیئے ہے کہ انّ الذین آمنوا وعملو الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودّاً ۔"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے عنقریب خدائے رحمان لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کردے گا"۔(سورۂ مریم آیت ۹۶)'اسلئے ہے کہ وہ پیام حقیقت رسان تھے اسلئے ہے کہ ان کے پیام دل آشنا اور فطرت آشنا تھے'اسلئے ہے کہ ان کی باتیں ہماری باتوں کی مانند نہ تھیں'اور اسلئے ہے کہ اس کام میں خدا کا فرمان اور اسکے بندے کار فرما تھے۔

سید الشہداء علیہ السلام اور ان کی روح کی عظمت

۱۔ متنبّی کہتے ہیں:

واذا کانت النفوس کِباراً　　　تعبَت فی مرادھا الاجسام

"جس کا نفس بلند مرتبہ ہو اس کے بدن کو اپنی مراد کی راہ میں زحمت اٹھانا پڑتی ہے"۔

کوتاہ فکر لوگ چونکہ خود کوئی درد نہیں رکھتے، چونکہ ان کا کوئی ہدف نہیں ہوتا اور ان کے تمام اہداف اور ہم و غم جسمانی خواہشات تک ہی محدود رہتے ہیں اور چونکہ وہ کوئی آئیڈیل نمونۂ فکر نہیں رکھتے اسلئے اپنے بدن کو کبھی زحمت میں نہیں ڈالتے ہیں اور گدائی کر کے جو لقمہ بھی میسر آتا ہے، اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اسکے برعکس عظیم روحیں ہمیشہ اپنے بدن کو حرکت کیلئے آمادہ رکھتی ہیں اور زحمت اور بلا سے سکون حاصل کرتی ہیں۔ ان کے جسم شگافتہ اور سر تن سے جدا ہو جاتے ہیں۔ شہادت کو وہ اپنے لئے افتخار سمجھتے ہیں کیونکہ اسے وہ اپنے نفس کی عظمت کی علامت جانتے ہیں۔ اس طرح کے اشخاص کی روح جسم سے عظیم تر ہوتی ہے اور ان کے ۱۰۱ کا کام دشوار ہوتا ہے۔ علیؑ کا بدن جب چاہتا ہے کہ روح کا ہم آہنگ بن جائے تو جو کی روٹی پر گزر بسر گوارا کر لیتے ہیں، شب زندہ داری کرتے ہیں اور کبھی اشارہ ہو تو خود اپنا سر کو تنور میں ڈال دیتے ہیں۔ حسینؑ کا بدن جب چاہتا ہے کہ روح حسینؑ کے ساتھ رہے تو بہت زیادہ پیاس کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں، گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پامال ہونے کیلئے تیار رہتے ہیں اور تیروں کے زخموں سے کَالقُنفُذ بننے پر راضی بہ رضا نظر آتے ہیں (کہتے ہیں کہ حضرت کے بدن مبارک پر بیشمار تیر پیوست تھے کہ مثل خارپشت 'سیہی' نظر آرہے تھے)۔

خوش قسمت ہے وہ بدن جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی روح ہوتی ہے جو ہر قسم کے کھانے اس کے لئے مہیا کرتی ہے گدائی اور چوری کر کے بھی اس کیلئے روٹی فراہم کرتی ہے' جنایت اور آدم کشی کر کے اس کیلئے مقام بناتی ہے۔

بے چارہ ہے وہ بدن جو ایک شریف اور عظیم روح رکھتا ہے' جَو کے چند لقموں سے زیادہ اس کیلئے مہیا نہیں ہوتا جو بڑی مشکل سے حلق سے نیچے اترتا ہے۔ دوسری طرف وہ شب زندہ داری بھی کرتا ہے۔ دن میں تازیانہ لئے اجتماع کے نظم و نسق کی نگہبانی کرتا ہے' یا تلوار ہاتھ میں لئے مجرموں کی گردنیں مارتا ہے اور ایک دن خود اپنے سر کو تنور میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ حضرت علیؑ متقین کے بارے میں فرماتے ہیں: "انفسهم منهم فی تعب والناس منهم فی راحة"۔ "وہ اپنے نفس کو زحمت میں ڈالتے ہیں اور لوگ ان کی وجہ سے آسودہ رہتے ہیں"۔

آپؑ کے اس فرمان میں نفس سے مراد نفس حیوانی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے نفوس کی آسائش دوسروں کی آسائش میں اور لوگوں کی راحت سلب نہ کرنے میں پنہاں ہے۔

۳۔ امام حسینؑ کا یہ جملہ جو آپؑ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے: "ان الله یحبُّ معالی الامور و یبغض سفسافها"۔ "خداوند عالم کو بلند و بالا اور گرامی کام محبوب ہیں اور وہ پست اور حقر کام پسند نہیں کرتا"۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۴۶)۔ آپؑ کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ روح امامؑ جسم کے پست کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھتی تھی اور اسے اعلیٰ اور بلند مرتبہ کاموں ہی سے سروکار تھا۔

۴۔ کچھ لوگوں کی رائے میں روح' جسم کی خدمتگزار ہوتی ہے یعنی فکر' عقل اور عاطفہ' سب جسمانی' بدنی اور حیوانی اہداف کے حصول کیلئے حاضر رہتے ہیں۔

ایسی روح اسیر روح ہے' ایسی روح کچھ حد تک رنج برداشت کرتی ہے اگرچہ کہ چھوٹی روح کبھی رنج کا احساس بھی نہیں کرتی۔ روح کو عظیم ہی ہونا چاہئے تاکہ وہ درد و رنج کا احساس کرے۔ اگر ایسا کرے تو وہ روح چھوٹی نہیں ہے اور وہ جسم کی خدمت گزار نہیں ہے۔

۵۔ لنقل الصّخر من قلل الجبال　　احبُّ الیّ من منن الرجال

یقول الناس لی فی الکسب عار　　فانّ العار فی ذلّ السّؤال

"مجھے دوسروں کا احسان لینے سے زیادہ پہاڑوں سے پتھر اٹھانا زیادہ محبوب ہے۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ کام کرنا (کسب روزی) ننگ و عار ہے جبکہ در حقیقت دوسروں سے خواہش کر کے ذلت اٹھانے میں ننگ ہے"۔

یہ شعر روح کی عظمت کی خاطر بدن کو زحمت میں ڈالنے کی ایک مثال ہے۔

۶۔ امامؑ کا فرمان: "الا و انّ الدّعی ابن الدّعیّ...... ھیھات منّا الذّلّۃ" بھی ایک نمونہ ہے کہ روح کی عظمت کی خاطر بدن کو زحمت میں ڈالنا بہتر ہے۔

۷۔ روح و بدن ایک ہونے کے باوجود دو چیزوں کا مرکب ہیں۔ یہ دو دوست کی طرح سے ہیں کہ ایک طرف لازمی طور پر باہم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف دو ایسے دوست ہیں جن کا ہدف ایک نہیں ہے۔

میل جان اندر ترقّی و شرف　　میل تن در کسب اسباب و علف

"روح ہمیشہ ترقی اور شرف حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے جبکہ بدن اسباب و وسائل اور گھاس پھوس حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے"۔

اسی لئے دونوں میں سے جو چھوٹا ہوتا ہے' وہ دوسرے کے فائدہ کے لئے کام کرتا ہے اور کسی ایک کا رُشد کرنا دوسرے کیلئے ضرر رساں ہوتا ہے۔

۸۔ کہتے ہیں کہ نابغہ (عظیم) افراد ہمیشہ برے شوہر ہوتے ہیں۔ اس کا سبب بھی

واضح وروشن ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کی روح کا افق عورت کی آرزوں' افکار اور خواہشات کے افق سے بالاتر ہوتا ہے۔ ان کا جسم عورت کے ساتھ ضرور ہوتا ہے لیکن روح اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص عین نبوغ میں ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر اپنے آپ کو نیچے گرا سکے کہ ایک عام عورت کے افق عادی میں معاشرت کر سکے' تو وہ واقعاً نبوغ سے بھی بالاتر ہے۔ ایسا شخص جو اپنے آپ کو نیچے گرانے کی قدرت رکھتا ہو' یہ قدرت رکھنا بہت فوق العادۃ ہے۔

مجھے اس بات کا تجزیہ ہو چکا ہے کہ ایک مرتبہ نچلی افق کے کچھ افراد کے ساتھ مجبوراً کچھ دیر بیٹھنا پڑا تھا۔ بڑے المناک عذاب میں مبتلا ہوا تھا۔ ان سے بات کرنے کیلئے میرے پاس ایک حرف بھی نہ تھا' گویا میں اپنی تمام معلومات فراموش کر چکا تھا۔

روح کی عظمت اور بزرگواری :

۹۔ روح کی عظمت کے مقابل اس کی حقارت اور ذلت ہے' اس کی کمی کا پہلو ہے۔ ایک عظیم روح ایک بزرگ آرزو ہے' ایک بزرگ اور وسیع فکر ہے' ایک بزرگ خواہش اور ارادہ ہے' ایک بزرگ ہمّت ہے۔ وہ شخص جو یہ آرزو کرتا ہے کہ مال و دولت میں سب سے اول شخص ہو جائے' البتہ نہ محض آرزو کرتا ہو بلکہ آرزو کے ساتھ ساتھ حرکت بھی کرے' وہ ایک عظیم روح کا مالک ہے۔ بقول نظامی عروض کے "احمد بن عبداللہ الخجستانی سے جب پوچھا گیا کہ تم تو گدھے والے تھے' خراسان کے حاکم کیوں کر بن گئے؟ اس نے کہا : خجستان کے بادغیس میں ایک دن حنظلہ بادغیسی کے دیوان کو پڑھ رہا تھا' جب ان دو بیت پر پہنچا :

مہتری گر بہ کام شیر دراست　　شو خطر کن زگام شیر بجوی

یابزرگی وعزو نعمت وجاه　　یاچو مردانت مرگ رویاروی

تو میرے اندر ایک انقلاب سا آیا جس کی وجہ سے جس حالت میں زندگی گزار رہا تھا پھر میں اس سے راضی نہ رہا۔ گدھے بیچ کر میں نے گھوڑا خریدا اور وطن سے کوچ کر کے علی بن اللیث (صفاری) کی خدمت میں گیا...... اس تمام حرکت کا سبب یہ دو بیت تھے"۔ عظیم روحیں خود کو تن کی حقارت' ذلت اور کمی کے حوالے نہیں کرتیں اور وہ اپنی قدر و قیمت سے کم پر راضی نہیں ہوتیں۔

بہ کم از قدر خود مشو راضی　　بین کہ گنجشک می نگیرد باز

"اپنی قدر سے کم پر راضی نہ ہونا' دیکھو باز گوریا کا شکار نہ کرتا"۔

عظیم روح کے حامل لوگ اہل مہاجرت ہوتے ہیں' وہ اپنے گھر کے گوشہ میں بیٹھے نہیں رہتے اور اپنے آب و خاک پر قناعت نہیں کرتے بلکہ سفر کرتے رہتے ہیں' دریاؤں اور خطرات کا استقبال کرتے ہیں اور دن رات کوشش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں' دل کی بیماری انہیں پکڑ لیتی ہے اور وہ جمال عبدالناصر کی طرح عمر کے آدھے راستے میں مر جاتے ہیں۔ موسولینی کہتا ہے: "سو سال گوسفند بن کر زندہ رہنے کے بجائے میں ایک سال شیر بن کر زندہ رہنے کو ترجیح دیتا ہوں"۔

عظیم آدمی زندان سے نہیں ڈرتا' وہ دس سال اور بیس سال زندان میں گزارتا ہے تاکہ دو سال کام کی زندگی گزارے۔

۱۰۔ اسکندر' خشایار شاہ' نادر اور نپولین عظیم روح تھے اور سکون و آرام سے نہ بیٹھنے والے تھے' تاہم یہ لوگ بڑے جاہ طلب بڑے رقیب' حسود' شہوت پرست

اور حُسن پرست ہوا کرتے تھے۔ البتہ ایسے لوگ چھوٹی روح کے حامل انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ عظمت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اگر جہنم میں بھی جائیں تو ایک عظیم روح جہنم میں گئی۔ یہ لوگ بہت بڑے ہوا پرست تھے' جو چیز ان کے وجود اور ان کی روح میں نمو کرتی رہی وہ شہوت' جاہ طلبی حسد اور کینہ تھی۔

لیکن بزرگواری: بزرگواری' بزرگی کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ روح کی بزرگواری روح کے چھوٹے ہونے کے مقابل میں نہیں بلکہ پستی اور دنایت روح کے مقابلہ میں ہے۔

یہ پستی اور ذلت کیسی پستی اور ذلت ہے؟ یہ درحقیقت ماورائے طبیعت اور منطق مادّی کے خلاف ایک مسئلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنا تن پستی کی طرف نہ دھکیلو' خود کو خواری کی طرف نہ دھکیلو' آقا بنو نوکر نہیں' عزیز بنو ذلیل نہیں' ان میں سے کوئی چھونے کے قابل بھی نہیں۔ افتخار یعنی کیا؟ افتخار یعنی:

تن مردہ وگریہ دوستان   بہ از زندہ وخندۂ دشمنان
مرا عار آید ازاین زندگی   کہ سالار باشم کنم بندگی

"مرکر دوستوں کا رونا زندہ رہ کر دشمنوں کے ہنسنے سے بہتر ہے۔
"میرے لئے ایسی زندگی عار ہے کہ سالار ہو کر بندگی کروں"۔

یا یہ: "ان الحیاۃ فی موتکم قاھرین' والموت فی حیاتکم مقھورین"
"زندگی کامیابی کے ساتھ موت میں ہے اور موت شکست کے ساتھ زندگی میں ہے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵۱)

۱۱۔ "اشھد انك قد اقمت الصلوۃ وآتیت الزکوۃ وامرت بالمعروف......" ان جملوں سے امامؑ کی عظمت اور بزرگواری کی توضیح ہوتی ہے۔

حسینؑ بن علیؑ کے کلمات۔۔۔۔امامؑ کی زندگی کے شعار

۱۔ ''تاریخ یعقوبی'' میں ہے کہ لوگوں نے حسینؑ بن علیؑ سے سوال کیا کہ رسولِؐ خدا کا کوئی ایسا کلمہ جو خود آپؑ نے سنا ہوا' بیان فرمایئے تو فرمایا: ''میں نے رسولِؐ خدا سے سنا: ان الله یحب معالی الامور ویبغض سفسافها''۔ ''خداوند عالم کو بلند اور گرامی کام محبوب ہیں اور وہ پست اور حقیر کام پسند نہیں کرتا۔''(اگرچہ کہ یہ کملہ رسول اکرمؐ کا ہے لیکن چونکہ حسینؑ بن علیؑ کے علاوہ کسی اور سے نقل نہیں ہوا ہے' اسلئے اسے آپؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے)۔ یہ جملہ ''سفینۃ البحار'' میں رسولِؐ خدا سے نقل کیا گیا ہے۔

المنجد میں لکھا ہے: السفساف: الرّدی من کلّ شی ''سفساف یعنی ناکارہ اور ردّی چیز' یقال: فلان سفساف الکلام ای لیس لکلامه معنی' ''کہا جاتا ہے: فلاں فضول گو ہے' اسکی بات بے معنی ہے''' الامر الحقیر۔ ''حقیر باتیں کرتا ہے''۔

۲۔ امامؑ نے یہ بھی فرمایا: ''الناس عبیدالدنیا والدین لعق علی اَلسنتهم فاذا محصوّ بالبلاء قلَّ الدَّیّانونَ''۔ ''لوگ دنیا کے غلام اور بندہ ہیں اور دین ان کا زبانی جمع خرچ ہے۔ جب لوگ بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں' تب دیندار بہت کم نظر آتے ہیں''۔ (تحف العقول ص ۲۴۵)

''المنجد'' میں ہے: ''اللعقة: ماتأخذه فی الملعقة او باصبعك''۔ ''لعقہ غذا کی اس مقدار کو کہتے ہیں جو چمچہ یا انگلیوں سے اٹھائی جاتی ہے''۔ '' القلیل مما یلعق یعنی چھوٹا لقمہ۔

امامؑ کے اس جملہ میں خصوصاً کلمہ ''عبید'' سے امام کے عزت نفس اور بندگان دنیا کی حقارت کی عکاسی ہوتی ہے۔

۳۔ اس جملہ کی طرح ایک معروف جملہ وہ بھی ہے جو الانوار البہیہ ص ۴۵ پر نقل ہوا ہے: وفی وصیّة موسی بن جعفر علیهما السلام لهشام قال: وقال الحسین بن علی: ان جمیع ماطلعت علیه الشمس فی مشارق الارض ومغاربها، بحرها وبرّها، وسهلها وجبلها عند ولی من اولیاء الله واهل معرفة بحق الله کفیء الظلال، ثم قال: الا حرّ یدع هذه اللّماظة لا هلها (یعنی الدنیا) لیس لانفسکم ثمن الا الجنة فلا تبیعوها بغیرها، فانّه من رضی من الله بالدنیا فقد رضی بالخسیس"۔ "حضرت موسیٰ بن جعفرؑ نے ہشام کے لئے جو وصیت تحریر کی تھی اس میں آیا ہے کہ امام حسینؑ بن علیؑ نے فرمایا: "وہ تمام اشیاء جن پر مشارق اور مغارب میں سورج چمکتا ہے، تمام دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے سمندر، خشکی، پہاڑ، میدان، غرض سب کچھ اس شخص کے نزدیک کہ جس نے اللہ کی عظمت کو سمجھ لیا اور خدا کی درگاہ میں خود کو سپرد کر دیا، ایک سائے کی طرح سے ہے۔ پھر فرمایا: کیا کوئی ایسا آزاد مرد پیدا نہیں ہوا جو دنیا ومافیھا سے بے نیاز ہو؟ (لماظہ یعنی وہ ریشہ جو کھانا کھانے کے بعد دانتوں میں پھنس جاتا ہے)۔ اے لوگو! جنت کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اتنی قیمت ہو کہ تم اس کے لئے اپنی جان اور ذات بھی بیچ دو۔ پس جو لوگ خدا سے فقط اس دنیا کے ملنے پر راضی ہوئے وہ پست چیز پر راضی ہو گئے"۔

متذکرہ بالا تینوں جملوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حسینؑ کی روح ایک ایسی خاص روح ہے جو خود کو پست اور کمینہ تن کے حوالے نہیں کرتی بلکہ معالی الامور (اعلیٰ کام) کی طالب ہے (پہلا جملہ)۔ دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ تمام مادی اور دنیاوی اہداف کہ جن کی انتہا رضائے خدا نہ ہو

یعنی ہدف کل خلقت پر منتہی نہ ہو اور کل خلقت کے ہدف سے جو جدا ہو' وہ آپ کی نظر میں پست اور حقیر ہے۔ نپولین کی طرح سے نہیں جو کہتا ہے کہ فرانس میرے لئے چھوٹا ہے' لہٰذا روس کو بھی اس کے ساتھ ضم کرنا چاہتا ہوں' یا اسکندر کی طرح سے نہیں جو کہا کرتا تھا کہ : یونان میرے لئے چھوٹا ہے' ایران کو بھی ساتھ ضم کرنا چاہتا ہوں (تیسرا جملہ)۔ پھر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام لوگ جو دنیاوی مقام' دنیاوی مال و دولت کے ساتھ خود کو باندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس مقام اور مال و دولت کی خاطر اپنے آپ کو ذلیل کئے ہوئے ہوتے ہیں' ایسے لوگ حسینؑ کی نظر میں بہت زیادہ حقیر اور پست ہیں (دوسرا جملہ)۔ یہاں سے ہمارے لئے امام حسینؑ کی شخصیت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ہمیں حماسۂ حسینی کی عظمت کا پتا چلتا ہے (جس کی طرف ہم اس سے قبل یادداشت حماسۂ حسینی میں اشارہ کر چکے ہیں)۔

۴۔ بلاغۃ الحسینؑ :

☆ "دراسة العلم لقاح المعرفة ' وطول التجارب زيادة في العقل"۔ "علمی مذاکرے اور مباحثے معرفت میں اضافہ کرتے ہیں اور زیادہ تجربے عقل کی زیادتی کا سبب بنتے ہیں"۔

☆ "لو ترکو الجهاد لا تاهمُ العذاب"۔ "جہاد کو ترک کرنے سے عذاب نازل ہوتا ہے"۔

☆ "لا يأمن الامن خاف الله"۔ "کوئی امان میں نہیں ہے سوائے اس کے جو خدا سے ڈرے"۔

☆ "القدرة تذهب الحفيظة"۔ "قدرت انسان کی غلامی کو ختم کر دیتی اور

اسے بے باک بنا دیتی ہے"۔

☆ "من البلاء علی هذه الامة انّا اذا دعونا هم لم يجيبونا، واذا تركنا هم لم يهتدوا بغيرنا"۔ "اس امت کی بلاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ جب میں ان کو دعوت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتے اور جب چھوڑ دیتا ہوں تو میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سے ہدایت نہیں پاتے"۔

حادثۂ کربلا میں مسیحی افکار کی تاثیر

آقای صالحی "ارشاد مفید" کے صفحہ ۱۸۵ سے نقل کرتے ہیں کہ یزید نے سرجون رومی کے مشورہ سے ابن زیاد کو اباعبداللہ سے مبارزہ کرنے کیلئے انتخاب کیا تھا۔

"کامل ابن اثیر" جلد ۳ ص ۲۶۸ پر بھی آیا ہے:

" فلمّا اجتمعت الکتب (کتب اتباع یزید بالکوفة) عند یزید دعا سرجون مولی معاویة فأقرأة الکتب واستشاره فیمن یولّیه الکوفة، وکان یزید عاتباً علی عبیدالله بن زیاد، فقال له سرجون: ارأیت لونشرلك معاویه کنت تأخذ برأیه ؟قال: نعم ،فأخرج عهدعبیدالله علی الکوفه فقال: هذا رأی معاویه ومات وقدامر بهذا الکتاب۔ فأخذ برأیه وجمع الکوفة والبصرة لعبیدالله وکتب الیه وسیّره الیه مع مسلم بن عَمر والباهلی والدقتیبة فامره بطلب مسبلم بن عقیل وبقتله أو نفیه......"

"پس جب خطوط (کوفہ سے یزید کے پیروؤں کے خطوط) یزید کے پاس پہنچے، تو اس نے معاویہ کے غلام سرجون کو بلایا اور تمام خطوط اس کے سامنے پیش کئے، پھر اس سے اس بارے میں مشاورت کی کہ کس کو کوفہ کا والی بنایا جائے۔ ان دنوں یزید عبیداللہ بن زیاد سے ناراض تھا۔ سرجون نے اس سے کہا: بتاؤ اگر معاویہ نے تمہارے لئے کوئی حکم چھوڑا ہو تو کیا تم اس پر عمل کرو گے؟ اس نے کہا: ہاں! سرجون نے معاویہ کا وہ فرمان جس میں عبیداللہ کو کوفہ کا والی بنانے کا ذکر تھا، یزید کو دے دیا۔ پھر کہا: یہ معاویہ کی رائے ہے، وہ مر گیا ہے اور تمہیں اس خط پر عمل کرنے

کا حکم دے گیا ہے۔ پس یزید نے اس کی رائے پر عمل پیرا ہو کر عبید اللہ کو کوفہ اور بصرہ کا والی بنادیا ایک خط لکھا اور اس کو مسلم بن عمرو باہلی (قتیبہ کا باپ) کے توسط سے عبید اللہ کی طرف بھیجا جس میں حضرت مسلم کے بارے میں جستجو کرنے اور ان کو قتل کرنے یا شہر بدر کرنے کے کے بارے میں بھی لکھا ہوا تھا"۔

کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے مقدمہ میں آقائے غفاری لکھتے ہیں :
"یزید عموماً اپنا وقت نصاریٰ کے دیروں (راہبوں کے رہنے کی جگہ) میں گزارتا تھا جو اس زمانہ میں پانچویں ستون کا درجہ رکھتی تھیں۔ یزید لہو ولعب میں دن گزارتا تھا اور قھر اُراہبوں سے تعلیم و احکام لیتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ عبادت اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کے یہ مراکز جہان اسلام میں فحاشی اور شراب رائج کرنے کا سبب بنے کیونکہ ان کے نزدیک شراب پینا اور عورت کے ساتھ خلوت ممنوع نہیں تھا اور حجاب بھی اُن کا معمول نہیں تھا۔ یوں عبادت کے مراکز خواہ مخواہ فساد کے مراکز میں تبدیل ہوئے۔

یزید کا مسیحی افکار کے زیر اثر ہونے کا ایک قرینہ اس کے معروف اشعار ہیں جن میں وہ کہتا ہے :

شمیسة کرم برجها قعر دنّها ‏ ‏ ‏ ومشرقها الساقی ومغربها فمی
اذا نزلت من دنّها فی زجاجة ‏ ‏ ‏ حکت نقراً بین الحطیم وزمزم
فانّ حرّمت یوماً علی دین احمد ‏ ‏ ‏ فخذها علی دین المسیح بن مریم

"میرا سورج انگور ہے اور اس کا برج شراب کے نشہ کی تہ میں ہے' یہ مشرق سے ساقی کے ہاتھ سے طلوع ہوتا ہوا مغرب میں میرے منہ میں غروب ہو جاتا ہے۔ جب اسے سبو سے جام میں انڈیلا جاتا ہے' اس

وقت شراب کا غلغلہ، اسکا نیچے اوپر ہونا اور حباب بننا ان حجاج کی مثل ہے کہ جو کعبہ کی دیوار اور چاہ زمزم کے درمیان ہروله کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ پس اگر دین احمد میں یہ شراب حرام ہے تو تم اس کو دین عیسیٰ کے مطابق ہاتھ میں لو اور چڑھا جاؤ"۔

کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" کے مقدمہ میں یعقوبی اور دوسروں سے یہ قصہ نقل ہے کہ جس سال معاویہ نے ایک فوجی لشکر کے ساتھ یزید کو بلاد روم فتح کرنے کیلئے بھیجا تھا "غذقذونہ" (ابو الشہداء نے فرقدونہ لکھا ہے) نامی مقام پر 'دیر مران' کے نام سے ایک دیر تھا جہاں پر سب رات کو رُکے تھے۔ اس دیر میں اُم کلثوم نامی عورت کے ساتھ یزید عیاشی اور شرابخواری میں مشغول ہو گیا۔ اس مقام پر وبائی ہوا کی وجہ سے لشکر چیچک اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔ یہ مرض مسلمانوں کی فوج میں اس طرح پھیلا کہ لوگ خزاں کے پتوں کی طرح زمین پر گر پڑتے اور مر جاتے تھے۔ لوگوں نے یزید سے ہر چند اصرار کیا کہ اس سرزمین سے جتنی جلد ہو سکے کوچ کرنا چاہئے لیکن اس نے بے اعتنائی کی (ابو الشہداء نے لکھا ہے کہ فوج کسی اور مقام پر اس بیماری میں مبتلا ہوئی تھی جبکہ یزید دیر میں ٹھہرا ہوا تھا اور لشکر سے ملحق نہیں ہو رہا تھا)۔ جب لشکر کے بیمار ہونے کی خبر اس تک پہنچی تو اس نے یہ اشعار پڑھے۔:

ما ان ابالی بما لاقت جموعهم بالغذقذونة من حمّى و من موم
اذا اتكأت على الانماط فی غرف بدیر مُرّان عندی ام کلثوم

"اگر تمام لشکر غذقذونہ میں چیچک اور بخار سے مر گیا تو مجھے کیا غم میں تو راہبوں کے دیر مران میں گاؤ تکیہ لگائے راحت سے ہوں اور ام کلثوم میری آغوش میں ہے"

حسینیؑ مراثی۔۔۔جنّات کے مرثیے

کتاب ''قمام'' میں ص ۵۰۹ سے ۵۱۴ تک جنیّوں کے بہت سے مراثی نقل ہیں۔ یہ اشعار انتقاد' گریہ وزاری اور تحریک احساسات پر مشتمل ہیں۔ عین ممکن ہے یہ شعر آپؑ کے محبوں اور شیعوں نے کہے ہوں لیکن چونکہ حکومت وقت کے زیر عقاب ہوتے تھے لہٰذا جو اشعار کہتے تھے وہ جنات کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ اس کی دو علتیں تھیں' ایک تو یہ کہ شعر کہنے والے کا پتہ نہ چل سکے اور دوسرے اس نام سے لوگ بھی بہتر طریقہ سے اشعار حفظ کر لیتے تھے۔

دِعبل خُزاعی

زُرخیر قبرفی العراق یُزار — واعص الحمار فمن نهاك حمار

لم لاازورك ياحُسين لك الفداء — قومی و من عطفت عليه نزار

ولك المودة فی قلوب ذوی النّهی — وعلی عدوّك مقتة و دمار

یاابن الشهید و یاشهیداً عمُّه — خیر العمومة جعفر الطیّار

''سرزمین عراق میں جس بہترین قبر کی زیارت ہو سکتی ہے' زیارت کر لو۔ اپنی سواری کو وہاں لے چلو۔ جو کوئی تمہیں وہاں جانے سے روکے' وہ ایک حیوان سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اے حسینؑ میں کیوں آپؑ کی زیارت نہ کروں۔ میرے اپنے دور کے اور بعد کے تمام لوگ آپؑ پر فدا ہوں' عاقلوں کے دلوں میں آپؑ کے لئے ایک محبت ہے۔ آپؑ کے دشمنوں کیلئے تباہی و بربادی ہو۔ اے شہید کے فرزند! آپ کے چچا اور بہترین چچا' جعفر طیار بھی شہید ہیں''۔

یہ آخری شعر ان اشعار میں سے ایک ہے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جنات نے کہے ہیں۔ (قمام ص ۵۱۲)

امام حسینؑ، اصحابِ امامؑ اور افضل الشہداء۔۔۔ابو الفضل علیہ السلام

حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنینؑ جب جنگ صفین کے موقع پر سرزمین کربلا سے گزرے تو آپؑ نے وہاں کی مٹی کو سونگھا اور فرمایا: "واھاً لك ایتھا التربة لیحشرن منك اقوام یدخلون الجنّة بغیر حساب"۔ "کتنی خوش قسمت ہے اے خاک کہ تیرے اندر سے قیامت کے دن ایک قوم محشور ہوگی جو بغیر حساب کے جنت میں داخل کی جائے گی"۔ (بحار الانوار ج ۴۴، ص ۲۵۵)

ایک حدیث یہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ نے امام حسینؑ کے بارے میں فرمایا:

"کأنی به وقد استجار بحرمی وقبری فلا یجار، ویرتحل الی ارض مقتله ومصرعه، ارض کرب وبلاء، وتنصرُہ عصابةٌ من المسلمین، اولئك سادة شھداءِ امتّی یوم القیامة"۔ "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے حرم اور قبر میں پناہ لئے ہوئے ہے لیکن لوگ اس کو پناہ نہیں لینے دیتے اور وہ اپنی قتلگاہ اور شہادت کی سرزمین کی طرف کوچ کرتا ہے، کرب اور بلا کی سرزمین کی طرف۔ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کی یاری کریگا۔ قیامت کے دن یہ لوگ میری امت کے شہیدوں کے سردار ہونگے"۔

(بحار الانوار ج ۴۴ ص ۲۹۸، نفس المہموم ص ۳۰)

ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے:

"خرج علیّ علیه السلام یسیر بالنّاس حتی اذا کان بکربلا علی میلین او میل تقدم بین ایدیھم حتی طاف بمکان یقال له المقذفان، فقال: قتل فیھا مائتا نبی ومائتا سبط نبی کلّھم شھداء۔ ھٰھنا مناخ رکّاب ومصارع عشّاق، شھداء لا یسبقُھم من قبلھم ولا یلحقھم من بعد ھم"۔

"حضرت علیؑ شہر سے باہر نکلے اور لوگوں کے ساتھ چلے۔ جب کربلا سے ایک دو میل کے فاصلے پر پہنچے اور اس سے تھوڑا آگے گئے، یہاں تک کہ مقذفان نامی مقام پر پہنچے تو وہاں پر ایک چکر لگایا، پھر فرمایا: یہاں پر دو سو (۲۰۰) پیغمبر اور دو سو (۲۰۰) پیغمبر زادے قتل کئے گئے ہیں کہ وہ سب شہداء ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سوار اتریں گے، یہ عاشقوں کی قتلگاہ ہے، ایسے شہداء (کی شہادت گاہ ہے) کہ نہ ان سے پہلے کوئی ان پر سبقت حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی ان کے مقام تک پہنچ سکے گا"۔

شہید کا جو مقام ہے وہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

آخری بات حضرت ابو الفضل علیہ السلام سے متعلق۔ یہ وہ ہستی ہیں کہ ان لہ عندالله درجة یغبطه بها جمیع الشهداء۔ "ان کے لئے خدا کے نزدیک ایک ایسا درجہ ہے کہ شہداء اس پر رشک کرتے ہیں"۔

پس یہاں پر تین مطالب ہیں:

الف۔ تمام خدمتگزاران بشر اور برجستہ لوگوں کے درمیان شہید کا مقام کہ جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

ب۔ تمام شہیدوں کے درمیان شہدائے کربلا کا مقام۔

ج۔ شہدائے کربلا کے درمیان ابو الفضل العباسؑ کا مقام۔

کربلا کے تاریخ ساز شعائر

کربلا میں بہت سے تاریخی جملے کہے گئے ہیں۔ یہ جملے ایک طرف انسانیتِ کامل، خارق العادۃ ایمان اور پر شور حماسہ کی حکایت کرتے ہیں اور دوسری طرف چونکہ یہ خون سے لکھے گئے اور خون سے ثبت ہوئے ہیں، اسلئے الگ قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان شعائر کے ذریعے ہم روح حسینی اور نہضت و قیام حسینی کی ماہیت کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں :

۱۔ خود ابا عبداللہؑ کے جملے :

☆ "الا و انّ الدّعی ابن الدّعی......"

☆ "هیهات منّاالذّلّة"

☆ "الموت اولی من رکوب العار"

☆ "الا ترون ان الحق لایعمل به ...... لیرغب المومن فی لقاء الله محقاً"

☆ "الناس عبیدالدنیا و الدّین لعق علی السنتهم......"

☆ "لاعطیکم بیدی اعطاء الذلیل و لا اقرّ اقرار (افرّفرار) العبید......"

۲۔ حضرت علی اکبرؑ کا جملہ :

"اذاً و الله لانبالی الحرب قد بانت لها الحقائق...... یا ابتاه هذا جدّی رسول الله ......"

۳۔ حضرت قاسم بن الحسنؑ کا جملہ :

"الموت احلیٰ عندی من العسل"

۴۔ ابوالفضل العباسؑ کا جملہ :

"یانفسُ مِن بعدالحسینؑ هونی هذاحسینؑ شارب المنون"

۵۔ مسلم بن عوسجہؓ کا جملہ ،سعید بن عبداللہ حنفیؓ کا جملہ ،بشر بن عمرو حضرمیؓ کا جملہ۔[۱]

حسینی پیام

ایسے اشخاص جو ایک سلسلہ اصول و مبادی کے لئے قیام کرتے اور نہضت برپا کرتے ہیں، در حقیقت اپنے بعد کے کل عالم کے لئے کچھ پیغام چھوڑ جاتے ہیں یا معروف اصطلاح کے مطابق ایک وصیت کر جاتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کو چاہئے کہ ان کے پیام سے آشنائی حاصل کریں اور ان کی آواز کو پہچانیں۔

حسینؑ بن علیؑ نے فرمایا: "انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً ، انّما خرجت لطلب الاصلاح فی امّة جدّی صلی الله علیه وآله ، ارید ان آمربالمعروف وانهیٰ عن المنکر، واسیر بسیرة جدّی وابی"۔(اس کا ترجمہ پہلے ذکر ہو چکا ہے)۔

☆☆☆☆☆☆

واقعہ کربلا میں عورت کا کردار

یہ ایک مفید موضوع ہے۔ ظاہراً وہ تمام خواتین جن کا اس واقعہ میں کردار تھا مثبت اور اچھا کردار تھا، جیسے ،زہیر بن القینؓ کی بیوی، عبداللہ بن عمیر کلبیؓ کی بیوی (اُم وَہَب) ،رباب بنت امرء القیس (امامؑ کی ہمسر) اور قبیلۂ بکر بن وائل سے ایک خاتون۔ ان خواتین کے بارے میں تفصیل کیلئے کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" آٹھویں تقریر ص ۱۶۴ پر رجوع کیجئے۔ کتاب "انصار الحسینؑ" کے آخر میں بھی اس عنوان پر جالب گفتگو کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

---

[۱] (ان سب کیلئے کتاب "بررسی تاریخ عاشوار" ص ۱۳۳ پر رجوع کریں کہ بحث نسبتاً بہت جالب ہے۔

مرحوم آیتی کی کتاب "بررسی تاریخ عاشوار" کی چھٹی تقریر "ابصار العینؑ" کا ص ۱۵۵ اور ص ۱۵۳ اور "نہضت حسینی میں عنصر تبلیغ" کے اوراق کا بھی مطالعہ فرمایئے۔

☆☆☆☆☆☆

امام حسینؑ اور ناز پروردگی

"خطابہ و منبر" کے اوراق میں ہم اس موضوع پر بہت اچھی گفتگو کر چکے ہیں۔ناز پروردگی کو اس کے تمام لوازمات ...... کم طاقتی و بے تحملی، غرور، بد دماغی...... کے ساتھ یزید سے نسبت دینا چاہئے، نہ کہ امام حسینؑ سے۔انتہائے اہانت یہ ہے کہ ہم امامؑ کو ناز پروردہ کہیں۔

☆☆☆☆☆☆

سید الشہداءؑ اور کرامت نفس

اسلام کا یہ بڑا اصول ابا عبداللہؑ کے وجود میں تجسم پیدا کر چکا تھا۔ آپؑ کی تمام حیات کرامت نفس کے شعائر سے پُر ہے۔

☆☆☆☆☆☆

امام حسینؑ۔۔ خونین انقلاب

کتاب "سرمایہ سخن" جلد ۳ ص ۳۶۷ پر لکھا ہے :"امام حسینؑ وہ ہستی ہیں جنہوں نے اپنے زندگانی کی تاریخ کو اپنے مقدس خون سے مزین فرمایا......اور تمام دنیا کو یہ بتا دیا کہ سرخ رنگ (اجتماع کے صفحہ پر) تمام رنگوں میں سب سے زیادہ پختہ

اور قائم رہنے والا رنگ ہے۔ آپؑ کا خونی پروگرام آپؑ کے مقدس ترین پروگراموں میں سے ہے اور آپ کا خونین انقلاب موثر ترین انقلابوں میں سے ہیں......"۔

☆☆☆☆☆☆

امام حسینؑ...۔ سخن مشترقین

اس بارے میں کتاب "تاریخ ایڈورڈ براؤن" ج اول ص ۳۳۳ پر خود ایڈورڈ براؤن کے کلمات اور ص ۴۳۳ پر "مروبلیم مویر" کی پر مغز باتوں کی طرف رجوع کریں تاکہ اندازہ کر سکیں کہ اسلامی ممالک کے مقدرات میں یہ حادثہ کتنا اثرانداز ہے۔

☆☆☆☆☆☆

یادداشت

۱۔ امام حسینؑ ایک کامل نمونہ اور بے نظیر سرمایہ ہیں۔

۲۔ شعائر کی تعظیم۔ جس طرح سے نظمیں، واقعات، تاریخی حوادث اور شخصیتیں حماسی اور غیر حماسی ہوتی ہیں، اسی طرح سے شعار بھی حماسی اور غیر حماسی ہیں۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

قارئین کرام!

آپ نے کتاب کا مطالعہ فرمایا۔ استاد و محقق شہید مرتضٰی مطہری رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے جس خوبصورتی کے ساتھ عزاداریٔ امام حسینؑ میں شامل خرافات سے متعلق اپنا دردِ دل بیان کیا ہے اور عزاداری کو امامؑ کے قیام کے ہدف کی پٹڑی پر ڈالنے کی اہمیت و ضرورت کو جس عرق ریزی کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اسکے بعد یقیناً قارئین یہ محسوس کرتے ہونگے کہ اب اس مسئلہ میں ہمارے اپنے ملک، معاشرہ اور ماحول کے لحاظ سے ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ آخر کیا کرنا چاہیئے کہ جس سے ہم عزاداری میں اہداف حضرت ابی عبداللہؑ کو بازیاب کرا سکیں؟

اس سلسلے میں ملک میں ایک ادارہ بنام "مجلس تحقیق و ترویجِ حیاتِ قیام و عزائے امام حسینؑ" وجود میں آیا ہے جسکی طرف ہم نے کتاب کے مقدمہ میں بھی مختصراً اشارہ کیا ہے۔ اس ادارے کے اہداف و مقاصد خود اسکے نام سے عیاں ہیں۔ اس قسم کے اداروں کو ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ قائم ہونا چاہیئے۔ درج ذیل سطور میں ہم ایسے اداروں کے قیام کی از حد ضرورت پر مزید روشنی ڈالیں گے اور اس میدان میں عزم ہمت کرنے والوں کیلئے کام کرنے کا مختصر لائحہ عمل تجویز کرینگے تاکہ ذہنوں میں ابھرنے والے سوال "اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" کا ایک قابلِ عمل جواب اور کام کی ابتداء کیلئے ایک خاکہ فراہم ہو سکے۔

ترتیب و تنظیم : سید علی شرف الدین موسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیات و قیامِ امام حسینؑ پر تحقیق کیوں ؟

واقعۂ قیام و شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام پر آج چودہ سو سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے ۔ آج یہ واقعہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں انسانوں کے توسط سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ ان انسانوں میں سے بعض تو معلوم الحال ہیں اور بعض مجہول الحال یعنی بعض پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور بعض پر نہیں۔

زمانۂ سابق میں کسی واقعہ کو نقل کرتے وقت منقول منہ کا تصدیق نامہ دکھانا ضروری ہوتا تھا' جبکہ آزادیٔ پریس کے موجودہ زمانے میں تو گویا ہر شخص کمی و بیشی کرنے میں آزاد ہو گیا ہے۔ واقعات میں کمی بیشی اور تحریف و تضعیف کرنے کے مختلف اور متعدد اسباب و عوامل ہوتے ہیں۔ بعض افراد عناد و دشمنی کی وجہ سے یا وابستہ مفادات کے تحت ایسا کرتے ہیں' جبکہ بعض نادانستہ طور پر' عقیدتمندی میں اور اپنے خیالِ خام میں احتراماً ایسا کرتے ہیں۔

ان اسباب و عوامل نے واقعۂ کربلا کو مشکوک بنانے' اس پر خطِ بطلان کھینچنے اور اسے اپنی مذموم مہم کے سیلاب میں بہا کر ساحلِ پستی بلکہ عدم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن امام حسینؑ کی دوربین نگاہیں شاید یہ دیکھ رہی تھیں کہ کیا

ہونے والا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے روزِ اول سے ہی اپنے قیام کو ان مذموم عزائم سے محفوظ رکھنے اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت بنانے کا اہتمام کیا تھا۔ آپ نے اس واقعہ کو رات کی تاریکیوں سے نکال کر، گلی کوچوں سے ہٹا کر، دن کی روشنی میں کھلے میدان میں اور ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں وقوع پذیر ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس پیش بینی کی بنا پر اس واقعہ پر خطِ بطلان کھینچنے اور اسے مشکوک بنانے میں تو دشمن کو کامیابی نہ ہو سکی، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کو غیر مؤثر بنانے کی مذموم کوششیں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں، کیونکہ جو نتائج مجالسِ امام حسینؑ سے برآمد ہونے چاہئے تھے، وہ حاصل نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ خود یہ مجالس انکے بانیان کیلئے ہر روز نئی مشکلات اور چیلنج پیدا کر رہی ہیں۔

یہاں یہ نکتہ انتہائی مہم ہے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو اس واقعہ کو مشکوک بنانے اور ساحلِ عدم و نیستی تک پہنچانے کی مہم چلا رہے ہیں۔ ہم یہاں ان افراد کے نام لینا نہیں چاہتے اور لے بھی نہیں سکتے، کیونکہ یہ کوئی چند گنے چنے افراد تو ہیں نہیں بلکہ ایک پوری مشنری ہے، جس میں ہزاروں افراد ملوث ہیں۔ انکا سرا کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچتا ہے، نہیں معلوم۔ لہٰذا ہم یہاں اِن عناصر کی علامات واضح کرنے اور نشانیاں بتانے پر اکتفا کرینگے، انہیں تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔

دورِ حاضر تحقیق و ریسرچ کا دور ہے۔ آج ہر چیز پر تحقیق و ریسرچ کی مہم نے ایک جنونی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ جن کو تحقیق کرنا چاہئے وہ تو مصروف تحقیق ہیں ہی، جنکا یہ کام نہیں ہے وہ بھی اسمیں مشغول نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں تحقیق و ریسرچ کے منکر کو فرسودہ اور رجعت پسند تصور کیا جاتا ہے۔ اسکی واضح مثال بعض دینی مدارس اور دینی شخصیات ہیں جو اب مدارس میں بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ داخل کر چکے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ تأثر دے سکیں کہ انکے یہاں ہر

معاملہ پر جدید سائنسی انداز میں تحقیق وریسرچ کی جاتی ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دینی مدارس اپنے بنیادی اہداف بھی حاصل نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی آئندہ انکے حصول کی کوئی امید نظر آتی ہے۔

غرض، تحقیق وریسرچ کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اب تو چشم نادیدہ جرثومے حشرات الارض بھی اس سے باہر نہیں رہے۔ ایسے ماحول میں کسی گروہ کا یہ اصرار کرنا کتنا تعجب خیز ہے کہ امام حسینؑ سے متعلق مسائل کو جوں کا توں رکھا جائے۔ انکے خیال خام میں اسی روش میں عزاداری اور اسکے لئے چیلنج وخطرہ ہے اور یہ اسکے خاتمہ کا سبب بن سکتا ہے۔ گویا یہ واقعہ معاذ اللہ ایک من گھڑت اور جھوٹا واقعہ ہو یا پھر تاریکئ شب میں یا زیر زمین گھڑا گیا کوئی قصہ ہو کہ اس پر تحقیق کرنے سے اس کی قلعی کھل جائیگی اور یہ ایک ایسا خود ساختہ اور بناوٹی افسانہ ثابت ہو جائیگا جسکا کوئی سِرا ہی نہ ملے گا۔ (العیاذ باللہ)

امام حسینؑ کا ایک مشہور و معروف لقب "امام مظلومؑ" بھی ہے۔ جب بھی امامِ مظلوم کہا جاتا ہے ذہنوں میں امام حسینؑ ہی آتے ہیں۔ جو کچھ ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا ہے اگر مسئلہ کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات باآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ آپ کے اس لقب کا مطلب کیا ہے؟ مظلوم اسے کہا جاتا ہے جسکا کوئی حق، خواہ خاص اسی کا ہو یا عمومی ہو (جس میں دوسرے لوگ بھی شریک ہوں) مارا جائے اور اسے اس سے محروم رکھا جائے۔ امام حسینؑ دونوں زاویوں سے مظلوم ہیں۔ خلافت ورہبری جو آپکا خصوصی حق تھا' اس سے بھی آپ کو محروم رکھا گیا اور پانی جو ہر ذی روح کا حق ہے' وہ بھی نہ ملا' آخر تشنہ لب شہید کر دئے گئے۔ اسی وجہ سے آپؑ کا نام امامِ مظلومؑ پڑ گیا۔

ہمیں کہنے دیجئے کہ اگر اُس وقت کے لوگوں نے آپؑ کو خلافت سے جو آپکا

خصوصی حق تھا اور پانی، جو حقِ عمومی تھا دونوں سے محروم رکھا تھا، تو آج کے لوگ بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھا رہے ہیں۔ تحقیق و ریسرچ جسے آجکل سب کا حق مانا جاتا ہے، آپ کے قیام مقدس کو اس سے بھی محروم رکھنے کی مہم چلائی جا رہی ہے، بلکہ پہرہ دیا جا رہا ہے کہ کہیں کوئی آپ کے حیات و قیام کا بابِ ریسرچ نہ کھولے۔ گویا یہ لوگ خود کو امامؑ کا دوست ظاہر کر کے، اسی دوستی کے دروازے سے قیامِ امامؑ کو مشکوک بنا کر آپؑ کو پستی کی طرف دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ لیکن امام حسینؑ کا قیام و نہضت تو سب کیلئے مشعل راہ ہے جیسا کہ بہت سی اسلامی و غیر اسلامی شخصیات نے کہا ہے: ''حسینؑ سب کے ہیں'' یعنی صرف انکے نہیں ہیں جو تحقیق کے دروازے پر بندوق تانے بیٹھے ہیں حالانکہ انکو یہ حق نہ خدا نے دیا ہے، نہ رسولؐ نے، نہ آئمہؑ نے اور نہ ہی کسی منصف مزاج انسان نے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر خود یزیدیت یہ کام کر رہی ہو؟

ہم ایسے لوگوں کی اتہام بازی سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ خبردار کوئی بھی قیامِ امامؑ کے بارے میں تحقیق نہ کرنے پائے۔ چنانچہ خدا و رسولؐ پر اعتماد کے بل بوتے پر ہم یہ عزم کر چکے ہیں کہ کتب اسلامی و غیر اسلامی سے استفادہ کرتے ہوئے، حسبِ توفیقِ الٰہی اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیق و ریسرچ کا اہتمام کرینگے۔ شاید اس طرح بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ ہدایت تک پہنچنے میں آسانی ہو سکے۔ دیگر حق شناس افراد سے بھی ہماری درخواست ہے کہ اس معاملہ میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، ان سے ہمارا سوال ہے کہ آخر اسکی کیا منطق و دلیل ہے؟ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کے مذموم عزائم ہیں تو ان سے ہمارا دوسرا سوال یہ ہے: کیا ان کے پاس اس الزام کا کوئی

ثبوت ہے ؟ ہم پوچھتے ہیں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تحقیق سے روکنے والوں کے عزائم مذموم ہوں ؟

موضوعاتِ تحقیق

(الف) اسنادِ تاریخ

حیات و قیامِ امام حسینؑ سے متعلق منقول کلمات، کتب اور روایات کو قبول یا رد کرنے کے بارے میں کچھ اصول و ضوابط طے کرنا پڑینگے کیونکہ ہمارے اور اس واقعہ کے درمیان تقریباً چودہ سو سال کا طویل فاصلہ حائل ہے۔ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں امامؑ سے منسوب جو کلمات و کتب اور حوادث و واقعات موجود ہیں، وہ مندرجہ ذیل ذرائع اور وسائل سے ہم تک پہنچے ہیں :

(۱) فریقین کی معروف و مشہور کتب روایات کہ جن میں ان واقعات کا ذکر موجود ہے۔ البتہ دونوں طرف کے علماء میں اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ ان کتب میں جو کچھ لکھا ہے، سب مستند نہیں ہے، بلکہ مستند اور غیر مستند دونوں طرح کی باتیں ان میں موجود ہیں۔

(۲) قدیم ترین کتب تاریخ ہوں یا تازہ ترین، سب ہی میں بعض واقعات کے سلسلے میں مصادر بیان کئے گئے ہیں اور بعض باتوں کو مصادر ماخذ بتائے بغیر ہی نقل کر دیا گیا ہے۔

(۳) بعض کتابوں میں مجہول الاسم اور مجہول الحال کتب و شخصیات سے منسوب نقول اور واقعات بیان کئے گئے ہیں جن پر ایک خاص حد تک ہی بھروسہ و اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(۴) بعض کتب تاریخ و مقاتل اہل سنت کی تالیف کردہ ہیں۔ چونکہ دور حاضر میں بعض حلقوں کی جانب سے واقعۂ کربلا کو ایک من گھڑت قصہ قرار دینے کی

مہم شروع کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کتابوں کے مؤلفین پر شیعہ ہونے یا کم از کم شیعیت سے متاثر ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

(۵) اسی طرح بعض کتبِ تاریخ و مقاتل ہیں تو شیعہ علماء کی تالیف و تحریر کردہ لیکن ان میں بعض اقوال اور واقعات علمائے اہل سنت کی مرتب کردہ کتب تاریخ اور مقاتل سے نقل کئے گئے ہیں۔ لہٰذا وہ شیعہ علماء جو اس فکر کے مخالف ہیں' انکا کہنا ہے کہ یہ باتیں اہل سنت کے علماء اور کتب سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔

(۶) اس صدی میں امام حسینؑ سے متعلق لکھی گئی بعض کتب میں کچھ ایسے قصے بھی بیان کئے گئے ہیں جن کی سند کسی معتبر کتاب میں نہیں ملتی۔ لیکن ان کتب کے مصنفین کا کہنا ہے کہ انہوں نے ان قصوں کو اس لئے نقل کرنا ضروری سمجھا کہ یہ گریہ آور اور حزن و ملال کے لئے مؤثر تھے۔

(۷) آجکل بیان کئے جانے والے زیادہ تر مصائب خوابوں پر مشتمل ہوتے ہیں' جنکی سند ایسے افراد کی طرف منتہی ہوتی ہے جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا نہ ان افراد سے باز پرس ہو سکتی ہے اور نہ وہ سنتے ہیں۔

(۸) ان جعلی مصائب کو بیان کرنے والے اکثر ان پڑھ افراد ہیں' جنہیں خوب پذیرائی حاصل ہو رہی ہے' بالخصوص دیہاتوں اور گاؤں میں تو ان لوگوں کا بول بالا ہے۔ ان علاقوں میں بیان ہونے والے مصائب سینہ بہ سینہ' زبان بہ زبان چلے آرہے ہیں۔ یہ مصائب ایسے ہیں جن کی سند مسلّمہ تو کجا غیر مستند کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔

(۹) متذکرہ بالا تمام حقائق حیات و قیام امام حسینؑ پر ضرورت تحقیق کے بیّن دلائل ہیں لیکن اس کے باوجود واقعۂ کربلا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار

ممکن نہیں۔

(۱۰)واقعۂ کربلا کا ایک مصدر وماٰخذ تاریخ طبری ہے۔ اس کتاب میں واقعۂ کربلا کو دو راویوں سے نقل کیا گیا ہے جن میں سے ایک لوط ابن یحیٰ المعروف ابی مخنف ہیں۔ انکے بیان کردہ واقعات میں امامؑ کے مؤقف کی حمایت، امامؑ کی مظلومیت اور بنو امیہ کی جنایت کا ذکر حاوی ہے۔ دوسرے راوی عوانہ بن حکم ہیں۔ انکی بیان کردہ نقول میں قتل حسینؓ اور یزید کی پشیمانی کا ذکر ملتا ہے اور اس سلسلہ میں عبید اللہ بن زیاد کو ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش بہت نمایاں نظر آتی ہے۔

سانحۂ کربلا ایک ایسا ناقابل انکار واقعہ ہے کہ بنو امیہ کا دفاع کرنیوالے متعصب ترین مؤرخین و مصنفین نے بھی اپنی کتب میں اس واقعہ پر ایک دو صفحے تحریر گئے بغیر گزر جانا خیانت سمجھا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کی حقانیت کے ثبوت میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سے بھی زیادہ ہے۔ یہ لکھنے والے دو طرح کے ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اس عظیم واقعہ سے متعلق اگرچہ چند صفحات ہی سہی لکھ کر گزر جاتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس واقعہ میں من گھڑت کہانیاں اور فرسودہ قصوں کو شامل کر کے اصل واقعات کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو امام حسینؓ کے بارے میں لکھے گئے صفحات کو سمیٹنا چاہتا ہو، ان حالات میں بھلا کیا کرے۔ اسکا واحد حل اور ان دونوں گروہوں کی مذموم کوششوں کو خاک میں ملانے کا واحد طریقہ اور علاج یہ ہے کہ بھرپور طریقہ سے ایک تحریک چلائی جائے جس میں اس واقعہ کے بارے میں ہر طرح کی تحقیق وریسرچ ہونا چاہئے۔

(ب)تفاسیر و تاویلات

حیات و قیام امام حسینؓ سے متعلق مختلف اور متضاد تفاسیر و تاویلات میں

ترجیحات کی بنیاد کیا ہے ؟

جہاں تک اس واقعہ کے اسباب و علل اور ذمہ دار و قصوروار فریق کی تفسیر و تاویل کا تعلق ہے' اس بارے میں حسینی اور یزیدی گروہ میں پہلے دن سے ہی کشمکش اور اختلاف پایا جاتا رہا ہے۔ مخالفین نے کچھ عرصہ بعد ہی ایک عجیب چال چلی اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی تفاسیر کو حسینیوں کے زبان و قلم سے فروغ دینے کی مہم چلائی' تاکہ اگر اس عظیم واقعہ کو طاقِ نسیان میں نہ لیجا سکیں اور لوگوں کے ذہنوں سے فراموش نہ کرا سکیں تو کم از کم غیر مؤثر تو بنا ہی دیا جائے۔ مندرجہ ذیل تفاسیر اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں' جنہیں ہمارے اپنے منابر (حسینی) سے فروغ مل رہا ہے :

(۱) نظریہ فدا : یہ وہ منطق ہے جو نصاریٰ حضرت مسیحؑ کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ امت کے تمام گناہ اپنے ذمہ لیکر ان کے لئے فدا ہوئے ہیں۔ اسی نظریہ کو یہاں منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ نصاریٰ کی جگہ شیعہ' دوستدار اہل بیتؑ اور حضرت مسیحؑ کی جگہ امام حسینؑ کو رکھ کر شیعوں کو تمام قوانین شریعت سے بری اور غیر مکلف قرار دینے کی مہم چلائی گئی ہے۔

(۲) عزادارانِ امام حسینؑ کے دو بڑے گروہوں کی تفسیر : ایک گروہ کے مطابق امام حسینؑ اور آپ کے اہل بیتؑ کی ذمہ داری تھی کہ ایسے تمام وسائل اور ذرائع جن سے امامؑ کی جان بچ سکتی ہو' ان سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے شہادت سے ہمکنار ہو جائیں۔ گویا انکا مقصد صرف جان دینا تھا اور بس۔ دوسرا گروہ ان شیعوں کا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ تمام تر احکام خدا اور مذہب کی دوسری تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھ کر بس حسینؑ کے نام پر رونا اور سینہ زنی کرنا ہی ان کی ذمہ داری ہے' اسکے علاوہ کچھ نہیں۔

(۳) تمام کتب تاریخ ومقاتل، خواہ وہ امامؑ کے حامیوں کی لکھی ہوئی ہوں یا مخالفین کی، سب کے تراوش قلم سے یہی نکلا ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بنو امیہ، بالخصوص یزید کا خلافت اسلامی کی کرسی پر قابض ہو جانا صحیح نہیں سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس کے باجود بعض شیعہ علماء و مفکرین قیام حسینی کو غیر سیاسی قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکے بالمقابل دیگر فرقوں کے بعض علماء و مفکرین امامؑ کے قیام مقدس کو غیر شرعی قرار دیتے ہیں، درآنحالیکہ خود اپنے وقت کے ظالم حکمرانوں کی نہ صرف یہ کہ مذمت کرتے ہیں بلکہ انکے خلاف قیام کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

(۴) طلبِ شہادت: تاریخ بتاتی ہے کہ تمام اقوام و ملل اور تمام مذاہب وادیان کے پیروکار، مبارزہ اور جہاد ہی کے ذریعہ اپنی طاقت و قدرت کو بروئے کار لاکر کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے ہیں اور منزلِ مقصود تک پہنچے ہیں۔ اسکے برعکس ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی فرد یا گروہ خودکشی کر کے اور خود سے وابستہ تمام افراد کو مروا کر منزل مقصود سے قریب ہوا ہو یا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔

(۵) تفسیر سیاسی: امامؑ کا قیام ترتیبی، تدریجی اور مرحلہ وار تھا۔ پہلے مرحلہ میں آپ مدینہ سے نکل کر مکہ تشریف لائے، جہاں پر آپ نے اپنے مشن کا آغاز فرمایا اور قیام کی مہم چلائی۔ اہل کوفہ کی دعوت اور یقین دہانیوں پر لبیک کہتے ہوئے آپؑ مکہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کربلا میں تیس ہزار لشکر کے محاصرے میں گھر جانے کے باوجود آپ مرحلہ وار حرکت فرماتے رہے جو بالآخر آپکی اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت پر منتج ہوا۔ وہی شہادت جو ہر حق

طلب اور ہر جنگجو کا مقدر ہوتی ہے۔

ان تمام واضح اور روشن اقدامات کے باوجود آپ کے درجۂ شہادت پر فائز ہونے کو غیر سیاسی ٹھہرانا ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ان لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ آخر امامؑ نے کس مقصد کے حصول کے لئے قیام فرمایا تھا کہ جسکے نتیجہ میں آپؑ شہادت عظمیٰ کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہوئے ؟

(۶) قیام امام حسینؑ کے مقاصد کیا تھے' اسکی وضاحت خود آپ کے کلمات و بیانات میں موجود ہے۔ دنیا کی ملل واقوام نے ان کلمات اور پیغامات کو دیکھ کر ہی امامؑ کو اپنا پیشوا قرار دیا ہے۔ ان واضح کلمات وبیانات کے باوجود ،بعض مخالفین اور دوست نما دشمنوں نے 'اس قیامِ مقدس کو قبیلوں کی جنگ قرار دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

دنیا کا دستور ہے کہ جب بھی کسی عدالت میں کوئی معاملہ زیر بحث آتا ہے تو اس واقعہ کی مخالفت و موافقت اور ضد و نقیض دنوں پہلوؤں کے متعلق تفاسیر و تاویلات پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے سلسلہ میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیا بوالعجبی ہے کہ قیام امامؑ سے متعلق دشمن کی پیش کردہ تفسیر و تاویل کو خود امام حسینؑ کے منبر سے انتہائی شدومدّ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس وقت واقعۂ کربلا کی مثال کم وبیش ایسی ہے 'جیسے ایک وکیل فریق مخالف سے سازباز کرلے اور اپنے ہی موکل کی خراب پیروی کر کے اس کو ہروانے کی کوشش کرے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آیا کتاب خدا یعنی قرآن مجید میں 'روایاتِ مسلمہ اور کتب تاریخ میں یا خود ائمہ اطہارؑ کے کلمات میں کوئی معیار یا کسوٹی موجود ہے یا نہیں کہ جس پر ان متضاد ومتناقض تفاسیر کو پرکھ کر دیکھا جاسکے

کہ کونسی تفسیر صحیح ہے اور کونسی غلط، کس کو ترجیح دی جائے اور کسے نہیں۔
آیاان متضاد تفاسیر میں سے سب کو اپنایا جائے یا تحقیق و جستجو کرنے کے بعد صرف اسی کو اپنانا چاہئے جو درست ثابت ہو ؟

بنیادی طور پر یہ تفاسیر دو قسم کی ہیں :

(i) برہانی : اسکے ذیل میں وہ تفاسیر آتی ہیں جن میں حیات و قیام امام حسینؑ سے متعلق جستجو کرنے والوں نے اپنی تفسیر و تاویل کو عقل و نقل اور اسناد تاریخ سے باقاعدہ دلائل دے کر پیش کیا ہے۔

(ii) دعوائی : بعض لوگوں نے حیات و قیام امام حسینؑ کی تفسیر و تاویل کرتے وقت یا تو کسی قسم کی سند اور دلیل دینے کی زحمت نہیں کی ہے یا پھر خود ساختہ تاویلات اور اپنی خواہشات پر مبنی آراء پیش کی ہیں۔اسی لئے ایسی تفاسیر کو تفسیرِ دعوائی کہتے ہیں۔

(ج) مراثی و نوحہ جات

شعراء اور اسناد تاریخ : شعر و شاعری قدیم جاہلیتِ عرب کی پسندیدہ ثقافت تھی۔اس صنف کی حُسن و خوبی اور معیار کو خود انہوں نے یوں پیش کیا ہے :

''بہترین شعر وہ ہے جو زیادہ جھوٹ پر مبنی ہو''۔

قرآن کریم نے زیادہ تر شعراء کو گم کردہ راہ قرار دیا ہے۔ مگر چونکہ شعر و شاعری میں ایک قسم کی پسندیدگی اور اثر پذیری پائی جاتی ہے، اسلئے معاشرہ میں اسکی محبوبیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باقی ہے۔

نثر کے مقابلہ میں شعر کئی گناہ زیادہ موثر ہوتا ہے اور دلوں کو گرویدہ کرتا ہے۔ اسی لئے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے دین کی بات شعر میں کہنے والوں، بالخصوص امام حسینؑ کی مظلومیت کو بزبان شعر پیش کرنے والوں کو مادی جائزے

عطا کرنے کے علاوہ آخرت میں اجر و ثواب کا مژدہ بھی سنایا ہے۔ شاید اسی وجہ سے تاریخ بشریت میں کوئی اور حادثہ، واقعہ یا شخصیت ایسی نہ ہو گی جسکے بارے میں، تمام اصناف سخن میں اظہار خیال کیا گیا ہو اور اتنے اشعار انشاء کئے گئے ہوں جتنے امامِ مظلومؑ اور واقعۂ کربلا کے بارے میں کہے گئے ہیں۔

کبھی علمی و ادبی ماحول اور بزم شعر سے مانوسیت کی بنا پر اور کبھی ذوق طبیعی کے باعث انسان کے اندر قریحہ شعر پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض ان پڑھ لوگوں نے بھی اچھے، اچھے مرثئے اور نوحے انشاء کئے ہیں۔ اسلئے ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ امامؑ کے حیات اور قیام و مصیبت کے بارے میں اشعار انشاء کرنے والی شخصیت، آیا مقام امامت سے بھی واقف ہے یا انکے اشعار فقط ذوق شعری کا اظہار ہیں اور کچھ نہیں؟ لہٰذا وہ شعراء کہ جو واقعہ کربلا کو دقت سے مطالعہ کر کے شعر انشاء کرتے ہیں، انہیں ائمہ کے فرمان کے مطابق آخرت میں تو اجر و ثواب ملے گا ہی، دنیا میں بھی انکی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے اور ان کے لئے جائزہ رکھنا چاہئے تاکہ بہترین ادائیگی کرنے والے میدان میں رہ سکیں جبکہ فرسودہ اور جھوٹے اشعار کہنے والے اور محض اشک آور بیان انشاء کرنیوالے میدان سے ناپید ہو جائیں۔

صحیح مراثی و نوحہ جات کی حوصلہ افزائی اور تشویق کے ساتھ ساتھ متذکرہ بالا حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات کو بھی دائرہ تحقیق میں شامل کرنا چاہئے :

(۱) شعراء یا دانشمند و علماء حضرات کو چاہئے کہ واقعۂ کربلا پر انشاء کردہ دقیق اور عمیق اشعار کو چھانٹ کر فرسودہ اشعار سے الگ کر دیں۔

(۲) نوحے، مرثیے، سوز و سلام، سب کو مستند اور مسلم روایات اور تاریخی حقائق پر

مبنی ہونا چاہئے۔

(۳) کوئی بھی شعر ہو، خواہ کسی بھی شان میں کہا گیا ہو، کتنے ہی نامور شاعر نے کیوں نہ کہا ہو، شاعر ملک الشعراء کا لقب حاصل کرنیوالا ہی کیوں نہ ہو، اگر شعر حقائق اور وقائع تاریخ کے خلاف ہے تو اسے عزاداریٔ امامؑ سے حذف ہونا چاہئے۔ جھوٹ چونکہ نجس ہے لہٰذا اسے اہل بیت اطہارؑ سے مس نہیں ہونا چاہئے۔ بہت سے مروجہ مرثیوں اور نوحوں میں ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے قصے بیان کئے گئے ہیں جنکا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مثلاً جناب فاطمہ صغری کا امام حسینؑ کے نام خط، افسانۂ طفلان مسلم، بعض علاقوں میں جناب شہربانو کہ جو حقیقتاً مادرِ حضرت سجادؑ ہیں انہیں مادرِ قاسمؑ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ان جھوٹے قصوں پر مبنی نوحے، مرثیئے اور سوز وسلام پیش کئے جاتے ہیں۔ کسی بھی تاریخ میں ان قصوں کی سند نہیں ملتی۔ ان فرضی داستانوں کو بیان کرنے کا مقصد عزاداران امام حسینؑ کو رلانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

(۴) بہت سے اشعار ایسے ہیں جنکی کوئی سند نہیں، اصلاً واقعۂ کربلا سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ صرف شعراء حضرات کی ذہنی اختراع ہیں۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی فرضی داستانیں واقعۂ کربلا کا جزو نظر آنے لگی ہیں۔ اس قسم کے جتنے بھی اشعار ہیں، ان سب کو حذف ہونا چاہئے۔

(۵) سانحۂ کربلا میں بہت سے ایسے واقعات گزرے ہیں جو کم وبیش تمام کتب تاریخ میں نقل ہیں، خصوصاً امامؑ کے کلمات وخطب۔ لیکن ابھی تک کسی شاعر نے انہیں اپنے کلام کا عنوان نہیں بنایا ہے۔ اگر کسی نے عنوان بنایا بھی ہے تو انہیں فروغ نہیں ملا۔

(۶) شعری ذوق و قریحہ رکھنے والوں کو چاہئے کہ خطبات امامؑ اور خطبات جنابِ زینب(س) وامام سجادؑ کو مؤثر اشعار کے سانچے میں ڈھالکر پیش کریں۔

(۷) ایک ایسا گروہ وجود میں آنا چاہئے جو تمام مراثی' نوحہ جات' سلام وغیرہ کے اشعار پر تحقیق کرے۔ جن اشعار کی سند ہو' انہیں فروغ دیا جائے اور جن کی سند باطل یا جو نامسلم ہوں' ان کی روک تھام کی جائے۔

(۸) تاریخ بشریت پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ہر میدان کے علماء و مفکرین نے صرف ان عنوانات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے جن سے انکا تعلق تھا اور جو انکا میدان تھا۔ مثلاً اگر کوئی فلسفی ہے تو اس نے فلسفہ پر' فقیہ نے فقہ پر' مفسر نے تفسیر پر' ماہر طبیعات نے طبیعات پر اور مؤرخ نے تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن امام حسینؑ کی شخصیت اور واقعۂ کربلا ایک ایسی کائناتی حقیقت ہے جس پر سب نے قلم اٹھایا ہے' خواہ اسکا تعلق فقہ و علم دین سے ہو یا نہ ہو۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر فقیہ نے اس سلسلہ میں قلم اٹھایا ہے تو فقہی حوالے سے اس کا نظریہ مقدم ہوگا اور اگر مؤرخ نے کچھ لکھا ہے تو تاریخی اعتبار سے اس کے بیان کی اہمیت ہوگی۔

البتہ علماء و مفکرین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے امام حسینؑ پر قلم اٹھایا ہے ان میں وہ نام نہاد دانشمند شامل ہیں جو اپنے وقت کے حکمرانوں کی حاشیہ برداری میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ بعض افراد وہ ہیں جو اپنی آنکھوں پر فرقہ وارانہ تعصب کی پٹی باندھ کر لکھتے ہیں۔ کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو محض معلومات جمع کرنے اور واقعات جاننے کے شوقین ہوتے ہیں اور چونکہ انکا قلم اچھا ہوتا ہے' اسلئے لکھنے کیلئے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے تمام حضرات نے اس معاملہ میں اپنی ذاتی آراء و نظریات کو شامل کردیا ہے' لہٰذا

انہیں من و عن قبول نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہاں انکی شخصیت کو سامنے رکھکر ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔

مجالس مذاکرہ کا اہتمام

حیات و قیام امام حسینؑ پر تحقیق کا ایک راستہ ملک کے گوشہ و کنار میں اس عنوان سے مجالسِ مذاکرہ کا اہتمام ہے۔اِن مجالس مذاکرہ کے نظام کو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہونا چاہئے :۔

۱۔ مجالس مذاکرہ کا مقام اور دورانیہ :اس قسم کی مجالس مذاکرہ کا انعقاد مقامی‘ علاقائی‘صوبائی اور ملکی سطح پر وقت ‘استطاعت اور مالی گنجائش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک روزہ‘ دوروزہ یا سہ روزہ بنیادوں پر کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ شرکائے مجالسِ مذاکرہ : شرکائے مجالس مذاکرہ کا انتخاب اجتماعی‘ سماجی اور سیاسی بنیادوں سے ہٹ کر صرف دین و مذہب کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔اس میں خاص طور سے ان لوگوں کو دعوت دینا چاہئے جو عزاداریٔ امام حسینؑ کی موجودہ صورتحال سے دلسوزی کے جذبات و احساسات رکھتے ہوں اور اسمیں اصلاح عزاداری کی ضرورت پر عقیدہ رکھنے والوں کو ہی مدعو کرنا چاہئے۔

۳۔ مدرّس یا مقرّر : ان مجالسِ مذاکرہ میں گفتگو کرنے کے لئے لائق اور دانشمند علماء کو مخصوص موضوعات پر غور و خوض اور مطالعہ کے لئے دعوت دی جائے۔اس کیلئے انہیں مناسب وقت دیا جائے اور ضروری کتب کا بندوبست بھی کیا جائے۔

۴۔ **نقد و انتقاد** : شرکائے مجلسِ مذاکرہ کو یہ حق حاصل ہو کہ معتمدِ مذاکرہ کی اجازت سے وہ مدرسین‘ مقررین اور مقالہ نگاروں کے معروضات پر اپنا نقد و انتقاد یا ان کے انتقاد پر وارد اپنے اشکالات کو بیان کرسکیں اور انکی تجاویز کے

متبادل اپنی تجاویز خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کر سکیں۔

۵۔ **اجتماعی مباحثہ :** مجالسِ مذاکرہ کے شرکاء کو چند گروہوں میں تقسیم کر کے ورکنگ گروپس تشکیل دئے جائیں اور انہیں بعض موضوعات و مسائل سپرد کئے جائیں تاکہ وہ تفصیلی بحث و مباحثہ کے بعد انکا حل تلاش کریں اور اصلاح کے لئے سفارشات اور لائحہ عمل مرتب کریں۔

۶۔ **نمائش و فراہمیٔ کتب :** وہ تشنگانِ فلسفۂ قیام امام حسینؑ جو اس سلسلے میں حصولِ کتب کی خواہش اور شغف مطالعہ رکھتے ہیں لیکن انہیں موادِ مطالعہ کی کمی یا مالی مشکلات کا سامنا ہے' ان کے مسائل کی تشخیص کر کے انکے لئے بلا معاوضہ یا رعایتی قیمت پر کتب کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔ علاوہ ازیں متعلقہ کتب کی عمومی نمائش کا اہتمام بھی کیا جائے۔ پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں میں اس پروگرام پر عمل درآمد ہونا چاہئے تاکہ کسی علاقے کے لوگ اس سہولت سے محروم نہ رہیں۔

۷۔ **مالی اخراجات :** مجالس مذاکرہ کی مالی ضروریات کو' ان امور سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے عطیات' حقوقِ شرعیہ' یا کتب کے اسٹال وغیرہ لگا کر پورا کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ **تعلقات و روابط :** ان مجالسِ مذاکرہ کے انعقاد کے ذریعہ ملک کے گوشہ و کنار میں وقوع پذیر ہونے والے حالات سے آگاہی اور آپس کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی خاطر روابط قائم کئے جائیں۔

۹۔ **مجالسِ مذاکرہ کا اہتمام کرنے والوں کے لئے ضروری ہدایت :** امام حسینؑ کے بارے میں تحقیقی مجالسِ مذاکرہ کا انعقاد کرنے والے لوگوں کو خیال رکھنا چاہئے کہ ان مجالس کے امور' پیشہ ور قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں'

کیونکہ ہر علاقے میں کچھ ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو دینی‘ مذہبی اور سیاسی‘ تمام مقدّرات کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سیاست پر مذہب کو قربان کرتے ہیں۔ کچھ سارے اجتماع کو سیاست کیلئے فروخت کرتے ہیں‘ تو کبھی مذہبی امور میں دلسوزی کا مظاہرہ کرتے ہیں ایسے افرد مکتب و مذہب کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے انہیں جوں کا توں‘ حالتِ اول میں رکھنے یا انہیں مزید پسماندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان افراد کی تمام ترکوششوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہوتا ہے چنانچہ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایسے افراد کے ہاتھوں میں اختیارات نہ جانے پائیں۔

ملک میں موجود دینی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان مجالس مذاکرہ کو اسکے موضوع تک ہی محدود رکھنا چاہئے‘ کیونکہ کچھ افراد ان اجتماعات کو اپنے یا اپنے آقاؤں کے مخصوص مفادات کو حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کرینگے۔ ایسے لوگ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کیلئے حکمرانوں سے ٹکرانے‘ انکے خلاف جلوس نکالنے‘ لوگوں کو حکمرانوں سے بدگمان کرنے اور کبھی سیاسی پارٹیوں کے مقاصد کے حصول کیلئے انہیں فروخت اور استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سب سے بچ بچا کر فقط اصل مقصد یعنی مذہبی آگاہی اور بیداری کیلئے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

----☆----☆----☆----

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

☆۔ دوسرا باب۔

☆۔ تیسرا باب۔

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

انتخاب مصائب۔۔ ترجیحات وترمیمات

حضرت امام حسینؑ اور آپکے اہل بیت اطہارؑ ویاران باوفا پر میدان کربلا کے ریگ زار پر 'کوفہ وشام کے بازاروں اور درباروں میں اور اسیری کے دوران بے پناہ مصائب وآلام کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ لیکن افسوس جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں نے ان مصائب کی ترجیحات کو بدل ڈالا اور ان میں اپنی مرضی کی ترمیمات داخل کر کے اسکے روشن چہرے کو گرد آلود کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہی کوشش کی ہے کہ اس عظیم سانحہ کے چہرے سے زمانے کی گرد کو صاف کر کے 'اسکا شفاف چہرہ آپکے سامنے پیش کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ امام حسینؑ اور آپکے رفقاء پر پڑنے والے مصائب کو انکی صحیح' صحیح ترجیحات کے مطابق پیش کیا جائے۔ کتاب "انتخاب مصائب" ہماری انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس معرکۂ حق وباطل میں یوں تو امام حسینؑ اور آپ کے تمام اہل بیتؑ واصحابؓ پر طرح' طرح کی مصیبتیں گزری ہیں' لیکن یہ مصائب اپنی نوعیت' کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں۔ بعض ذوات ایسی ہیں جنپر نسبتاً کم مصیبتیں پڑی ہیں 'بعض نے ان سے کچھ زیادہ مصیبتیں دیکھی ہیں جبکہ کچھ شخصیات وہ ہیں جو کہ تمام مصائب میں شریک نظر آتی ہیں۔

جس طرح مصیبت کی کمیت وکیفیت میں فرق ہے 'اسی طرح اس کی عظمت واہمیت کو جانچنے کی کسوٹی اور معیار میں بھی فرق ہے۔ بعض افراد نے حیات مادّی ودنیوی کی ضروریات ولوازم سے محرومیت کو ہی ایک بڑی مصیبت سمجھا ہے' جبکہ بعض نے اسے عالم معنویت 'انسانیت اور شریعت کے زاویئے سے پرکھا ہے۔ مثال کے طور پر بعض افراد کے نزدیک جناب زہراؑ کی اصل مصیبت' عظیم المرتبت باپ سے آپ کی جدائی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ نہیں بلکہ آپکی اصل مصیبت فدک وخمس سے محرومیت ہے۔ خود جناب زہراؑ نے خلافت سے علیؑ کی محرومیت کو اصل مصیبت قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کا موقف بھی وہی ہے جو جناب زہراؑ کا ہے۔ آپ نے بھی سب سے زیادہ مصیبت خلافت سے محرومیت کو قرار دیا ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ واقعۂ کربلا میں تمام مصیبتوں کا مرکز امام حسینؑ کی ذات والا صفات رہی ہے۔ چنانچہ خود آپنے اپنی زبان مبارک سے اپنے اوپر گزرنے والی دلسوز مصیبتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ آپکے بعد آنے والے آئمہ طاہرینؑ نے بھی آپ ہی کو تمام مصیبتوں کا مرکز قرار دیا ہے۔ لیکن وائے ہو' ان تاجران اور سوداگران مصائب امام حسینؑ پر' جنہوں نے مولا کی جگہ غلام' سیدانی کی جگہ کنیزوں 'امامؑ کی جگہ نام نہاد امام زادوں کی مصیبتوں کی داستانوں کو بنیادی اور ترجیحی مصائب میں بطور ترمیم داخل کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے! حالانکہ حدیث پیغمبرؐ بھی ہے اور دنیا کے اکثر دانشمندوں کا کہنا بھی یہی ہے کہ بقائے اسلام کے ضامن حسینؑ ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ طبقہ جو اسلام کی بقا اور تحفظ کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے' جن سے ہر طرح کی امیدیں وابستہ ہیں' خود انہوں نے اس مصیبت سے لاتعلقی کا رویہ اپنایا ہوا ہے۔ انکا یہ رویہ بجائے خود ایک مصیبت ہے۔

انہی تلخ حقائق کے پیش نظر اور تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے 'ہم نے اس بات کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہ امامؑ کی مصیبت میں اصل ترجیحات کیا ہیں اور لوگوں نے اس میں کیا 'کیا ترمیمات داخل کی ہیں۔ ہم اپنے نظریات کے صائب وخطا ہونے کے بارے میں ہمیشہ دانشور ودانشمند مومنین کی نصیحت آموز آرا کے منتظر اور توفیق خداوندی کے نیاز مند رہیں گے۔